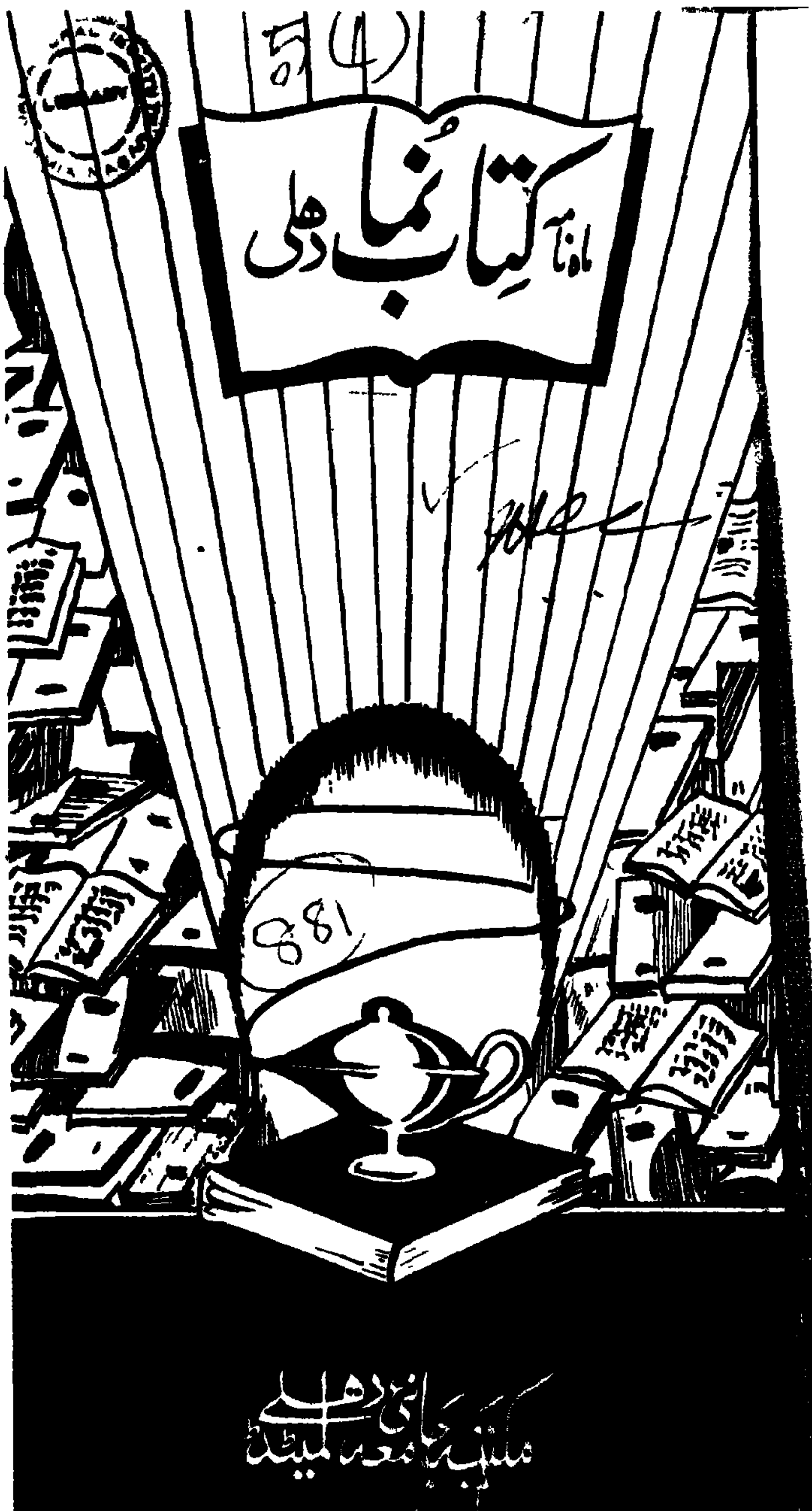

ماہنامہ کتاب نما دہلی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

## راہِ عمل ——— صالحہ عابد حسین

اصلاحات کے حامیوں اور سماجی خدمت کرنے والوں کو بھی کبھی کبھی وہ وہ سُننا اور دیکھنا پڑ جاتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ "راہِ عمل" ایک ایسے ہی سر پھرے جوڑے کی کہانی ہے جس میں کہیں تو گھریلو زندگی کی جھلکیاں آپ کو متوجہ کریں گی تو کہیں زندگی کے حسین نظارے آپ کا دامن تھام لیں گے۔ رومان کی چاشنی، اندازِ بیان کی دل کشی اور اعلیٰ کردار نگاری نے اس ناول کو اور بھی جان دار بنا دیا ہے۔

صفحات ۴۸۰ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت ۵۰/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

دہلی

ماہنامہ

# کتاب نما

نگراں: غلام ربانی تاباں

مدیر: پرکاش احمد عباسی

جلد نمبر ۵ — جنوری ۱۹۶۴ء — شمارہ نمبر ۱

ہمیں یہ افسوس ناک خبر شائع کرتے ہوئے دُکھ ہو رہا ہے کہ مکتبہ جامعہ کے سابق مینجنگ ڈائرکٹر جناب حامد علی خاں صاحب کا حرکت قلب بند ہو جانے سے ۵ دسمبر ۶۳ء کو پیرس میں انتقال ہوگیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلیہِ رَاجِعُون۔ افسوس! جامعہ اپنے ایک عالی دماغ حیاتی رکن سے محروم ہوگئی۔ مکتبہ جامعہ پر حامد صاحب کے بڑے احسانات تھے۔ آج سے ۴۱ سال پہلے ۱۹۲۲ء میں مکتبہ آپ ہی کی کوششوں سے قائم ہوا تھا۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۵۸ء تک جس محنت اور لگن سے حامد صاحب نے مکتبہ جامعہ کو سنوارا تھا اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مکتبہ کا لاکھوں روپے کا ذخیرہ خاک ہو جانے پر اُسے دوبارہ قائم کرنا بلکہ اسے لمیٹڈ کمپنی کی شکل دلا دینا آپ ہی کا کام تھا۔ یوں تو حامد صاحب نے ۵۸ء کے شروع میں مکتبہ سے سبکدوش ہوکر UNESCO کی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مکتبہ کی موجودہ شکل حامد صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے ——— حامد صاحب کے انتقال کی خبر ملنے پر مکتبہ جامعہ کا دفتر اور دکان اسی وقت بند کر دی گئی۔ بعد میں مکتبہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس اور کارکنانِ مکتبہ نے تعزیتی قراردادیں منظور کیں اور مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

جیسا کہ ہم نے کتاب نما کے پچھلے شمارے میں لکھا تھا، کتاب نما کے اس مخصوص شمارے میں ہم وہ مقالات اور تقریریں شائع کر رہے ہیں جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی میلے کے موقع پر مکتبہ جامعہ کے ادبی سمپوزیم "فن اور فن کار" میں "غزل مستقبل کی شاعری نہیں ہے" کے عنوان کے تحت پڑھی گئی تھیں۔ اس شمارے میں جناب آل احمد سرور، جناب سیّد سجاد ظہیر، جناب راجندر ناتھ شیدا، جناب ڈاکٹر محمد حسن اور جناب گوپی ناتھ امن کی تقریریں اور صدر جلسہ جناب ڈاکٹر عبدالعلیم کی تقریر کا خلاصہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سمپوزیم میں جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب نے بھی شرکت فرمائی تھی ہمیں افسوس ہے فاروقی صاحب کی تقریر ہمیں باوجود تقاضوں کے دستیاب نہ ہو سکی۔

مکتبہ جامعہ اس سال سے سستی کتابوں کی اشاعت کا ایک نیا سلسلہ شروع کر رہا ہے۔ یہ سلسلہ اردو کی ان مشہور کلاسکی ادب کی کتابوں سے شروع کیا جا رہا ہے جو آج کل نہیں مل رہی ہیں۔ مکتبہ جامعہ کی یہ سستی کتابیں بھی مکتبہ کی دوسری کتابوں کی طرح معیاری ہوں گی۔ بہترین کتابت اور طباعت کے ساتھ ساتھ کتاب کے متن کی صحت کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ ہمیں یقین ہے ہمارا یہ سلسلہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

---

## بقیہ خبریں ص ۲۲ کی

اور تحریری مقابلہ ہوا تھا جس میں ہر زبان کے ملکی اور غیر ملکی اخبار و رسائل کی نمائش کی گئی تھی اس سال کے لیے مجلس عاملہ نے کتابوں کی نمائش کی تجویز پاس کی ہے جس کی تاریخ کا اعلان عنقریب ہی کیا جائے گا۔ اس نمائش میں ہر زبان کی نادر و نایاب کتابیں رکھی جائیں گی۔ ساتھ ہی ایک تحریری مقابلہ بھی ہوگا۔

سکریٹری

آزاد ہند اردو لائبریری۔ چار شاہ آباد

# آل احمد سرور



میرا خیال یہ ہے کہ آج کے مشاعرے کے لیے مجوزہ طرح دیا گیا ہے وہ بالکل ناموزوں ہے اس لیے کہ ادب کا جو مطالعہ کرتے ہیں اور ادب کے متعلق جو لکھتے ہیں وہ نجومی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آج کے دور میں جب کہ شاعری کے لالے پڑے ہوتے ہیں اور اسی لیے سنجیدگی کے ساتھ بعض لوگوں نے اس دور کو نثر کا دور کہا ہے، اردو شاعری کے مستقبل کو تاریک سمجھا ہے۔ یہ دیکھنا کہ ہندوستان میں شاعری کا مستقبل کیا ہوگا اور ہندوستان میں شاعری کے مستقبل کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کا مستقبل کیا ہوگا، یہ ہرگز آسان کام نہیں ہے اور اس کے متعلق جو کچھ اب تک کہا گیا ہے۔ خاص طور سے اس پر زور دیا گیا ہے کہ قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی، وہ صحیح ہے۔ اب عام طور پر لوگ یہ کرتے ہیں کہ جو ان کا نقطہ نظر ہے غزل کے متعلق وہ پیش کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ طریقہ کار صحیح نہیں ہے، ہمارا فرض یہ ہے کہ اپنی پسند اور ناپسند سے بلند ہو کر ہم موجودہ حالات کا جس حد تک معروضیت کے ساتھ ممکن ہے مطالعہ کریں اور اس معروضیت کی بنا پر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ جو خطوط ابھی کھینچے جا رہے ہیں وہ خطوط کس منزل پر ختم ہوں گے۔ اس لیے اس عنوان میں پہلی بات جو ہمیں طے کرنی ہے وہ یہ ہے کہ مستقبل کی شاعری کیا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ مستقبل کی جو شاعری ہوگی اُسی میں ہم کو غزل کا مقام دیکھنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں دو تین باتیں ہمیں بہ ہر حال ذہن میں رکھنی پڑیں گی۔ پہلی بات تو یہ کہ مستقبل کا جو ادبی اظہار ہوگا وہ تہذیبی اظہار کی بنیاد پر ہوگا اور تہذیبی اظہار جو ہوگا وہ اس دور کے سائنسی انقلاب کی کوئی شکل ہوگا چناں چہ اسنو اور لیوس اور دوسرے اشخاص نے جس طرح دو کلچر س کی بات چھیڑی ہے ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یعنی یہ کہ ادب کو اگر محض ایک سامانِ تفریح سمجھ لیا جائے۔ جیسا کہ بعض اوقات کاروبار کے فروغ کے لیے لوگ کرتے ہیں، تو اس سے قطع نظر کرکے جو اس کے تہذیبی اثرات ہیں جس طریقے سے کہ وہ زندگی کو قدریں دیتا ہے جس طریقے سے وہ حسن کاری کے ذریعے سے زندگی کے متعلق ایک بصیرت عطا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس بصیرت کے ذریعے سے ہمیں کچھ خواب دیتا ہے اور یہ خواب بالآخر ایک حقیقت کی توسیع کرتے ہیں اس کو ضرور ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ اس لیے بہت بڑا کام جو اب تک شاعری کرتی تھی غالباً آئندہ نثر سے لیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ شاعری جو علاج بھی

کرتی تھی۔ جادو ٹونے بھی کرتی تھی اور مختلف دل بہلانے کے کام کرتی تھی اس سے ہم بہت آگے نکل گئے ہیں اور بہت سے وہ کام جو اس زمانے میں شاعری کرتی تھی مثلاً قرآن شریف کا منظوم ترجمہ ہوگیا یا تعزیرات ہند کو منظوم کر دیا گیا اور اس کے علاوہ بہت سے اخلاقی مسائل پر منظوم کتابیں لکھی گئیں ان کی وجہ یہ تھی کہ شاعری اظہار کا سب سے زیادہ آزمودہ پیرایہ تھی۔ آج جب نثر نے یہ جگہ حاصل کرلی تو نثر کی اس خدائی کے دور میں شاعری کے مقام کو پہلے سمجھنا پڑے گا۔ اور میں یہ کہتے ہیں پس و پیش نہیں کرتا کہ اس سے شاعری کی کوئی توہین نہیں ہوتی۔ اس لیے شاعری اپنی جگہ اور اپنا راستا الگ نکال لے گی۔ بہر حال یہ مسلّم ہے کہ مستقبل کی شاعری نثر کے اسالیب سے، نثر کے انداز بیان سے اور نثر کی زبان سے زیادہ متاثر ہوگی اور شاعری کے جو روایتی رمز و ایما ہیں جو اب تک برابر کام دیتے رہے ہیں ان میں کچھ تبدیلی ہوگی وہ زیادہ عام فہم ہوجائیں گے اور وہ آج کے مشینی دور کے تمدن سے زیادہ متاثر ہوں گے۔ اگر اس چیز کو ذہن میں رکھا جائے تو آگے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالباً اس کی یعنی شاعری کی دو سطحیں ہوں گی، ایک سطح تو وہ ہوگی جو آج ہم کو یورپ اور امریکہ میں نظر آتی ہے جس میں کہ ادب کو محض کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کی سب سے دل چسپ مثال یہ ہے کہ ایک ماں سے اس کے بچے کی اس کی سہیلی نے تعریف کی تو ماں نے یہ کہا کہ ہاں بچہ تو خوب صورت ہے مگر اس کا فوٹوگراف اس سے اچھا ہے۔ یہ تصور کاروباری دنیا کے لیے عام ہو رہا ہے اور اس نے جس قسم کے آرٹ اور ادب کو فروغ دیا ہے ہم اس کو سستا ادب کہہ سکتے ہیں۔ جو حقیقت میں ہمیں زندگی کی بصیرت عطا نہیں کرتا۔ بلکہ ایک طور پر حقائق سے گریز سکھاتا ہے۔ اس گریز سے ہم شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبا کر سمجھ لیتے ہیں کہ دنیا سے محفوظ ہوگئے۔ اس قسم کے لیبل کا ادب اور اس قسم کے لیبل کی شاعری ہم چاہے پسند کریں یا ناپسند کریں خاصے بڑے پیمانے پر چلتی رہے گی اور ہمارے ہاں خاصے بڑے پیمانے پر مشاعروں میں اس قسم کے شعر کہے جائیں گے اور مقبول ہوں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس دور میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جیسے کہ آج بھی ہیں اور ان کی تعداد کم نہیں ہوگی، جو آج کے پورے انسان پر جس کی نظر میں انسانیت کا پورا ارتقا ہے اور تہذیب کی مختلف منزلیں ہیں، ان پر ہوگی، اور وہ یہ دیکھ کر کہ مشین کا استعمال کبھی کبھی انسان کے مروّت کے جذبات کو کچل سکتا ہے اور کبھی کبھی اس کو بے راہ کر سکتا ہے وہ انسانیت کی قدروں کو پیش کرے گا۔ اور اس طریقے سے انسانیت کے ضمیر کا کام دے گا۔ انسانیت کے ضمیر کی آواز شاعری میں آئے گی اور اس بنیاد پر کہ حسن ہزار شیوہ ہوتا ہے اس کے اظہار کی بھی ہزاروں شکلیں ہوں گی۔

ہم نے ہندوستان میں خاص طور پر یک طرفہ رائے زیادہ دیکھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب غزل کا ذکر آتا ہے تو ہم سخن فہمی سے زیادہ طرف داری کا ثبوت دیتے ہیں اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ غزل کے سلسلے میں اگر اس طرف داری کو چھوڑ دیا جائے اور چند حقائق پر نظر رکھی جائے تو ہم شاید زیادہ بہتر نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں غزل کو حسن کاری کا ایک نمونہ سمجھتا ہوں ساری حسن کاری نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک جس طریقے سے کہ Miniature Art ایک اچھا آرٹ ہے لیکن سارا آرٹ نہیں ہے اس طریقے سے غزل بھی ہے میں غزل کو آئندہ کے لیے خطرہ نہیں سمجھتا لیکن غزل کے مزاج کو خطرہ ضرور سمجھتا ہوں اور ہمارے قدیم شاعری کے سرمایے میں بہت سی قابل قدر باتیں تھیں۔ لیکن بڑی کمی یہ تھی کہ غزل کا مزاج نہ صرف دوسرے اصناف پر اثر انداز ہوا تھا بلکہ اس نے ان کی ترقی کو بھی روک دیا تھا اس سلسلے میں یہ صحیح ہے کہ حالی کے وقت سے یہ آواز بلند کی گئی ہے کہ "یا تو عمارت میں ترمیم ہوگی" یہ حالی کے الفاظ ہیں، "یا عمارت نہ ہوگی" اور حالی کے بعد اقبال تک اور آج کے غزل گو شعرا تک جو تصویر ہمیں ملتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارت میں ترمیم ہوئی ہے اور اس ترمیم کی وجہ سے عمارت قائم ہے اور اس نے اپنے استحکام کا ثبوت دیا ہے لیکن اصل بات جس کو ہمیں نہیں بھولنا چاہیے یہ ہے کہ آج بھی اردو شاعری میں اچھے اشعار کی تعداد کا حساب لگایا جائے تو غزل کے اشعار زیادہ ہیں غزل کے اشعار زیادہ لکھے جاتے ہیں اور نظم کے اشعار نسبتاً کم ہوتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں یہ صورت حال خطرے سے خالی نہیں یعنی غزل لکھی جائے۔ لیکن اردو شاعری کی ترقی غزل کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ یہ ترقی نظم کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ہم غزل کے فارم FORM پر ہزاروں اعتراضات کے باوجود اس کے جمالیاتی معنی کو اور اس کے جمالیاتی جواز کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ذہنِ انسانی منتشر جذبات میں، پریشان جلووں میں کوئی نہ کوئی ربط دیکھنا چاہتا ہے۔ اور غزل کا فارم FORM جو ایک بہت ڈھیلا ڈھالا فارم ہے اور جو اپنی روایت کی وجہ سے اب ختم نہیں کیا جا سکتا اس کی خامیوں کو بھی اگر ہم ذہن میں رکھیں تو ہمارے لیے زیادہ مفید ہوگا۔

میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ اگر آج سے لے کر دس پندرہ برس تک مسلسل تمام شعرا غزل لکھنے کا عہد ترک کر دیں تب بھی وہ غزل کو ختم نہیں کر سکتے اور میرا خیال ہے انھیں ختم بھی نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ تمام اصناف میں شاعری سب سے زیادہ روایتی ہوتی ہے۔ شاعری اپنی روایات سے کبھی یکسر منحرف نہیں ہو سکتی اور شاعری میں تجربے بھی کبھی روایت سے بے نیاز ہو کر

نہیں کیے جاسکتے۔ ہر تجربہ روایت ہی کی کوئی ترمیم یا توسیع ہوتا ہے اس لیے آپ اگر چاہیں کہ غزل کو چھوڑ کر نظم لکھنے لگیں تو یہ بات ناممکن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ادبی طور پر فوراً اس میں کمال نہیں حاصل کر سکتے۔ لیکن حالی سے لے کر اب تک کی غزل کی تاریخ اس بات کا ثبوت ہے کہ غزل اپنے دور کے میلانات کو قبول کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ لیکن غزل سے ناآسودگی بڑھتی رہی ہے اور بڑھتی رہے گی۔ اور اس میں صرف غزل کی خامی کا سوال نہیں ہے، بلکہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ آج کا شعور زیادہ بیدار ہے اس سلسلے میں ایک اور حقیقت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب ہم اقبال کے اس قسم کے اشعار پڑھتے ہیں۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

تو جس طرح سے کہ غزل کی زبان اور غزل کے رمز و ایما میں آج کی روشن حقیقت کو بیان کیا گیا ہے اور ہمیں جس طرح اس سے نہ صرف مسرت حاصل ہوتی ہے بلکہ ایک بصیرت بھی ملتی ہے اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ لیکن آج بڑا حلقہ ہے آج کا جو سماج ہے وہ اس رمز و ایما کے علاوہ کچھ ایسے رمز و ایما بھی چاہے گا جو زیادہ عام فہم ہوں اور اس لیے غزل کی زبان میں خاصی بڑی تبدیلی کی ضرورت ہوگی اور اس کو نئے رمز و ایما ایجاد کرنے پڑیں گے اور اس کی وہ شکل جو اس کی نفاست اور لطافت اور صناعی بلکہ کمال فن کی دلیل ہے وہ بدل جائے گی۔ لیکن اس میں نئے دور کی تازگی، نئی فضا کا احساس، دھرتی کی طاقت کا کچھ احساس ضرور آئے گا۔ یہ بات اس طرح واضح ہوسکتی ہے کہ جدید ہندی شاعری اگرچہ اردو شاعری کے مقابلے میں اور خاص طور پر غزل کے مقابلے میں بڑی اکھڑی اکھڑی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس میں فارسی اور اردو الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال شروع ہوگیا ہے۔ اب اگر آپ غزل کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی ہندی کا لفظ کسی فارسی لفظ کے ساتھ نہ لایا جائے تو آئندہ اب جو آپ کا حلقہ ہے جو پڑھنے والے لوگ ہیں، سمجھنے والے لوگ ہیں وہ غالباً ان سارے رمز و ایما سے غزل کی تہوں اور ماورائے سخن بات کے لطف کو اتنا نہ پاسکیں گے۔ اور ان کے لیے آپ کو اس معاملے میں زبان میں خاصی آزادی برتنی پڑے گی۔ یہاں تک آزادی برتنی پڑے گی کہ جھٹ کا لفظ آپ کو لانا پڑے گا۔ ایٹم کا لفظ لانا پڑے گا جو نظم میں تو استعمال ہوتا ہے مگر غزل میں نہیں آیا یا ہندی کی شاعری۔ ہمیں آج کچھ اکھڑی اکھڑی معلوم ہوتی ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس معاملے میں ہندی شعرا کا طریقۂ کار ہمارے طریقۂ کار سے بہتر ہے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ غزل اسی وقت زندہ رہ سکتی ہے جب حالی کے ہی اشارے کے مطابق اپنی

عبارت میں ضروری ترمیم کرتی رہے۔ لیکن یہ زندگی آمریت کی زندگی نہیں ہوگی اس لیے کہ غزل کی آمریت نے اُردو شاعری کو جو نقصان پہنچایا۔ اس کا پورا احساس اب جاکر ہوا ہے۔ آمریت سے میرا مطلب یہ ہے کہ اس نے نظم کو، نظم کی ترقی کو خاصا پس پشت ڈال دیا تھا۔ اور آج سے بیس پچیس سال پہلے تک جگر یا فانی، اقبال جیسے شاعر کو ناظم کہتے تھے۔ شاعر نہیں سمجھتے تھے اور کوئی اُن کی بات کو عجیب نہیں سمجھتا تھا غزل گوئی اور غزل گو کی اس رعونت نے اُردو شاعری کو نقصان پہنچایا ہے اور غزل نے جب یہ سمجھا کہ وہ خلاصۂ کائنات ہے اور اردو شاعری کی آبرو ہے تو اس کی وجہ سے اردو شاعری کو بڑا نقصان ہوا۔ لیکن اچھی غزل کی جذبۂ انسانی کی پرخلوص تصویر کی، ایسی تصویر کی کہ جس میں معنی کی تہیں ہوں اور جو ذہن کو بہت کچھ ان کہی باتوں سے آشنا کردے گنجائش رہے گی اس میں ممکن ہے کہ سودا کی کاری گری

صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

کے بجائے میر کے نشتر

دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

اس کی طرف لوگ زیادہ مائل ہوں یعنی آئندہ کی غزل کالِ فن سے الگ ہو کر جذبے کی سیدھی سادھی پُرخلوص تصویر کی طرف مائل ہوگی اور اسی طرح باقی رہ سکے گی۔

مجھے آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ ادب کی دنیا میں آج یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اصناف کی دیواروں میں مقید نہ ہو جائیں اور ان میں کسی صنف کی ترقی یا کسی صنف کے زوال کو ادب کی ترقی یا زوال کے مترادف نہ سمجھنے لگیں۔ غزل مستقبل کی تمام شاعری نہ ہو سکتی ہے اور نہ ہوگی اور نہ اُسے ہونا چاہیے۔ لیکن مستقبل کی شاعری میں غزل زندگی کے بدلتے ہوئے میلانات سے رُوح اور غذا حاصل کرکے باقی رہ سکتی ہے جس طریقے سے کہ فنونِ لطیفہ میں خوش نویسی باقی رہ سکتی ہے جس طریقے سے کہ صراحت کے ساتھ اشارے کا حسن باقی رہ سکتا ہے۔ لیکن اردو شاعری کی ترقی بہرحال نظم سے وابستہ ہے اور نظم کو غزل سے ممکن ہے کہ اندازِ بیان کی شگفتگی اور گھلاوٹ لینی پڑے۔ لیکن تعمیری حسن کے سلسلے میں غزل زیادہ مدد نہیں دے سکے گی ——— مستقبل کی شاعری کا بڑا حصہ نظم پر مشتمل ہوگا مگر کچھ لوگ غزل بھی کہتے رہیں گے اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا۔

---

## سید سجاد ظہیر



پیشین گوئی ایک مشکل کام ہے اور اگر محض تفریح کے لیے یہ کام کیا جائے تو غیر ضروری بھی، اس لیے کہ جو چیز موجود ہو یا جس کے آثار موجود ہوں اس کے بارے میں تو رائے دی جا سکتی ہے۔ ادب اور آرٹ کے میدان میں اسی کو تنقید کہتے ہیں، لیکن جو چیز موجود نہ ہو اس کے متعلق بحث کرنا محض قیاس اور دلیے کی بنیاد پر کارِ عبث ہے یا ذہنی عیاشی۔ اس لیے میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اردو شاعری کی اس صنف کے متعلق جسے غزل کہتے ہیں ہم حقیقی اور اصلی نقطۂ نظر سے بحث کریں اور اگر اس کے مستقبل کے بارے میں بھی کچھ کہنا ہے تو آئندہ کے واقعی اور حقیقی ادبی امکانات کو ماضی اور حال کی ادبی اور تہذیبی صورتِ حال کی روشنی میں پرکھیں۔ یعنی یہ کہ ہمارا نقطۂ نظر معروضی یا Objective ہو۔ اس کی بنیاد ٹھوس عقائد پر ہو، نہ یہ کہ وہ ہوائی یا داخلی ہو، مثال کے طور پر اگر ہم کہیں کہ سرمایہ داری یا جاگیرداری آنے والے زمانے میں ہندوستان کا سماجی نظام نہیں ہوگی، بلکہ یہ نظام اشتراکی یا سوشلسٹ ہوگا تو یہ پیشین گوئی ہوائی نہیں ہوگی، اس لیے کہ ہندوستان میں سوشلسٹ نظم حیات کی تعمیر کا انحصار میری یا آپ کی پسند یا ناپسندیدگی پر منحصر نہیں ہے، بلکہ موجودہ زمانہ کے مادی حالات سائنس اور ٹیکنیک کی ترقی بڑے پیمانے پر قائم ہونے والی صنعت اور اس سے پیدا شدہ سماجی رشتوں نے سوشلزم کا قیام ہمارے ملک میں ناگزیر بنا دیا ہے۔ مستقبل کے امکانات کے متعلق اس دوربینی سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پھر ہم اپنے تعمیری عمل کی رفتار کو اور تیز کر سکتے ہیں، اور ہمارے راستے میں جو رکاوٹیں عارضی طور سے پیدا ہوتی ہیں اُن کا مقابلہ خود اعتمادی جوش اور قوت کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ اگر نصب العین واضح اور اس کی سچائی اور حقیقت کا ہمیں یقین ہو، تب ہم تاریخی عمل کے مجہول آلۂ کار نہیں بلکہ باشعور اور باہمت کارکن اور معمار بن جاتے ہیں۔

قبل اس کے کہ غزل کے مستقبل کے متعلق ہم کوئی رائے قائم کریں میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ ہم زیادہ وسیع طور سے اُس تہذیب پر ایک نظر ڈالیں جس کی شاعری اور جس کے ادب کا غزل اتنا اہم اور قابلِ توجہ حصہ اور جزو ہے۔ تاریخی عوامل کے سبب سے قوموں اور ملکوں کے تہذیب و تمدن میں، اور ان کی زبان اور دیگر فنونِ لطیفہ میں تبدیلیاں آتی ہیں، اُن کا ارتقا یا زوال ہوتا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی سے ترک نسل کے فوجی رہنماؤں

نے جب شمالی ہند، بنگال سے لے کر دکن تک اپنی سلطنتیں یہاں قائم کیں تب ان کے طرزِ معاشرت، سماجی مذہبی اور تہذیبی خیالات اور اسلوب نے ہندوستانی تہذیب پر گہرے اثرات ڈالے۔ باہر سے آنے والوں کی اپنی زبان یوں تو ترکی تھی، لیکن وہ لوگ ایرانی تہذیب اور ایرانی اثرات اس حد تک قبول کر چکے تھے کہ ان کے بیشتر علمی ادبی، مذہبی اور سیاسی کاروبار فارسی کے ہی ذریعہ انجام پاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایران سے براہ راست بھی بہت سے ایرانی ہندوستانی فرمانرواؤں کے درباروں میں مسلسل آتے رہتے تھے۔ اس طرح صدیوں تک فارسی ہی یہاں کے نئے حکمراں گروہ اور ان سے متعلق خالص ہندوستانیوں کی تہذیبی زبان رہی۔ ادب، علم اور مذہبی امور کے لیے بیشتر فارسی کا ہی استعمال ہوتا رہا۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ بھی کئی ادبی دھارے دربار اور حکمرانوں سے نسبتاً دور اس ملک میں جاری رہے، اور خود ہندوستانی فارسی پر یہاں کی زبانوں، یہاں کے رہن سہن کا اثر پڑتا رہا۔ غزل ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے ایران اور وسط ایشیا کے علاقوں میں تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں یعنی سعدی اور حافظ کے زمانے میں اپنے پورے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ وہیں سے یہ ہمارے یہاں آئی اور ہندوستان کے فارسی داں حلقوں میں رائج اور مقبول ہوئی۔ امیر خسرو، نظیری، عرفی، فیضی سے لے کر غالب اور اقبال تک ہندوستان کے فارسی غزل گویوں کا ایک سلسلہ ہے جن کی شاعری ایرانی ترکی نژاد ہونے کے باوجود ہندوستانی ہے۔ گو ان شاعروں نے فارسی میں شاعری کی تاہم ایرانی ان کو بجا طور پر "اجنبی" تصور کرتے ہیں۔ جیسے ممالک متحدہ امریکہ کا ادب انگریزی زبان میں لکھے جانے کے باوجود امریکی قومی خصوصیات کی آئینہ داری کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے، کہ ہندوستان کی فارسی شاعری، اپنی تمام ملکی خصوصیات اور بے شمار لطافتوں اور خوبیوں کے باوجود یہاں کے مخصوص اوپری طبقوں کی شاعری تھی۔ اس سے غالباً کسی قدر زیادہ وسیع جیسے کہ ہندوستان کا انگریزی ادب آج کل ہے، تاہم اُن علاقوں کی بھی بیشتر آبادی جہاں کے نظم و نسق میں فارسی رائج تھی۔ فارسی سے نابلد تھی اور اس لیے اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن جب آج سے تقریباً تین سو سال قبل، اردو ایک طرح سے فارسی پر حاوی ہونے لگی اور کم از کم اس کا شعری ادب فارسی سے ٹکر لینے لگا۔ تب یہ صورتِ حال بدلی۔ غزل پوری طرح سے ہندوستانی بن گئی۔ ہمارے بعض شعراء نے نئی نئی بحریں بھی وضع کیں۔ لیکن فارسی ادب اس کے استعارے، تشبیہیں، اسلوب اور طرز، اردو میں جذب ہو کر پھر بھی بڑی حد تک اردو شعر، خاص طور پر غزل پر اثر انداز ہوتے رہے۔ میں اس چیز کو اردو زبان یا اردو شاعری کی کوئی برائی تصور نہیں کرتا ہم تاریخ کے عمل سے لڑ نہیں سکتے۔ لیکن ہمیں اسے سمجھنے کی ضرور کوشش کرنا چاہیے اور دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کا رُخ کیا ہے۔

میں نے اوپر جو اشارے کیے ہیں ان سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہندوستان میں غزل کی زبان پہلے فارسی کے بعد اردو ہوئی اور اس کے بعد اس میں کچھ ہیئتی تبدیلیاں ہوئیں۔ ساتھ ہی ساتھ جہاں تک غزل کی معنویت کا تعلق ہے یہ بات عام طور سے مانی جاتی ہے کہ سماجی ماحول زمانے کی ضرورتوں نیز علاقائی کیفیات و حالات کا بھی اردو شاعری پر اور غالباً دوسری اصناف سخن سے زیادہ اردو غزل پر اثر پڑا ہے۔ میں یہاں پر بری یا گھٹیا شاعری کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ نہ اس بات کا کہ غیر شاعرانہ شاعری، بدقسمتی سے ہمارے تمام اصناف سخن پر بری طرح چھائی ہوئی ہے، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ آج کل بری نظمیں زیادہ لکھی جاتی ہیں یا بری غزلیں (اور یہ کوئی ہمارے دور یا ہمارے ہی ادب کی خصوصیت نہیں ہے)، لیکن ہمیں اس حقیقت کو ماننا چاہیئے کہ تا حال اردو میں ایسی شاعری جسے رفعت یعنی شاعری یا فن کے سب سے بلند درجہ پر رکھا جا سکے وہ غالب یا میر کی ہی شاعری ہے اور ان مختلف اصناف سخن میں جن میں ان اساتذہ نے طبع آزمائی کی ان میں ان کی غزل ہی سب سے زیادہ کامیاب رہی ہے۔ فارسی کے شعری ادب میں فردوسی، خیام اور مولانا روم کی عظمت کا میں قائل اور معترف ہوں لیکن میں حافظ کی غزل کو بھی بلند ترین شاعری کا نمونہ سمجھتا ہوں۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ غزل کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قصیدہ تقریباً مٹ چکا ہے، مثنوی اب نہیں لکھی جاتی، جوش اور فراق نے آج بھی رباعیاں لکھی ہیں جو بلند پایہ ہیں مگر یہ عام نہیں بلکہ ایک مخصوص صورت حال ہے۔ لیکن غزل کا بازار اب بھی سرد نہیں ہوا اور اس پرانی صنف سخن میں جس کی عمر اب تقریباً آٹھ سو سال ہونے کو آئی ہے اب بھی اگر ایران میں نہیں تو کم از کم ہندوستان اور اردو زبان میں بڑے پیمانے پر طبع آزمائی ہوتی ہے۔

میرے نزدیک غزل کی مقبولیت کے کئی اسباب ہیں۔ پہلے تو یہ کہ بحیثیت ایک صنف سخن کے اس کی یہ خصوصیت ہے، کہ قافیہ ردیف کے اور بحر کے تسلسل کے باوجود، اس کے اشعار منفرد ہوتے ہیں اور ایک ہی غزل میں مضامین اور شعری پیکر نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ غزل کا ایک اچھا شعر معنویت، اندرونی جذباتی کیفیات، اشاروں، اور کنایوں، استعاروں اور تشبیہوں کا ایک ایسا حسین اور پر اثر مجموعہ ہوتا ہے جس سے اگر ایک طرف ہمیں جمالیاتی حظ حاصل ہوتا ہے، جو کامیاب فنی تخلیق کی ایک لازمی شرط ہے۔ تو دوسری طرف وہ ہمارے بلند ترین انسانی احساسات کو غیر متوقع اور نئے اور اچھوتے انداز میں جگا دیتا ہے، وہ ہمارے ذہن اور نفس کے کسی ایسے گوشے پر اچانک روشنی کی کرن ڈال کر اسے منور کر دیتا ہے جس کے وجود سے بھی ہم اس وقت تک بیگانہ یا غافل تھے۔ مثال کے طور پر میر کا یہ مشہور شعر لیجیے۔ ؎ شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے ٭ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ظاہر ہے کہ اس چھوٹے سے شعر میں، میر نے ایک انسان کے انفرادی اضمحلال، اُس کے دکھ اور درد کی جو نازک اور پر اثر تصویر کھینچی ہے، وہ محض یہ ظاہر نہیں کرتی کہ فراق و ہجر یا معشوق کی بے اعتنائی کے سبب سے، شام کے وقت عاشق غیر معمولی طور پر غمگین ہو جاتے ہیں لیکن دل کو بجھا نہیں بلکہ "بجھا سا" کہہ کر اور اس کی تشبیہہ مفلس کے چراغ سے دے کر، جو جلتے بھی ہیں تو بجھے بجھے سے، ہمارے دلوں میں ایسی دردمندی اور ایسا گداز پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جو ہمیں ساری دنیا کے دکھی انسانوں کے کرب، اور ان کے اندوہ والم سے جیسے ہمیں ہم آہنگ کر دیتی ہے، اس طرح اس شعر کا مجموعی اثر، اس کے الفاظ کا دھیما لہجہ، اس کی بے پناہ حقیقت نگاری، پوری نوعِ انسانی کے دلوں کے درد کی کسک بن کر بڑی آہستگی سے ہمارے اپنے رگ و پے میں سرایت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح وہ ہمارا تزکیۂ نفس کر کے ہمیں بدل دیتی ہے، ہمیں بہتر انسان بننے میں مدد کرتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر شاعری کا اور کیا منصب ہو سکتا ہے؟

غزل کی ایک دوسری خصوصیت جو میرے خیال میں اس کی مقبولیت کا سبب ہے یہ ہے کہ اُس میں نئے مضامین کو قبول کرنے، انھیں فنی تخلیق میں بدل دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ غزل بے حد زمانہ ساز ہے مثلاً جدید زمانے میں قومی آزادی کی جدوجہد، اور تمام دنیا میں پھیلی ہوئی اشتراکیت کی انقلابی تحریک نے لاکھوں کروروں انسانوں کو متاثر کیا ہے اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے حق اور ناحق، کی سخت پیکار نظریاتی جذباتی اور سیاسی میدانوں میں جاری ہے۔ صنعتی انقلاب نے دنیا کو بدل دیا ہے، اور انسان کے مادّی وسائل میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ لیکن جب اقبالؔ یہ کہتے ہیں:-

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

تو وہ ہماری موجودہ زندگی کی اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مادّی فلاح و بہبود کے جو لامحدود امکانات سائنس کی ترقی کے سبب سے کھل گئے ہیں، وہ اسی صورت میں ہمارے لیے مفید ہو سکتے ہیں اور ہماری زندگیوں کی تاریکی اُسی وقت دور ہو سکتی ہے جب انسان اور انسانیت ان کا محور ہوں نہ یہ کہ انسان اپنی انسانیت کو فنا کر کے ان کا تابع ہو جائے۔ مجروحؔ نے اپنے اس شعر میں

ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی وادیوں میں رواں
چراغِ راہ کیے خوں چکاں جبینوں کو

اسی تصویر کا ایک طرح سے دوسرا رُخ پیش کیا ہے یعنی انسان موجودہ حالات سے شکست نہیں قبول کرتا بلکہ بڑی سے بڑی قربانیاں کر کے نئی اور زیادہ درخشاں منزلوں کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔

یہاں پر میں یہ بھی اشارہ کردوں کہ شعر محض حقیقت کا بیان نہیں ہونا چاہیے وہ کتنی بڑی حقیقت کیوں نہ ہو مثلاً میں نے جب اوپر کے دو شعروں کے معنی بیان کرنے کی کوشش کی تو دراصل ان کی اصلی خوبی فنا ہو گئی۔ شاعر یا فن کار دراصل معانی اور مطالب کو محسوس کرتا ہے، وہ انھیں اپنے تخیل اور اندرونی کیفیات کی روشنیوں سے منور کرکے، علامتوں اور استعاروں، موسیقی اور آہنگ کی ایک بالکل نئی تخلیق ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، جن میں معانی جذب تو ہوتے ہیں، لیکن جو بالکل ایک نئی چیز ہوتا ہے۔ اسی طرح جیسے دانہ مٹی پانی ہوا اور سورج کی کرن سے قوتِ نمو حاصل کرکے، بالکل نئی شکلوں میں پتیاں پھول اور پھل بن کر ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے۔ اس لیے حقیقت یا حقیقی تجربوں کا بیان شعر کو اچھا بنانے کے لیے کافی نہیں۔ شاعر تخلیقی عمل کی آنچ سے گزر کے یہ حقیقتیں کونسا روپ اختیار کرتی ہیں، اور پھر وہ ایک نئی شعری یا فنی حقیقت بنتی ہیں یا نہیں شعر کی کامیابی کا انحصار دراصل اس پر ہے!

غزل کی مقبولیت کے اور بھی کئی اسباب ہیں۔ لیکن یہاں پر ان سب کا گنانا غیر ضروری ہے، میں نے ابھی تک جو کچھ کہا ہے اور آپ میں سے جن حضرات نے میری چھوٹی سی کتاب "ذکرِ حافظ" کا مطالعہ کیا ہے، انھیں اس کا علم ہوگا کہ میں غزل کا بحیثیت ایک صنفِ سخن کے مخالف نہیں ہوں۔ اس قسم کی مخالفت جیسی کہ مثلاً کلیم الدین احمد صاحب کرتے ہیں، یا جیسی مخالفت کہ حضرت جوش ملیح آبادی کی طرف سے منسوب کی جاتی ہے، اسے میں غیر منطقی، اور غیر سنجیدہ سمجھتا ہوں، تاہم اردو شعر کی جو موجودہ صورتِ حال ہے اور دنیا کی بہتر ترقی یافتہ زبانوں میں، شاعری اس وقت جو رُخ اختیار کر رہی ہے، اس کا تجزیہ کرنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ غزل کی صنف جیسے جیسے زمانہ گزرے گا کم مقبول یا متروک ہو جائے گی، اور لوگ دوسری طرح کی شاعری زیادہ کریں گے۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ اس دور کے دو بڑے شاعر اقبال اور جوش ملیح آبادی جنھوں نے پوری ایک نسل کو متاثر کیا ہے، انھوں نے غزلیں بھی کہیں ہیں، اور اقبال کی چند غزلیں اردو کی بہترین غزلوں میں شمار کی جاسکتی ہیں تاہم یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں شاعروں کی بہترین شاعری غزل نہیں بلکہ دوسری صنفوں میں ہے۔ اسی طرح زیادہ جدید اہم شعرا میں مجاز، فیض، مخدوم، سکندر علی وجد، سردار جعفری جذبی، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں، ان سب کی شاعری میں مرکزی حیثیت غزل کو نہیں بلکہ نظموں کو حاصل ہے۔ اس گروہ کے شاعروں میں صرف مجروح ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے علاوہ اور کچھ نہیں لکھا اور غلام ربانی تاباں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ کافی عرصہ سے نظم گوئی کو مکمل طور سے ترک کرکے اب صرف غزل لکھتے ہیں۔ یقینی اس دور میں اعلیٰ درجہ

کے غزل گو شاعر بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً حسرت، جگر، یگانہ، فراق، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ زندگی کے ذہنی اور روحانی تقاضے اپنی مکمل تسکین کے لیے تنگنائے غزل سے مطمئن نہیں ہو سکتے اور اظہار و بیان کی زیادہ وسعت کے متلاشی ہیں۔ اچھی غزل انگوٹھی میں لگے ہوئے ایک نگینے کی طرح ہے لیکن جس طرح وہ سامانِ زیبائش کی تکمیل نہیں کر سکتی بلکہ اس کی تکمیل کے لیے ہمیں دوسرے، زیادہ رنگا رنگ، زیادہ بڑے زیورات کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسی طرح روح اور احساس، جذبات اور نفس کی مکمل تسکین محض ایک جوہر سے نہیں ہو سکتی چاہے وہ کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو۔

پھر ہماری نئی زندگی سے جو نئے حالات اور زیادہ پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے ہیں، انسانی علم اور ٹیکنیک کی ترقی کی وجہ سے، دنیا کے تمام ملکوں اور ان کی تہذیبوں کے قریب آجانے اور ایک دوسرے پر اثرانداز ہونے کے سبب سے جو نئی نفسیاتی کیفیات پیدا ہوئی ہیں، ان کے سبب سے ہماری زندگی کے ہر پہلو میں گہری تبدیلیاں نمایاں ہوئی ہیں۔ ان کا اظہار یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنے شعری تخلیق کے لیے بھی نئی راہیں دریافت کریں: پرانے شعری سانچوں کی جگہ نئے اچھوتے، جدید تقاضوں سے زیادہ قریب نئے شعری سانچے اختراع کریں۔ آج جب ہم عمارتیں بناتے ہیں۔ تو وہ ویسی نہیں ہوتیں، جیسی کہ آج سے سو برس پہلے تک بنتی تھیں۔ ان کا حسن دوسرا ہوتا ہے۔ یہی حال ہماری مصوری کا ہے اور دیگر فنون لطیفہ کا۔ تو پھر شاعری کے لیے نئے سانچے، نئے آہنگ، نئی تعبیر کیوں ضروری اور لازمی نہیں ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ضروری ہے اور یہ تبدیلی ہو کر رہے گی۔ اس یقین کا اظہار میں اس وجہ سے کر رہا ہوں چوں کہ دوسری زبانوں کی شاعری کے علاوہ خود اردو کی جدید شاعری میں اس کے آثار نمودار ہو چکے ہیں۔

---

## صفحہ ۲۴ کا بقیہ مضمون

اور عزردوں کو تسکین بھی دے گی مگر مستقبل جس طرز شاعری میں اپنے اظہار کے بھرپور وسیلے تلاش کرے گا وہ کوئی ایسی صنف ہوگی جو اس سے زیادہ مربوط اور مسلسل۔ فکر اور جذبے کی قوت سے زیادہ معمور۔ ہمہ گیر بصیرت۔ ذوق عمل اور رعنائی خیال سے زیادہ آباد ہو جسے کسی بہتر لفظ کی غیر موجودگی میں نظم کہا جا سکتا ہے۔ غزل اس وقت بھی زندہ رہے گی مگر غالب صنف شعر کی حیثیت سے نہیں ایک رنگین اور پر کیف اشارے کی طرح۔

## راجندر ناتھ شیدا



غزل مستقبل کی شاعری ہے یا نہیں یا غزل کا مستقبل کیا ہے؟ اصل میں یہ ایک ہی سوال کے دو پہلو ہیں۔ اس سوال پر غور کرنے سے پہلے مستقبل کا کوئی تصور ذہن میں ہونا ضروری ہے کیوں کہ آج سے دس پندرہ برس بعد کا زمانہ بھی مستقبل کہلا سکتا ہے اور سو دو سو سال بعد کا بھی۔ اور ظاہر ہے کہ مستقبل کے تعین کا فرق اس سوال کے جواب کی نوعیت کو بھی بدل دے گا۔ یہاں اگر مستقبل سے مراد دس بیس یا زیادہ سے زیادہ پچاس سال بعد کا زمانہ ہے تو غزل کی موجودہ مقبولیت اور اس کے چند محاسن کو دیکھتے ہوئے کسی قدر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں شاعروں کی ایک اچھی خاصی تعداد برابر غزل کہتی رہے گی۔ اس لیے کہ شاعروں کی موجودہ نسل میں تو ان گنت لوگ غزلیں کہتے ہی ہیں اس کے بعد ایک اور نسل سے بھی یہ توقع کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس میں سے بھی خواہ کسی قدر کم ہی سہی کچھ نہ کچھ غزل گو ضرور منظر عام پر آئیں گے کیوں کہ وہ بچے جو ابھی اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں وہ اسی عمر سے غزل کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ ہاں اگر مستقبل سے ہماری مراد اس سے بھی بعد کا زمانہ ہے تو زیادہ وثوق سے کچھ کہنا واقعی دشوار ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اب سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے اردو میں قصیدے، طویل عشقیہ مثنویاں اور واقعات کربلا سے متعلق مرثیے لکھنے کا بڑا رواج تھا جو اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس کی وجہیں مختلف ہیں مگر مختصراً یوں سمجھیے کہ اس وقت کا سماج شاعروں سے ایسی چیزیں تخلیق کرنے کا مطالبہ کرتا تھا۔ آج کے سماج کو ان کی ضرورت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان اصناف کے متعدد شاہکار اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ان کے مطالعے سے آج بھی ہم محظوظ ہو سکتے ہیں لیکن پھر بھی آج کے شاعر کو ایسی چیزیں تخلیق کرنے کی تحریک نہیں ہوتی۔ ایک تو علم کے فروغ اور عقلیت کے بڑھتے ہوئے رجحان ہی نے ان کے نیچے کی زمین کھوکھلی کر دی ہے دوسرے نہ نواب نوابوں اور راجاؤں کی وہ ریاستیں رہیں جو شاعروں کی سرپرستی کر کے انہیں قصیدہ گوئی پر آمادہ کرتی تھیں اور نہ لوگوں میں مذہب کے لیے پہلا سا جوش [illegible] قصیدے لکھنے اور مرثیہ نگاری کا محرک بنتا تھا۔ رہی عشقیہ مثنویاں تو ظاہر ہے کہ دور حاضر [illegible] نے لی ہے۔ ابھی کچھ زمانے پہلے تک شاعر کسی قدر تفصیل سے کوئی بات

کہنے کے لیے ترکیب بند اور ترجیع بند استعمال میں لاتے تھے۔ ان کے لیے کوئی موضوع بھی مخصوص نہیں رہے۔ یہ
اصناف محض فارم تھیں لیکن جدید شاعروں کو ان میں بھی قباحت محسوس ہوئی۔ انہیں بندوں میں شعروں
کی مقررہ تعداد اور ایک بند کے ہر شعر میں ردیف قافیے کی قید غیر ضروری نظر آئی۔ اس لیے انھوں نے
اظہار مطالب کے لیے نئی نئی اصناف سخن اخذ یا اختراع کرلیں۔ آج ہم ان کا حشر دیکھ کر کچھ بھی کہیں مگر
جس زمانے میں انیس، دبیر اور پیارے صاحب رشید مرثیے لکھ رہے تھے، ذوق اور غالب قصیدے
کہتے تھے اور گلزار نسیم اور فریاد داغ لکھی جارہی تھیں اس وقت کون پورے یقین سے کہہ سکتا تھا
کہ ان اصناف کا کوئی مستقبل نہیں۔ اسی طرح آئندہ کچھ وجوہ سے غزل کی مقبولیت میں بھی فرق آجائے یا
کچھ مدت کے بعد شاعر غزل کہنا ہی ترک کردیں تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوگی۔

یہ خیال رہے کہ میں نے مستقبل میں غزل کے متروک ہوجانے کے امکان کا ذکر کیا ہے۔ یہ
نہیں کہا کہ ایسا ہوگا ہی یا ایسے اسباب پیدا ہوگئے ہیں جن کے پیش نظر ایسا ہونا متوقع ہے۔

اردو ادب سے دلچسپی لینے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ہم غزل اور
اس کے مستقبل پر غور کررہے ہیں۔ پچھلی صدی کے ربع آخر ہی میں ملک کے کچھ مقتدر ادیبوں کو غزل کی
چند خامیوں کا احساس ہوچلا تھا اور ان میں سے کچھ نے غزل کو ان نقائص سے پاک کرنے کی ہر ممکن
کوشش بھی کی۔ اس تحریک کے اماموں میں سرسید کے علاوہ آزاد۔ حالی۔ اور شبلی کے نام لیے جاسکتے
ہیں۔ ان کے اعتراضات غزل کے موضوعات پر بھی تھے اور ہیئت پر بھی۔ لیکن اس زمانے میں غزل
اتنی ہر دل عزیز تھی اور ادب میں اس کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ یہ تناور درخت اپنی جگہ برقرار رہا۔ ہاں
ان کوششوں کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ غزل میں اصلاح کا احساس پیدا ہوگیا جس نے ایک طرف
غزل کے موضوعات میں پھیر بدل کیا، اسے واقعی زندگی سے قریب تر لانے اور اسی کے اسلوب بیان
کو مقبول بنانے کی کوشش کی تو دوسری طرف غزل ایسے نئے محسوسات اور خیالات کی حامل
نظر آنے لگی جو اس وقت کی زندگی کا تقاضہ تھے۔

غزل پر دوسری بڑی یورش اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ہوئی جب کچھ ادیبوں
نے اسے جاگیری نظام کا ورثہ قرار دیا اور اس کی ٹیکنیک کو آزادانہ جذبات نگاری کی راہ میں ناقابل
برداشت رکاوٹ سمجھا مگر غزل یہ زلزلہ بھی برداشت کرگئی کیوں کہ اس نے وقت کے کئی انقلابی رجحانات
کو اپنے اندر جذب کرلیا۔ اور حسرت۔ فانی۔ اصغر۔ فراق اور جگر ایسے بڑے فن کار پیدا کرکے اپنی
بنیادوں کو مستحکم بنالیا۔ آئندہ اسی سلسلے کی کڑیاں جذبی، فیض، شکیل اور مجروح وغیرہ نے جوڑیں۔

غرض زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح غزل میں بھی نئے اور پرانے رجحانات میں مسلسل کشمکش رہی ہے جس نے موجودہ غزل کو انقلابی اور رجعت پسندانہ قدروں کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ غزل نے اپنے کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے اگرچہ اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ غزل دوسری اصناف سخن کی نسبت اپنی روایتی اقدار کی زیادہ پابند ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آنے والے زمانے میں غزل اپنے آپ کو زندگی کے نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بنا پاتی ہے یا نہیں۔ نیز یہ کہ اُسے بڑے فنکار ملتے ہیں یا وہ گھٹیا قسم کے شاعروں کا کھلونا بن کر رہ جاتی ہے۔ اگر یہ خود کو نئے سانچوں میں ڈھالنے میں کامیاب ہوئی اور اسے واقعی اچھے شاعروں نے اپنایا تب تو وہ اپنی مقبولیت برقرار رکھ سکتی ہے ورنہ نہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ کچھ غیر معمولی واقعات ظہور میں آئیں اور غزل کی تخلیق پر اثر انداز ہوں۔ ملک کی تقسیم نے یہاں اردو کے مستقبل کو پہلے ہی مشتبہ اور غیر یقینی بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ غزل کا مستقبل اُردو کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آنے والے برسوں میں کتنے لوگ اُردو پڑھتے ہیں اور ان پڑھنے والوں کی علمی اور ادبی استعداد کیا ہوتی ہے۔ اردو کے ادبی رسائل اور ناشرین پر کیا گزرتی ہے اور وہ اردو ادب میں قوم کی دلچسپی کو برقرار رکھنے میں کس حد تک مدد دے سکتے ہیں یا دیتے ہیں کچھ زمانے پیشتر تک ہندوستان اور پاکستان میں ادبی تخلیق کے عوامل تقریباً یکساں رہے لیکن آئندہ قومی ضروریات اور حالات کے ماتحت ان میں فرق آنا ضروری ہے۔ بدیہی طور پر پاکستان میں اردو ادب کی تخلیق اور فروخت وغیرہ کے لیے یہاں ایسی دشواریاں نہیں ہیں مگر وہاں مشکل یہ ہے کہ اردو اجنبی زمین سے لاکر لگایا ہوا پودا ہے۔ اس لیے وہاں سو پچاس سال کے بعد غزل کا کیا حشر ہوتا ہے یہ بہت کچھ وہاں کے مخصوص حالات پر منحصر ہوگا۔

غیر معمولی واقعات سے متعلق قیاس آرائی کرنا بے سود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے واقعات کبھی کبھی زندگی اور شعور کے ارتقا پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں اور ادب کی اصناف ہی نہیں تاریخ کے رُخ تک کو موڑ دیتے ہیں، مگر ان کی ٹھیک سے پیش گوئی کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ دورِ حاضر میں زندگی بہت پیچیدہ ہو گئی ہے اور بڑی تیزی سے بدل رہی ہے۔ ایسی بہت سی چیزیں جو مستحکم بنیادوں پر کھڑی نظر آتی تھیں اور ایسے نظریات جو اٹل حقائق سمجھے جاتے تھے اور عقائد کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ موجودہ زندگی کے تند و تیز دھاروں کے ساتھ بہے چلے جا رہے تھے ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ سے پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ اس قیامت خیز لڑائی کا نتیجہ روس میں ایک ایسے انقلاب

کی صورت میں رونما ہوگا جو ساری دنیا کی مادی اور ذہنی فضا میں ہلچل پیدا کر دے گا۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کا نوآبادیاتی نظام جس تیزی سے منہدم ہوا ہے اور ہوتا جا رہا ہے۔ جنگ سے پہلے اس کی بھی پیش گوئی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ آئندہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی پوری زندگی پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔ ان میں نئے عزائم اور حوصلے پیدا ہوں گے اور یہ ایک بڑی حد تک دنیا میں قوت کا توازن بدل جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ واقعات معجزے نہیں ہیں۔ ایسا کچھ ہو سکنے کے امکانات اور اسباب پہلے سے موجود تھے۔ مگر واقعات آئندہ ٹھیک یہی صورت اختیار کریں گے پہلے سے یہ بتا سکنا بھی ممکن نہیں تھا۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ غزل کے مستقبل سے متعلق میں دانستہ یا مصلحتاً ہاں یا نہیں میں جواب دینے سے احتراز کر رہا ہوں تاکہ اگر پیش گوئی غلط ثابت ہو تو غلطی کی ذمہ داری سے بچ سکوں۔ سوئے اتفاق سے مصلحتاً یا گول مول بات کرنے کا ہنر میں نے نہیں سیکھا۔ لیکن کیا کیا جائے اس مسئلے کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ دوٹوک بات کہی جا نہیں سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی کے ارتقا کے کچھ وسیع رجحانات ہوتے ہیں جو اپنی راہ میں حارج چیزوں کو ہٹاتے اور کچلتے ہوئے گزر جاتے ہیں لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ روایات جن کی جڑیں ذہنوں میں بہت گہری ہوتی ہیں اور وقت کے قوی میلانات سے براہ راست تصادم میں نہیں آتیں بہت دیرپا ثابت ہوتی ہیں۔ غزل کی کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو بدلتی رہیں اور آئندہ اور بھی زیادہ بدل سکتی ہیں کچھ البتہ ایسی ہیں اور ان میں موضوعاتی اور ہیئتی دونوں قسم کی خصوصیات شامل ہیں جنھیں ترک کرکے غزل غزل نہیں رہ سکتی۔ اول الذکر خصوصیات میں تو غزل کو زندہ رہنے کے لیے وقت سے مطابقت پیدا کرنا ضروری ہوگا مگر دوسری طرح کی خصوصیات اور وقت کے اہم رجحانات میں ٹکراؤ کا ہونا ناگزیر نظر نہیں آتا۔ یہاں البتہ صحیح ہے کہ غزل کے کلاسیکی مزاج کے پیش نظر اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ آئندہ زندگی کے فکری اور جذباتی مطالبات کو پورا کر سکے گی واقعی ایک سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل سوال ہے لیکن اس کا جواب مستقبل ہی دے سکتا ہے کیوں کہ مختلف چیزوں کا عمل اور ردعمل اس پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں مجموعی حیثیت سے غزل کے مستقبل پر غور کرنے سے بہتر یہ ہوگا کہ اس کی چند اہم موضوعی اور ہیئتی خصوصیات پر الگ الگ نظر ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ ان میں سے کون کون سی خصوصیات مستقبل میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، کون سی ایسی ہیں جو دم توڑ چکی ہیں یا دم توڑ رہی ہیں اور کون سی ایسی ہیں جن کا برقرار رہنا ان کے کچھ شرائط پورا کرنے پر منحصر ہوگا۔ اس سے یہ بھی

اندازہ ہو سکے گا کہ کن سمتوں میں آگے بڑھ کر غزل کی بقا کے امکانات بڑھ سکتے ہیں اور کون سی باتیں ان امکانات کو کم کرنے کا باعث بن سکتی ہیں۔ پہلے غزل کے موضوعات اور پھر ہیئت سے متعلق خصوصیات کو لیجیے۔

غزل کی موضوعاتی خصوصیات پر غور کرنے کے لیے اسی حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انیسویں صدی میں اردو شاعری پر مغرب کے جو اثرات پڑنا شروع ہوئے ان میں کچھ بنیادی نوعیت کے تھے۔ یہ اسی وقت سے آج تک کی شاعری میں کسی نہ کسی صورت سے برابر جھلکتے نظر آتے ہیں۔ ایسے اثرات میں زیادہ قابل ذکر عقلیت، ارضیت اور اجتماعیت ہیں۔ چنانچہ یہ چیزیں غزل کے ارتقا پر اثر انداز ہوئیں۔ عقلیت کے رجحان نے اگر ایک طرف غزل کو عشق کے رسمی مفروضات، قتل و خونریزی، بادیہ پیمائی، طوق و سلاسل، آنسوؤں کے سیلاب اور آہوں کی آتش زنی، محبوب کی ستم رانی اور بے وفائی و ہرجائی سے نجات دلائی تو دوسری طرف اس نے ان صدیوں سے چلے آرہے بے حقیقت مذہبی اور روحانی تصورات سے بھی پاک کرنے کی کوشش کی۔ یہ درست ہے کہ اردو میں ایسے شاعروں کی تعداد بہت کم ہے جنھیں تصوف سے کوئی دلی لگاؤ رہا ہو مگر شاعری میں جذباتی گہری کیفیت اور فکری گہرائی پیدا کرنے کے لیے شاعروں نے اس کا استعمال دل کھول کر کیا ہے۔ حالاں کہ پچھلے سو برس میں اردو غزل پر صوفیانہ اثرات بہت گھٹ گئے ہیں لیکن تلاش کرنے سے آج بھی اچھی خاصی تعداد میں ایسے شاعر مل سکتے ہیں جن کی شاعری میں صوفیانہ عقائد کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ اب غزل میں مذہبی، الہیاتی اور صوفیانہ تصورات کے لیے گنجائش نہیں رہی۔ اگر غزل کو زندہ رہنا ہے تو اسے ان چیزوں سے پوری طرح کنارہ کشی اختیار کرنا ہوگی۔

ان صوفیانہ اور الہیاتی خیالات کے علاوہ جو موجودہ علوم کی روشنی میں صحیح معلوم نہیں ہوتے غزل میں ایسے ذہنی تجربات نفسیاتی رموز اور دوسرے حقائق بھی موجود ہیں جو جدید فکریات کی کسوٹی پر بھی پورے اترتے ہیں۔ پھر پچھلے تقریباً سو برس میں بہت سے نئے محسوسات اور خیالات بھی غزل میں شامل ہوئے ہیں۔ اس دور میں زندگی کی متعدد روایتی قدروں پر تنقید کر کے ان کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا گیا۔ نئے رجحانات اور جذبات کی ترجمانی ہوئی۔ حالی۔ اکبر۔ اقبال۔ چکبست۔ حسرت۔ جگر۔ فیض۔ مجاز۔ ساحر۔ اور نہ جانے کتنے شاعروں نے مختلف سماجی امور اور متعلقہ حقائق سے ایوان غزل کو سجایا۔ یہ صنف وطنی، قومی اور ملی درد کی ترجمانی سے گزر کر پوری انسانیت کے درد، غیر ملکی حکومت کے خلاف جدوجہد اور طبقاتی کشمکش کی آئینہ دار بن گئی۔ اس نے سماجی ظلم، ناانصافی اور ریاکاری کے خلاف

صدائے احتجاج بلند کی اس نے غزل کی صحت مند روایات مثلاً فراخ دلی، رواداری، بلند نظری، استقلال بے غرضی، ایثار، وفا شعاری اور اپنے مقصود کے لیے انتھک کوشش وغیرہ سے پورا فائدہ اٹھایا۔ غزل پر یہ اعتراض کہ اس میں عمومیات میں باتیں کی جاتی ہیں زیادہ وزن نہیں رکھتا کیوں کہ وہ عموماً جو سینکڑوں ہزاروں سال تک تاریخی نشیب و فراز کے باوجود انسانی زندگی پر منطبق ہو سکیں شاعری کو آفاقیت بخشتی ہیں۔ غزل کی یہ ایک خصوصیت ضرور ہے لیکن یہ بھی درحقیقت اس کا ایک وصف ہی ہے۔ غزل کے مذکورہ تمام عناصر مثبت قدروں کے حامل ہیں جو غزل کے وقار میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس حیثیت سے غزل کو ترقی دینے کے لیے شاعروں کو وسیع مطالعے اور رموزحیات میں عمیق تر نظر پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ غزل ابتدا ہی سے عشقیہ جذبات اور واردات کے اظہار تک محدود نہیں رہی مگر اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ غزل کا مرکزی موضوع عشق ہی ہے۔ حالی نے جس عشق کے متعلق کہا تھا۔ "اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا۔ جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا" وہ درحقیقت عشق نہیں تھا اوباشی تھی جو قومی کردار کی جڑیں کھوکھلی کر رہی تھیں۔ ورنہ عشق بذاتِ خود کوئی ایسا فعل بد نہیں ہے جو لازمی طور پر خانگی اور قومی زندگی کو درہم برہم کرتا ہو۔ عشق مادّی زندگی سے بلند و بالا کسی روحانی جذب و کشش کا بھی نام نہیں۔ یہ اپنے جنسی کردار کو برقرار رکھتے ہوئے بھی تہذیب نفس اور زندگی کو خوش گوار بنانے کا ایک قابل قدر ذریعہ بن سکتا ہے، بشرطیکہ عشق کا تصور صحیح اور متوازن ہو۔ غزل کی اس درجہ مقبولیت کی شاید سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اس کی اساس ایک ایسے جذباتی عمل پر ہے جو عالمگیر بھی ہے اور زندگی کی رعنائیوں اور مسرتوں میں اضافہ کرنے والا بھی۔ غزل میں عشق کے لطیف، کیف آور اور پاکیزہ واردات پہلے بھی بڑی خوب صورتی سے نظم کیے جاتے تھے اور گزشتہ سو سال میں تو غزل کہنے والوں نے عشق کو مہذب بنانے اور اسے حقیقی زندگی سے قریب تر لانے کی مسلسل شعوری کوشش کی ہے۔ یہ رجحان مستقبل میں بھی غزل کو ہر دل عزیز بنائے رکھنے میں مدد دے گا۔

خالص فنی ٹیکنیکی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو غزل میں جہاں کچھ خوبیاں ہیں وہیں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اس صنف میں مفصل مسلسل اور مدلل باتیں کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس لیے بھی اسے کچھ ادیبوں نے موجودہ زمانے کی ضرورتوں کے ناقابل قرار دیا ہے۔ مجھے یہ بات زیادہ صداقت پر مبنی نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ شاعری اصولی طور پر جذبات کے منتقل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے، یہ انتقال خواہ مرتب و مفصل طریقے پر ہو خواہ مختصر، شعر کا کمال اس کی اثر آفرینی میں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مختصر بات بلیغ

جو تاثیر ہوتی ہے مفصل بیان میں نہیں ہوتی۔ دلیل یا عقل اور جذبے کے تضاد کی بات بھی منطقی سقم سے خالی نہیں۔ کیوں کہ شاعری دلیل بحث نہ ہو کر جذبات کی زبان ہوتی ہے۔ اگر کوئی شاعر غیر معقول آدمی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ باتیں بھی غیر معقول کرے گا اس کے جذبات بھی غیر معقول ہوں گے لیکن اگر وہ خود معقول قسم کا آدمی ہے تو اس کے جذبات میں بھی معقولیت ہوگی۔ زبور عجم اور بال جبریل کی اقبال کی غزلیں اس کی شہادت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

یہ بجا ہے کہ قدیم زمانے سے لے کر دور حاضر تک کے شاعروں میں سے اکثر نے کبھی کبھی مسلسل غزلیں کہنے کی کوشش کی ہے، غزلوں میں قطعہ بند اشعار شامل کیے ہیں اور ان میں کچھ کوششیں کامیاب بھی نظر آتی ہیں مگر پھر بھی یہ محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ اگر یہ شاعر ان مضامین کو بیان کرنے کے لیے کوئی دوسری فارم استعمال کرتے تو وہ شاید اس سے بھی زیادہ کامیاب ہو سکتے تھے۔ اس لیے مسلسل غزلیں کہنا سعی رائگاں معلوم ہوتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ غزل کہنے والے کو ہر دو مصرعوں میں ایک پوری بات کہنا ہوتی ہے۔ اس کا کینوس چھوٹا ہوتا ہے۔ اسی میں اسے اپنی قادر الکلامی کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ غزل کے شعر میں ایک لفظ کا بے محل استعمال بھی پورے شعر کی تاثیر کا خون کر سکتا ہے۔ یہ کام بہت مشکل ہے مگر صدیوں سے بے شمار شاعروں کی طبع آزمائی کی وجہ سے غزل میں جذبات نگاری کی بڑی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ محسوسات کی لطافت، جذبات کا زیر و بم، اشاروں کنایوں میں گفتگو، طنز و ظرافت، سوز و گداز، عشقیہ زندگی کے گوناگوں واردات کی عکاسی استعاروں اور علامتوں کے پردوں میں اظہار مطالب، مترنم بحروں کا انتخاب، اجتماع ضدین، لفظوں اور فقروں کی تکرار اور تواتر، یہ اور ایسے بہت سے حربے ہیں جنھیں فن غزل گوئی کے ماہر برابر بڑی کامیابی سے استعمال کرتے رہے ہیں۔ ایک اور بات بھی ہے۔ ہماری شاعری کے اصول وضع کرنے والوں نے لسانی اور عروضی قواعد کو اتنا سخت بنا دیا اور ان کی پابندی پر اتنا زور دیا جاتا رہا ہے کہ ان کا نبھانا صرف چند مشاق فنکاروں ہی کا کام رہ گیا۔ یوں تو یہ پابندیاں ہر صنف نظم پر عائد ہوتی ہیں لیکن غزل گو کے لیے تو ان سے انحراف ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا ہے۔ غزل پر اعتراض کرنے والوں نے اس سختی کی وجہ سے بھی اس صنف کو مستقبل کے ناقابل سمجھا۔ میری رائے میں اس سختی سے غزل کو نقصان بھی پہنچا ہے اور فائدہ بھی۔ اس سے توجہ موضوع سے زیادہ فنی ضروریات پر مرکوز ہوتی رہی ہے۔ آج بھی غزل عزم اور نظم اور ناقص اور ثالث قافیے برداشت نہیں کر سکتی اگرچہ صوتی اعتبار سے ان میں کوئی سقم نہیں۔ بہر کیف اگر شاعر اچھا ہو تو ان پابندیوں کے باوجود وہ اچھی غزلیں کہہ سکتا ہے۔ اور ایسا برابر ہوتا رہا ہے۔ اچھے شاعروں نے اچھی غزلیں کہی بھی ہیں۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ غزل کا مستقبل خارجی حالات پر بھی منحصر ہے اور اس بات پر بھی کہ آئندہ سالوں میں خود غزل وقت کے مطالبات کو پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل ایک کلاسیکی فارم ہے جو اپنی کچھ قدیم روایات سے روگردانی نہیں کر سکتی۔ مثلاً وہ مصرعوں میں ارکان کی کمی بیشی اور قافیے اور ردیف کی بے قاعدگی کی متحمل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ پراگندہ جذبات نگاری کے اپنے کردار کو خیرباد کہہ سکتی ہے۔ غزل میں عمومیات سے بھی مفر نہیں اور نہ اس میں تفصیل کے ساتھ سلسلے وار باتیں بیان کی جا سکتی ہیں۔ اگر کسی شاعر کو ایسا کرنا ہے تو اس کے لیے دوسری اصناف سخن کا سہارا لینا ناگزیر ہوگا۔ اس سبب کے باوجود اگر سلیقے سے غزل کہی جائے اور اسے وقت کے عام میلانات سے ہم آہنگ کر لیا جائے۔ اس کے جو عناصر وقت کے بہاؤ میں حارج ہوتے ہیں انھیں ترک کر دیا جائے تو غزل کے یہ کلاسیکی لوازم اس کی راہ میں کوئی بڑی رکاوٹ بنتے نظر نہیں آتے۔ ہاں اگر آئندہ غزل اپنے اندر ضروری ردّ و بدل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔ وہ جاگیری فکریات کی فضا سے باہر نہیں نکلتی اور اسے اچھے فن کار نہیں ملتے تو زیادہ عرصے تک اس کا مقبول رہنا قرین قیاس نہیں ہے۔

---

# ڈاکٹر محمد حسن

غزل صدیوں تک ہماری متاعِ بے بہا رہی ہے اس مدت میں اس کی پیکر تراشی ہوتی رہی ہے اور ہمارے دور میں غزل احساس جذبہ یا خیال کی اس تاثراتی تلخیص کا نام ہوگیا جو داخلی یا عشقیہ لب و لہجے کے ساتھ رموز و ایما کی زبان میں بیان کی جائے۔ گویا اختصار، داخلی رنگ و آہنگ، تاثراتی انداز اور رمزیت اس کی امتیازی خصوصیات قرار پائیں۔

غزل کی یہ خصوصیات صدیوں کی کمائی ہیں۔ ان کے پیچھے عرب کے جلال و جمال سے زیادہ عجم کا سوز دروں ہے۔ یوں تو رودکی اور دقیقی نے بھی غزلیں کہی ہیں لیکن مولانا شبلی نے بجا طور پر سعدی کو غزل کے متداولہ اسلوب کا موجد قرار دیا ہے "شیخ سے قبل (غزل میں) رزمیہ جذبات کی جگہ تغزل اور عشقیہ مضامین نے نہیں لی تھی" عشق کے واردات اور معاملات عام طور پر بیان نہیں کیے جاتے تھے صرف مدح محبوب ہوتی تھی سعدی کے زمانے میں پہلی بار غزل میں ایسے خیالات پیش کرنے کا چلن ہوا جو مولانا شبلی کے الفاظ میں "عموماً عشاق اور ہوس پیشہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں" یہ وہ دور ہے جب تاتاریوں نے عالم اسلام کو تہہ و بالا کر دیا تھا اور تفکر و تعقل کی راہ نمائی کی باگ چھین لی تھی معقولات، سائنس یا فلسفے میں عالم اسلام سے اس کے بعد کوئی دقیع اور عہد آفریں کارنامہ سرانجام نہ پا سکا۔ مایوسی اور شدت حزن و یاس میں خدا یاد آیا تو تصوف کا عروج ہوا تو تقدیر پرستی کی طرف میلان ہوا تو حقیقت تک انسانی فہم کی نارسائی کا احساس عام ہوا گہری داخلیت اور دروں بینی پیدا ہوئی تو خارج سے گریز اور عمل کے بجائے باطنی بصیرت پر زور دیا جانے لگا جمال پرستی اور خمریات کی طرف توجہ مبذول ہوئی خیالات و اقدار کا یہ وہ پیکر ہے جس کی تشکیل میں سنائی، خیام اور بعد کو حافظ بھی شریک رہے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب عرب، ایران بلکہ پورا عالم اسلام کسی عظیم آدرش، کسی اعلیٰ مقصدِ حیات، کسی نوائے سینہ تاب سے محروم ہوگیا تھا۔ فکر و تعقل کا سورج گہنا چکا تو جذبے کے چراغ روشن ہوئے۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ دورِ انتشار میں جب منزل کی روشنیاں بجھنے لگتی ہیں۔ راہِ عمل دھندلا جاتی ہے جب کلمۂ حق صرف سرِ دار ہی کہا جا سکتا ہے اور جبر و استبداد یا سیاسی بے اطمینانی مافی الضمیر کو ربط و آہنگ کے ساتھ ادا کرنے کی مہلت دیتی تو غزل کا افسوں جاگ اٹھتا ہے۔ یہ محض اتفاق

نہیں ہے کہ ہندوستان میں غزل کے شباب کا دور آخری مغلیہ دور کے شدید انحطاط اور سیاسی ابتری کا دور ہے ادھر زمانے نے سلطنت دہلی کی بساط الٹنی شروع کی اور ادبار نے سیاسی انتشار کا ناسور پھوٹ نکلا ادھر غزل کی راگنی چھڑی۔ میرؔ نے اپنی شاعری کو "دل و دلی" کا مرثیہ کہا ہے اس مرثیہ کے بغیر غزل کا رنگ و آہنگ ادھورا رہتا ہے۔ چاہیے تو اسے سوز و گداز کہہ لیجیے یہ کم ہو جائے تو غزل میں ناسخیت آجاتی ہے اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے عزیزؔ لکھنوی اور ان کے ہم عصروں کی طرح میت جنازے، قبر وغیرہ کے ذکر سے نقلی طور پر ماتمی لَے پیدا کرنی پڑتی ہے۔ سوز و گداز سے وسعت نظر اور رواداری۔ دردمندی اور انسان دوستی کی اقدار حاصل ہوئیں۔ کچھ تاب زلیست اور تاب مقاومت بھی ملی مگر ذوق عمل اور نشاط کار اس سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس سے ایک حسین اور شاعرانہ اداسی کا جنم تو ہو سکتا ہے مگر فکر کی تابناکی اور خیال کی حیات آفرینی نہیں مل سکتی۔

---

مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنا کاہنوں اور غیب دانوں کا کام ہے لیکن اگر حال مستقبل کا اشاریہ ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بنی نوع انسان کا مستقبل ذوق عمل اور عقل و ادراک کے ہاتھ میں ہے اور مستقبل کی شاعری ذوق عمل اور صلابت خیال سے جذبے کی رنگینی اور قوت پیدا کرے گی وہ مسلسل پرواز اور مربوط تاثر پاروں کی شاعری ہوگی۔ غزل خیال یا مسلسل پرواز کی شاعری نہیں ہے۔ وہ خیال کے منزل بمنزل ارتقا کو مربوط اور مکمل شکل میں پیش کرنے کے بجائے جذبے، احساس یا محض روایتی تصور کے ایک لمحۂ گریزاں کی تصویر ہے۔ وہ عام طور پر خیال کی قطعیت اور وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کے بجائے اس پر رمز و کنائے کے پردے ڈال دیتی ہے جس سے اصل خیال مجروح یا مبہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ کسی واضح تصور حیات یا نظام فکر کی طرف راہ نمائی کرنے کے بجائے اکثر اسے روایت کی بھول بھلیاں میں گم کرا دیتی ہے۔ خیالات و تصورات محض اس لیے قبول کر لیے جاتے ہیں کہ "برائے شعر گفتن خوب" ہیں۔ زندگی بھر شراب نہ چکھی ہو تو بھی رندِ بلانوش کا بہروپ بھرنا پڑتا ہے کبھی بھول کر بھی عشق و رسوائی کے کوچے سے نہ گزرے ہوں مگر اپنے کو قیس و فرہاد بلکہ منصور و سرمد کا ہم پلہ قرار دینے میں باک نہیں ہوتا۔ شاعری میں یقیناً رمز و استعارہ کا استعمال ہونا چاہیے مگر اسے غیر فطری زندگی نہ بن جانا چاہیے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ ہمارے یہاں (LyRiciSM) یا غنایت کا ترجمہ کبھی تغزل کے لفظ سے کیا جاتا ہے یہ تغزل یقیناً غزل کے ہم معنی نہیں ہے تغزل عشقیہ اور داخلی لب و لہجے کی مٹھاس اور کیفیت کا نام ہے وہ شاعری کی ہر صنف میں ہو سکتا ہے اور اس کا سہارا لے کر

غزل کو خلاصۂ شاعری کہنا درست نہیں ہے۔ جب تک شاعری زندہ رہے گی تغزل بھی زندہ رہے گا کہ یہ انسان کے لطیف ترین جذبات واحساسات سے پیدا ہوتا ہے لیکن غزل کا اپنے متداولہ مفہوم میں غالب صنف شعر کی حیثیت سے زندہ رہنا مشتبہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک کے خاتمے کے بعد نئی نسل میں غزل خاصی مقبول ہوئی۔ پہلے ان غزلوں کا چلن ہوا جن میں قدیم رموز وعلائم کے دروبست کے ساتھ نئی سماجی معنویت کو سمویا گیا تھا جن میں فیض کا نام سرفہرست ہے پھر بعض غزل گو شعرا نے سماجی معنویت کو پس پشت ڈال دیا اور موہوم اداسی، خود فراموشی، خود کلامی اور بجھے ہوئے دل کی راگنی چھیڑ دی" اسے تقلید میرؔ" کے نام سے بھی پکارا گیا۔ اس نئے میلان کو بعض حلقوں میں عہد حاضر کے تقاضوں سے غزل کی ہم آہنگی کے ثبوت میں پیش کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں فکر وعمل سے گریز پائی کو زیادہ دخل تھا۔ غزل کی مقبولیت کو کم۔ ترقی پسند تحریک ختم ہوئی تو بہت سے دانش وروں کا چراغ منزل بجھ گیا۔ ان کے سامنے کوئی نیا نشان راہ نہ تھا کوئی سہارا دینے والا نیا نظام حیات نہ تھا بعض ایسے بھی تھے (خصوصاً پاکستان میں) جو اپنے دل کی بات کو بے محابا نہیں کہہ سکتے تھے اس لیے غزل کا پیرایہ اختیار کرنے پر مجبور تھے گویا غزل کی معروضہ "تجدید" یا تو محض جبر حالات کا نتیجہ تھی یا افلاس فکر کا۔

ایک زمانہ تھا جب انفرادیت کی نفی ہی آرٹ کی بنیاد تھی۔ سنگیت کے راگ اور ٹھاٹھ مقرر تھے جو بھی ان راگوں کو اصول وضوابط کے مطابق گلے سے ادا کرے وہی موسیقار سمجھا جاتا تھا مصوری کے اسالیب اور قلم مقرر تھے جو مقررہ موضوعات کو مغل قلم یا کانگڑہ قلم کے رنگ وآہنگ کے ساتھ پیش کردے وہی مصور قرار پاتا تھا گویا اصل کمال یہ تھا کہ مقررہ اسالیب وضوابط کو کامیابی سے نبھادے۔ غزل بھی ایسا ہی ایک اجتماعی سانچہ ہے اس کے بھی مضامین وموضوعات، اسالیب وضوابط حتیٰ کہ رموز و کنایات تک مقرر اور متعین ہیں۔ یہ اس کا عیب بھی ہے اور ہنر بھی۔ اس سے اس میں نفاست اور لطافت آئی۔ شائستگی اور تراش خراش پیدا ہوئی۔ لہجے کا وقار اور شعریت کی جھنکار پیدا ہوئی۔ لیکن یہ جھنکار پائل ہی کی نہیں تھی زنجیر کی بھی تھی اور آج اس دائرے میں رہ کر وقت کے تقاضوں کو پورا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس کی فضا اور اس کی پرواز محدود ہے وہ صرف چند موضوعات اور چند رمزوکنایات کے اندر اسیر ہے اور تسلسل پرواز اور ربط وآہنگ کی خیال انگیزی اس کے بس میں نہیں۔

آنے والا زمانہ شاید اسے پھر بھی گنگنائے گا۔ نوجوان اس کے اشعار پھر بھی دھڑکتے ہوئے دلوں سے پڑھیں گے یاد ل سے مصور اپنی خلوتوں میں دہرائیں گے۔ اُداسی اور دل شکستگی میں وہ کبھی کبھی رنجوروں

(باقی ص۵۲ پر)

# گوپی ناتھ امن لکھنوی



حضرات! غالباً اس رعایت سے کہ اب تک جتنے حضرات نے اظہار خیال کیا ہے وہ سب اسی صدی میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ پچھلی صدی کا آدمی بھی غزل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ اب میں کیا عرض کروں۔ میرے اُستاد مرحوم مولانا عزیز کے ایک مشہور شاگرد جگت موہن لال رواں تھے ان کی نظم کا ایک شعر جو آج سے چالیس سال پہلے انھوں نے پڑھا تھا مجھے یاد آ رہا ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا۔ ؎

بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل
پوچھئے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل

غزل کے امکانات جیسا کہ اس وقت کے ادیبوں سے آپ نے سُنا بہت ہیں یعنی وہ وقتی اثرات کو قبول کرتی رہی ہے اور قبول کرتی رہے گی۔ آج غزل کی نامقبولیت کی بات جو حضرات کرتے ہیں یا ایسا سمجھتے ہیں کہ مستقبل قریب میں وہ نامقبول ہو جائے گی، مجھے معاف کیا جائے، وہ ادیبوں کی، عالموں کی نمائندگی تو کرتے ہیں لیکن عوام کی نمائندگی نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ایک پہلو جو ابھی آپ کے سامنے نہیں آیا وہ یہ ہے کہ غزل نے مستقل طور پر، جن زبانوں کو میں جانتا ہوں ان میں سے دو زبانوں پر یعنی پنجابی اور ہندی پر ایک مستقل اثر ڈالا ہے اور اگر میں بغیر کسی طبقے کو ناراض کیے ہوئے کہہ سکوں تو ہندی شاعری میں وہی صنفِ کلام آج باوجود تمام ترقیوں کے اور باوجود اس کے کہ وہ راشٹر بھاشا کہلاتی ہے، وہ صنفِ سُخن زیادہ مقبول ہے جو غزل کے زیادہ قریب ہے۔ آج نیرج ہندی کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ کامیاب شاعر سمجھا جاتا ہے اور جب اس کا کلام اس طرح شروع ہوتا ہے "تو ان کو بدلنے کے لیے ہم کو بدلنا ہوگا" تو چاہے وہ اُردو اعتبار سے ناموزوں سہی لیکن بڑے شوق سے وہ چیز سُنی جاتی ہے اور "جس میں نہ ہو جوش وہ جوانی کیا ہے" جب یہ رُباعی ہندی میں پڑھی جاتی ہے تو وہ اور چیزوں کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ جس طرح سے آج سے دو سو برس پہلے بہاری کا کلام ہندی میں مشہور ہوا اور آج بھی تغزل کی وجہ سے اپنا مستقل مقام رکھتا ہے۔ آج بھی ہندی کا وہ کلام زیادہ مقبول ہے جو اردو غزل سے قریب ہو اور جہاں تک کہ پنجابی شاعری کا تعلق ہے انھوں نے

تو غزل کی بحر کو بھی اپنایا ہے وہی آشیانے ان کے یہاں ہیں وہی قفس ان کے یہاں ہے۔ وہی بلبلیں ان کے یہاں ہیں اور اس کی جھلک آپ کو جہاد تو ی ورما کے یہاں تک مل جائے گی جو اس وقت مستند طریقہ پر صف اوّل میں ہیں اس لیے اردو شاعری میں اور پنجابی شاعری میں بہت زیادہ فرق نظر نہیں آئے گا۔ میں آپ سے عرض کر رہا تھا کہ غزل کی مقبولیت جس طرح فارسی کے میدان سے اردو کے میدان میں آئی اسی طرح اردو کے میدان سے نکل کر وہ پنجابی اور ہندی میں بھی پہنچ گئی۔ جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں بہت پڑھے لکھے اور عالم اور ادیب ہیں۔ وہ شاید اپنے اپنے طریقوں پر اگر کوشش بھی کریں کہ غزل کو بدل کر نظم کی جگہ کر دیں تو وہ لکھنؤ کے اکّے اور تانگے والوں کے وہ گیت نہیں چھڑا سکتے کہ "گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے" یہ شعر آج بھی گائے جاتے ہیں اور آئندہ دو تین نسلوں تک بھی ضرور گائے جائیں گے۔ میں مستقبل کے متعلق اس سے زیادہ قیاس آرائی نہیں کر سکتا۔

غزل میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان میں ایک تو یہ کہ غیر مردّف غزلیں رائج ہوئیں اور اس کے علاوہ غزل کے اسلوب بیان کو بھی بدلا گیا۔ اگر آج یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس میں ایٹم اور جیٹ کو لانا ہوگا تو وہ تو وقتاً فوقتاً اردو کے شاعر لائے۔ انھوں نے اپنی زبان میں ہندی الفاظ کو بھی جگہ دی اور اقبال جیسے شاعر نے بھی انھیں اپنایا کہ جس پر عام طور سے اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کے یہاں فارسی اور عربی کے الفاظ بہت زیادہ ہیں۔ آج نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پاکستان میں بھی جس طرح سے ہندی الفاظ اردو شاعری اور اردو غزل میں جگہ پا رہے ہیں۔ اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ غزل کی مقبولیت نظم کی وجہ سے کم نہیں ہوئی ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے بھی جن کے میں سمجھتا ہوں کہ دو طبقے ہیں ایک وہ کہ جنھوں نے پرانی روایات سے آزاد ہو کر اپنی شاعری کی اور ایک وہ کہ جنھوں نے اسلوب بیان غزل کا رکھا، اس میں چاہے گزشتہ وقت کے مقابلے میں خیالات مختلف رکھے یا روایاتی خیالات انھوں نے نہیں پیش کیے لیکن انھوں نے ڈھانچا اس کا غزل کا ہی رکھا ہے اور جہاں تک عوام کا تعلق ہے جس کا اندازہ کہ میں مشاعروں سے کر سکتا ہوں۔ مشاعروں میں کہ جہاں ادیب نہیں ہوتے، عالم نہیں ہوتے مگر عوام ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اردو زبان لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ لیکن اردو کو سننا پسند کرتے ہیں۔ اردو الفاظ سے اور اس کی شاعری سے ان کے کان مانوس ہیں اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر وہی بات ایک آزاد نظم کے اندر کہی جائے اور وہی بات اگر غزل کے اسلوب میں کہی جائے تو غزل کا اثر ان کے اوپر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ مشین کی ترقی کے ساتھ شاعری کا زوال ہوگا۔ یہ لازمی ہے کہ جب انسان مشین بن جائے گا تو اس کے

اندر جذبات لطیف نہیں رہیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعری کا زوال ہوگا اور شاعری کے ساتھ غزل کا زوال ہو لیکن جب تک شاعری زندہ ہے جب تک ہمارے یہاں جذبات اور احساسات کی قدر ہے اس وقت تک غزل کی مقبولیت کم نہیں ہو سکتی۔ غزل کی مقبولیت اس وقت کے ادیبوں اور عالموں میں چاہے کم ہو جائے، جن کی نظر حال کے مقابلے میں بعض اوقات مستقبل پر زیادہ رہتی ہے اور ہمارے اس ملک میں جس میں صرف تیئس [۲۳] فی صدی لوگ پڑھے لکھے ہیں ان میں جو غزل کی مقبولیت خاص طور سے شمالی ہندوستان میں ہے، میں جانتا ہوں وہ کم نہیں ہو سکتی اور میں چاہتا ہوں کہ وہ کم نہ ہو۔ اس میں بے شک نئے رجحانات کے لیے گنجائش ہو۔ نئے خیالات کے لیے اس کے اندر گنجائش ہو، نئی باتیں کہنے کے لیے اسلوب ہوں، اس کے اندر نئے حالات کا جو تقاضا ہو وہ بھی پورا کیا جائے اور ضرور کیا جائے لیکن آپ اس کا ڈھانچا نہ بدلیے۔ اس کا ڈھانچا بڑی محنتوں سے تیار ہوا ہے اس کو قائم رکھیے، اس سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں اگر آپ نے اس ڈھانچے کو قائم رکھا تو شاید شمالی ہندوستان کے علاوہ ہندوستان کے اور بھی علاقوں تک غزل کی مقبولیت اسی طرح رہے گی۔ مجھے مدراس میں بھی مشاعروں کی صدارت کرنے کا اتفاق ہوا ہے جہاں پر عام طور سے سمجھتے ہیں کہ اردو کا کوئی مرکز نہیں لیکن وہاں بھی میں نے دیکھا کہ جس طرح یہاں اجتماع ہوتے ہیں وہاں بھی اسی طرح کے اجتماع ہوتے ہیں۔ اگر اُردو کے متعلق آپ کا یہ خیال ہے کہ اُردو کو قائم رکھنا ہے، اس کی بقا کو قائم رکھنا ہے تو ضرور اس کے لیے نثر میں کوشش کیجیے، اچھی چیزیں لکھیے، ترجمے کیجیے، سائنس کی چیزیں لائیے، سیاسیات کی لائیے۔ ترقی پسند ادب ہو۔ لیکن ایک بات ضرور یاد رکھیے کہ عوام میں اگر اس کو مقبول رکھنا ہے تو غزل کو نہ چھوڑیئے، غزل اُردو کی ترویج کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، خدا کے لیے اس کو قائم رکھیے۔

---

## ڈاکٹر عبد العلیم



اس سمپوزیم میں تحریری مقالے بھی پڑھے گئے اور تقریریں بھی ہوئیں اور میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں نے رائے قائم کر لی ہوگی کہ غزل کا مستقبل کیا ہے۔ میں تو بہت غور سے سنتا رہا۔ لیکن ابھی تک کوئی رائے قائم نہیں کر سکا اور شاید مقصد بھی یہ نہیں تھا اس سمپوزیم کا کہ کوئی رائے قائم کی جائے۔ یہ تو گویا شعر گفتن کے لیے ایک موقع فراہم کیا تھا مکتبہ جامعہ نے۔ شاید اس سمپوزیم کو کتاب کی شکل میں شائع کرکے فائدہ اٹھانا مقصود ہو مکتبہ کا۔ مجھے نہیں معلوم، اگر ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مجھے جو دشواری بہت دنوں سے محسوس ہو رہی ہے اور آج کی بحث کے بعد اور زیادہ محسوس ہونے لگی ہے وہ مبہم اصطلاحوں کی وجہ سے ہے۔ جب ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن کا مفہوم واضح نہیں ہوتا تو ان سے ایک الجھن پیدا ہوتی ہے اور اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ وضاحت کم سے کم اصطلاحوں کی حد تک ضرور ہو جائے بغیر اس کے بحث کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارے فن تنقید کی بالخصوص یہ عجیب مصیبت رہی ہے کہ اس میں ادبی اصطلاحوں کا اور بالخصوص شعری اصطلاحوں کا ایسا حال ہے کہ ان میں وضاحت ابتک ہوتی ہی نہیں شاید آپ لوگوں کو تعجب ہو کہ کتنے دن سے تنقید نگار لکھتے چلے آئے ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں کو ملالیا جائے تو بھی غزل کی جتنی عمر بتائی گئی ہے آٹھ سو برس کی اتنی ہی قریب قریب نقد کی بھی عمر ہوگی۔ لیکن یہ کیا وجہ ہے کہ اصطلاحیں واضح نہیں ہوئیں۔ مثال کے طور پر اس لفظ غزل کو لے لیجیے آپ لوگوں کو غالباً معلوم ہوگا کہ یہ غزل کا لفظ شروع میں ایک موضوع کے لیے استعمال ہوا تھا ایک مفہوم کے لیے استعمال ہوا تھا زمانے کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نے اس کو ایک اسلوب یا ہیئت بنادیا اب مصیبت یہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں تو دو اصطلاحیں ہیں ایک نظم ایک نثر۔ ہمارے یہاں تین اصطلاحیں استعمال کرنی پڑیں گی یعنی نثر، نظم، اور غزل۔ اس لیے کہ نظم تو ہے نہیں غزل۔ ابھی آپ نے سن لیا کہ غزل کا مستقبل نہیں ہے نظم کا ہے۔ تو غزل نظم تو ہے ہی نہیں؛ پھر خدا جانے کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ غزل ایک ہیئت ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ جب غزل کی تعریف کرنا شروع کرتے ہیں تو اس کے موضوع کی اس کی معنویت کی۔ اس کے گداز کی تعریف کرتے ہیں۔ تو بھائی سوز و گداز کی خاص ہیئت پر منحصر نہیں ہے سوز و گداز

نظم کی ہر ہیئت میں پیدا ہو سکتا ہے اگر غزل کی یہ تعریف ہے کہ غزل ایک ایسی نظم ہے جس میں ردیف اور قافیے کی پابندی لازمی ہے تو ابھی آپ نے سُنا کہ ردیف کی پابندی کم ہو گئی ہے اور ضروری نہیں ہے بہرحال قافیے کی پابندی لازمی ہے اور یہ کہ اس میں مطلع اور مقطع ہو۔ شاید اب وہ بھی لازمی نہیں رہا ہے بہرحال کوئی ایسی تعریف کیجیے غزل کی جو منطقی اعتبار سے اس کو محدود کر دے۔ تب اس کے بعد بحث کیجیے کہ اس کا مستقبل ہے یا نہیں ہے۔ ابھی سجّاد ظہیر صاحب نے بہت طویل تمہید کے بعد گریز کر کے بالکل دوسری بات کہہ دی۔ شروع میں تو غزل کی قصیدہ خوانی کی اور اس کے بعد یہ کہا۔ اب غزل کا مستقبل نہیں ہے میں بڑے غور سے سُن رہا تھا جو کچھ میں نے اندازہ کیا وہ یہ ہے کہ انھوں نے جو غزل کی تعریف کی ہے وہ دراصل شعر کی تعریف ہے۔ غزل تو شعروں کا ایک مجموعہ ہے۔ جس میں مختلف خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار کیا جاتا ہے جن میں کوئی وحدت نہیں ہوتی۔ پھر بحیثیت مجموعی اس کی تعریف کیسے کی جا سکتی ہے؟ اگر غزل کو اس کے اصلی معنی میں آپ لیتے ہیں تو اس کو محدود کرنا پڑے گا۔ اس میں فلسفہ، سائنس، جنس اور ایٹم نہیں آ سکتے۔ تو دقّت ساری جو مجھے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ بحث ہو کیسے؟ آدمی اصطلاح دوسری استعمال کرتا ہے لفظ دوسرا استعمال کرتا ہے بات دوسری کہتا ہے۔ اس کے مفہوم کو برابر وسیع کرتا چلا جاتا ہے۔ آگے پھیلا دیتا ہے۔ نیچے اوپر چاروں طرف کائنات کی طرح وسیع کر دیتا ہے غزل کے مفہوم کو جیسے غزل کائنات ہے ساری! خلاصۂ کائنات نہیں۔ بلکہ پوری کائنات ہے تو ظاہر ہے پھر اس کا مستقبل بہت ہی شاندار ہے اس لیے کہ کائنات کو تو کوئی نہیں کہتا کہ ختم ہو جائے گی۔ لیکن غزل اگر کوئی محدود شے ہے اور اس کی تعریف ہو سکتی ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر شعر میں ایک نئے معنے پیدا ہوں اور معنی آفرینی کا گویا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو بات کہی جائے یہی نہیں کہ مسلسل نہ ہو یعنی یہ کہ ایک شعر میں مکمل ہو جائے بلکہ وہ موڈ وہ کیفیت بھی دوسرے شعر میں نہ ہو۔ اگر ایک ہی بات کو وہ ہر پہلو سے مختلف قافیوں میں باندھتا چلا جائے تو پھر شاعر کا کمال کیا۔ معنی آفرینی تو یہ ہے کہ ہر شعر اپنی ایک الگ دنیا رکھتا ہو۔ ابھی سرور صاحب نے کہا کہ غزل مینا کاری ہے مینا کاری تو بہت اچھی چیز ہے۔ لیکن مینا کاری کا بھی ایک چوکھٹا ہوتا ہے مینا کاری کا بھی ایک پس منظر ہوتا ہے۔ مینا کاری یہ نہیں ہے کہ نگینے آپ نے یوں ہی بکھیر دیے۔ کاغذ پر یا فرش پر پھیلا دیا انھیں تو یہ مینا کاری نہیں ہے۔ مینا کاری کے لیے ایک . . . . SETTING ہوتی ہے تو غزل میں وہ SETTING کہاں ہوتی ہے۔ حافظ کی چند غزلوں کو

چھوڑ دیجیے ان کے یہاں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک غزل ایک ہی موڈ میں کہی گئی ہے ممکن ہے بعد کے غزل گو شعرا، اس کو اچھا نہ سمجھتے ہوں وہ سمجھتے ہوں کہ اس میں نظم کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس لیے کہ ایک ہی بات کہی گئی ہے مسلسل۔ آج کل جو غزل کے بہت سے نئے حامی پیدا ہو گئے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ غزل میں ایک موڈ ہونا چاہیے۔ بھئی غزل میں ایک موڈ ہونا چاہیے تو اس میں اور نظم میں کیا فرق ہے۔ اس کو پھر نظم کیوں نہیں کہتے یا تو آپ یہ کہیے کہ نظم کے لیے کچھ موضوع ایسے ہیں انھیں پر نظم کہی جائے گی اور باقی جو موضوع ہیں ان پر غزل کہی جائے گی۔ ابھی تغزل کا ذکر آیا ہے اور تغزل بھی عجیب اصطلاح ہو گئی ہے ابھی محمد حسن صاحب نے کہا کہ تغزل ختم نہیں ہوگا۔ غزل ختم ہو جائے گی۔ بھئی غزل اور تغزل کو ہم تو یہ سمجھتے تھے، کیوں کہ عربی بد قسمتی سے پڑھ لی ہے ہم نے۔ کہ ایک ہی مادّے سے نکلے ہوئے دو لفظ ہیں۔ اب یہ دو الگ الگ چیزیں کیا ہو گئیں۔ پرانے یونانی طریقے سے اگر شاعری کو تقسیم کیجیے تو غنائی، رزمیہ اور ڈرامائی شاعری کی اصطلاحیں تھیں۔ ہمارے یہاں عربی، فارسی کی ابتدائی زمانے کی تقسیم کو لیجیے تو مدح تھی، ہجو تھی، نسیب تھا۔ صرف فارم کے لحاظ سے قصیدہ، مثنوی، مثلث، رباعی، مخمس، مسدس یہ تقسیمیں تھیں۔ یہ تقسیم غزل اور نظم والی جو آج پیدا ہو گئی ہے یہ تو کبھی نہ تھی۔ بہرحال آپ یہ سوچیے کہ دنیا کی تاریخ میں ادب عالیہ کا جس کو نام دیا جاتا ہے اس میں غزل کی قسم کی شاعری کو کسی اور زبان میں اعلیٰ پیمانے کی شاعری تسلیم کیا گیا ہے؟ یونانی میں، لاطینی میں، عربی میں، انگریزی میں، فرانسیسی میں، کسی ادب میں لیجیے۔ اس قسم کی شاعری جس میں ایک شعر متاع کائنات و متاع حیات ہو۔ دو مصرعوں کے کوزے میں دریا یا سمندر کو بند کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس کو کسی نے بڑی شاعری کہا ہے؟ اگر یہ بھی آپ کہتے کہ غزل میں ایک موضوع ہونا چاہیے، ایک مرکزی خیال ہونا چاہیے ایک موڈ ہونا چاہیے۔ تب بھی ہم مان لیتے کہ صاحب آپ کا مقصد یہ ہے کہ لمبی لمبی نظمیں کہنے کے بجائے ۵ شعر ۹ شعر کی جو غزل ہے اس میں ایک بات کہہ دی جائے۔ مکمل ایک موڈ جو شاعر کا ہو، ایک جذبہ اور احساس پوری طرح سے ادا کر دیا جائے تب بھی ہم مان لیتے کہ اس مختصر پیمانے میں بڑے معیار کی شاعری ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک شعر میں شاعری ہو اور بہت سے ایسے شعر جوڑ دیے جائیں، جن میں نہ تو جذبات و احساسات کا ربط ہو نہ کوئی منطقی ربط ہو! اور ربط کاہے کو ہو صاحب ایک قافیہ ہے اٹکل ایک قافیہ ہے ٹپکل کہیں سے بھی قافیہ لے لیا۔ محض صوتی اعتبار سے، آپ یہ بھی نہیں کرتے کہ قافیے وہ لیے جو کم سے کم ایک موڈ کے ماتحت تو ہوں۔ کسی جذبے کسی احساس کے ماتحت تو ہوں بلکہ جتنے قافیے آ جائیں سب کو باندھنا ضروری ہے اگر نہ باندھے گا

تو شاعر کیا اور ایک غزل میں سارے قافیے ختم نہ ہوئے تو دو غزلہ لکھے گا سہ غزلہ لکھے گا۔ گویا لغت کی کتاب میں جتنے قافیے موجود ہیں ان میں سے کوئی رہنے نہ پائے۔ اور اس قافیہ پیمائی کو غزل کا نام دیا جاتا ہے اور اس کو مستقبل کی شاعری کہا جاتا ہے۔ یہ پریشان خیالی اور ریزے ریزے کر کے اپنے احساسات اور جذبات کو بیان کرنا تاریخی حالات کا نتیجہ ہے۔ اس کو سب لوگوں نے کم و بیش تسلیم کیا ہے۔ کچھ لوگ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تاریخی حالات ابدی طور پر قائم رہیں گے اس لیے غزل کی یہ کیفیت بھی قائم رہے گی۔ یہ فارم شاعری کا قائم رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ قائم رہے اس لیے کہ ہمارے ملک میں ابھی بہت دنوں تک اس کا امکان کم معلوم ہوتا ہے کہ یہ افراتفری ختم ہو اور انسان اپنے جذبات اور احساسات کو منظم کر سکے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ ہم اس طرح کی ریزہ خیالی کو بہت دنوں تک نوازتے رہیں کبھی کوئی جذبہ پیدا ہو گیا۔ سوتے میں جاگتے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ کہاں کہاں بیٹھ کر غزلیں کہی گئی ہیں، کہیں کسی طرح سے خیال پیدا ہو جائے اور غزل کہہ دی جائے تو اس کا بہت امکان ہے کہ ایسا ممکن ہو لیکن جب آپ یہ سوال کرتے ہیں کہ غزل مستقبل کی شاعری ہے یا نہیں ہے تو غالباً آپ کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ غزل کے چوکھٹے میں رہ کر اعلیٰ درجے کی شاعری کرنے کے لیے امکانات ہیں یا نہیں ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس کے امکانات بہت کم ہیں۔ غزل کا اصلی اور بنیادی موضوع یعنی حسن و عشق کی داستان تو ابدی موضوع ہے۔ حسن و عشق کا ذکر میں وسیع ترین معنی میں کر رہا ہوں۔ اس میں کائنات کا حسن اور افلاطونی عشق کو بھی شامل کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر تو ہمیشہ شاعری ہوئی ہے اور ہمیشہ ہو گی لیکن غزل کی یہ ہیئت جس میں غیر مرتب، غیر منظم، پریشان خیالات کو ایک میکانکی قافیے کے چوکھٹے میں جڑنے کی کوشش کی جاتی ہے مستقبل کا فارم نہیں ہے۔

---

سکندر علی وجد

# نقش و نگار

چند کیڑوں نے ریگِ ساحل پر
حیرت افزا مراسلے لکھے
کیسی اچھی کشیدہ کاری کی
کیا انوکھے خیال پیش کیے
جوش بیں کر کے خامہ فرسائی
حل طلب مسئلے بکھیر دیئے
خوش نما ہے زمین کا دامن
فکر انگیز بیل بوٹوں سے
دل نشین شاہکارِ حسنِ عمل
دیکھیے لاکھ بار جی نہ بھرے
شکل کوئی یہاں نہیں بے جا
کچھ تو معنی ہیں ان لکیروں کے
فرصتِ یک نظر بہ خطِّ غبار
قلب دریا کے راز کون پڑھے
موج آئی طلسم ٹوٹ گیا
سارے نقش و نگار ڈوب گئے

حسنِ فطرت یہ چاہتا ہے، کوئی
دیر تک اس کی تاک میں نہ رہے

## شرابِ کہنہ

# رندؔ

۱۷۷۹ء ——————— ۱۸۵۷ء

سید محمد خاں رندؔ، ان کے والد غیاث محمد خاں، نواب سعادت خاں برہان الملک صوبہ دار اودھ کے حقیقی بھانجے تھے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں فیض آباد میں پیدا ہوئے، نواب شجاع الدولہ کی زوجہ عالیہ امۃ الزہرا عرف بہو بیگم کی زیرِ نگرانی شاہی محل میں بڑے ناز و نعم کے ساتھ پرورش پائی۔ ستائیس اٹھائیس سال تک فیض آباد میں رہے۔ وفاؔ تخلص کرتے تھے، میر مستحسن خلیقؔ (میر انیسؔ کے پدر بزرگوار) سے اصلاح لیتے تھے۔ ایک دیوان بھی مرتب کر لیا تھا۔ بہو بیگم کے انتقال اور میر خلیقؔ کے فرخ آباد چلے جانے کے بعد یہ بھی لکھنؤ آ گئے۔ یہاں کے ہر گلی کوچے میں شعر و سخن کا چرچا تھا اور ہر ایک شعر و شاعری کا متوالا بنا ہوا تھا۔ آتشؔ کا طوطی بول رہا تھا یہ بھی ان کے شاگردوں کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ وفاؔ کو چھوڑا اور رندؔ بن گئے۔ استاد نے جوہرِ قابل سمجھ کر ان کی صلاحیتوں کو جلا دی اور شاگرد نے بھی استاد کے نام کو روشن کیا۔

اپنی رنگین مزاجی اور رند مشربی کے باعث لکھنؤ میں اس دور کی ہر رنگینی اور مزے داریوں سے بھی خاطر خواہ لطف اندوز ہوتے رہے۔ استاد کی وفات کے بعد ہی مے نوشی ترک کر دی اور پھر دوسری دل چسپیوں سے بھی کنارہ کش ہو گئے۔ غدر سے کچھ دنوں پہلے حج کے ارادے سے نکلے تھے کہ بمبئی پہنچ کر سفرِ آخرت اختیار کرنا پڑا۔

دو دیوان رندؔ کی یادگار ہیں۔ پہلا گلدستۂ عشق (جو ۱۸۴۳ء میں مرتب ہوا تھا) دوسرا ایک نامکمل دیوان جو ان کے مرنے کے بعد شایع ہوا۔

آسان، شستہ اور بامحاورہ زبان، مہذب الفاظ اور دل کش انداز میں واردات اور آپ بیتیاں، کہیں درد و غم کی چاشنی اور کہیں تصوف و اخلاق کے مضامین۔ یہ ہیں کلامِ رندؔ کی خوبیاں اور صفتیں۔

# انتخاب

ہوگیا آبِ دمِ تیغ سے بسمل ٹھنڈا
کیوں ہوا اب تو کلیجا ترا قاتل ٹھنڈا

نازِ بے جا اٹھائے کس کے
اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا

بن پڑا کچھ نہ علاجِ تپِ فرقت اس سے
ہاتھ مل کر مری بالیں سے مسیحا اٹھا

کوہ فرہاد سے، مجنوں سے بیاباں جیتا
وحشتِ دل ترے اقبال سے میداں جیتا

کھلی ہے کنجِ قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

اداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
بہت دنوں میں ہوا ہے مزاج داں صیاد

پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لے کے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد

اگری کا ہے گماں، شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہو کر

تو بھی چل اپنے ذرا طالبِ دیدار کے پاس
سب عیادت کے لیے جاتے ہیں بیمار کے پاس

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

پھر وہی کنجِ قفس ہے، وہی صیاد کا گھر
چار دن اور ہوا باغ کی کھا لے بلبل

ہو کے بیزار عبث گھر کو نہ جاؤ آؤ
تھوڑے سے رنج کو اتنا نہ بڑھاؤ آؤ

دل نہیں دیتا میں اس بات پہ آزردہ ہو
روٹھے جاتے ہو اسی بات پہ آؤ آؤ

سیر کی خوب، پھرے، پھول چنے، شاد رہے
باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

دل سینے میں بے تاب ہے، جاں آئی ہے لب پر
اب جان کو روکے کوئی یا دل کو سنبھالے

او دل ہدف تیر نگہ پھر کیا تو نے
اگلے ہی مرے زخم جگر کے تھے ابھی آ... نہ

آنکھیں تری مدہوش ہیں، ننھا سا مرا دل
مستو نہ سنبھلیں گے، اکیلے کے سنبھالے

بت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

پاس دیں کفر میں رہا ملحوظ
بت کو پوجا، خدا خدا کر کے

بس اب آپ تشریف لے جائیے
جو گزرے گی مجھ پر گزر جائے گی

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

# نئی مطبوعات

خالی مکان (شعری مجموعہ) محمد علوی -/۴ ناشر: مکتبہ سوغات، بنگلور

طلعات انور ( 〃 ) سردار انور خاں -/۹ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۲

ادب اور نفسیات (ادب) دیویندر اسر ۳/۵۰ ناشر: مکتبہ شاہراہ، دہلی ۶

فکر اور ادب ( 〃 ) 〃 ۳/۵۰ 〃 〃 〃 〃

پھول اور سموم (ناول) برونو آپٹز مترجمہ ضیہ سجاد ظہیر ۵/۵ ناشر: نئی روشنی پرکاش، نئی دہلی ۵

اردوئے معلّیٰ (میر سوز نمبر) مرتبہ خواجہ احمد فاروقی -/۷ 〃 دہلی یونیورسٹی، دہلی

معاون اردو (تعلیم) ممتاز الرشید منہاس -/۵۰ 〃 کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی ۶

علم قافیہ ( 〃 ) 〃 〃 -/۳۱ 〃 〃 〃 〃

نشاطِ روح (اقوال) عبدالسلام -/۵۰ 〃 〃 〃 〃

کشکول باطن، دوم (سبق آموز واقعے) مولانا عبدالباطن ۱/۱۲ 〃 〃 〃 〃

شکنتلا (نظم) منور لکھنوی -/۶ 〃 آدرش کتاب گھر، دہلی

سہرے کے پھول (نظم) عادل رشید -/۵ 〃 پنجابی پستک بھنڈار، دہلی

دردکی نہر ( 〃 ) 〃 ۳/۵۰ 〃 〃 〃

بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات شانتی رنجن بھٹاچاریہ -/۵ E/۱/۲ اشوک نگر، کلکتہ

خطوطِ غالب (خطوط) مالک رام ۷/۵۰ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

صحیفۂ خوشنویسیاں مولوی احترام الدین شاغل -/۶ 〃 〃 〃

سیاسی نظریے: افلاطون اور ارسطو ضیاء الحسن فاروقی -/۴ قومی کتاب گھر، دیوبند

پتھر کا دیس (ناول) عادل رشید ۴/۵۰ الماس بکڈپو، لکھنؤ

سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری ابوالحسن ندوی -/۶ مکتبۂ اسلام، لکھنؤ

مفہوم القرآن (تیسویں پارے کا منظوم ترجمہ) ترجمہ نثر شاہ عبدالقادر، -/۳ معراج پبلیکیشن، بنارس

فنکار (نظم) معصوم شیر کوٹی -/۳ نظم کیف بھوپالی } معصوم شیر کوٹی، تبیا

ورق ورق (تراجم داخلہ) زیر طبع انصاری ۲/۵۰

لکھنؤ کی پانچ راتیں (مضامین) سردار جعفری ۲/۷۵ } بمبئی میں ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## گنجہائے گرانمایہ

سن اشاعت اکتوبر ۱۹۶۲ء

از: رشید احمد صدیقی

صفحات: ۳۰۲ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

قیمت: چار روپے

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

علم و ادب کی دنیا میں جناب رشید احمد صدیقی صاحب کا نام اور ان کے کام دونوں نہایت بلند اور وقیع سمجھے جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ ان کو اس حیثیت سے جانتے ہیں کہ انھوں نے اک خاص انداز کے بہت سے معیاری، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھ کر اردو زبان کے دامن کو وسیع اور شگفتہ تر کیا ہے۔ "مضامین رشید" اور "خنداں" اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ گنجہائے گرانمایہ اس لحاظ سے ایک مختلف کتاب ہے، اس میں سماج یا فرد کی دکھتی رگوں کو چھیڑ کر اصلاح یا لطف و مزاح کا سامان نہیں فراہم کیا گیا ہے بلکہ اس مجموعے میں ملک و قوم کی بعض سربرآوردہ اور قابل احترام شخصیتوں کی وفات کے بعد ان کی سیرت و شخصیت پر اس انداز سے نظر ڈالی گئی ہے کہ مرنے والے کی عظمت و اہمیت کا احساس فزوں تر ہو جاتا ہے۔ ان مقبول و معروف ہستیوں میں میدان سیاست کے شہسوار ہیں۔ دین و مذہب کے علم بردار ہیں، علم و ادب کے پرستار ہیں۔ شعر و سخن کے خدمت گزار ہیں اور دو ایک ایسے افراد بھی جو اپنے بہترین خصائل انسانی کی بنیاد پر حرمت و عزت کے حق دار۔ غرض فہرست کا ہر فرد لکھنے والے کا ممدوح ہے۔ مگر تحریر میں عام روایتی مدح سرائی کا شائبہ تک نہیں۔ اوصاف و اقدار کی وضاحت میں نہ افراط و تفریط ہے اور نہ کسی سے مقابلہ و موازنہ۔ رنج و ملال کے اظہار میں بھی ضبط و توازن اور متانت تحریر کسی جگہ بھی قلم کی گرفت سے باہر نہیں ہونے پائی ہے، اس طرح کی باتیں اور اسلوب نگارش نہ تو سیرت و تاریخ کی کتابوں میں ملے گا اور نہ وقائع نگاروں اور تذکرہ نویسوں کی تحریروں میں۔

انھیں اسباب و خصوصیات کی بنا پر ضروری تھا کہ گنجہائے گراں مایہ کا دوسرا اڈیشن مع اضافے کے ہمارے سامنے آئے تاکہ ان کے مطالعے سے ادب و انشا کا ہر شائق مستفید ہو۔ مزید براں اس

کتاب کو دیکھ کر یہ احساس اور اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ناخوشگوار حالات کے باوجود ہمارے یہاں بامقصد اور کارآمد کتابوں کے لکھنے والے موجود ہیں اور ان کو اہتمام اور سلیقے کے ساتھ چھاپنے والے بھی۔

(رشید نعمانی)



## فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: سید ضمیر حسن دہلوی

صفحات: ۱۷۰ سائز ۲۰×۳۰/۱۶

قیمت: تین روپے

ناشر: حسن بکڈپو۔ پہاڑی بھوجلہ۔ دہلی

ہمارے ناقدین کی کچھ شروع ہی سے یہ روش رہی ہے کہ انھوں نے میر کے مقابلہ میں سودا کو انشا کے مقابلہ میں مصحفی کو اور غالب کے مقابلہ میں نہ صرف ذوق بلکہ مومن جیسے شاعر کو بھی نظرانداز کر دیا ہے میر کی عظمت انشا کی قادرالکلامی اور غالب کی فن کاری اپنی جگہ مسلم لیکن اس کا مطلب یہ کب ہے کہ سودا مصحفی، ذوق اور مومن میں کچھ نہیں رکھا یا یہ کہ ان کی شاعری ہمارا ادبی سرمایہ نہیں ہے۔ سید ضمیر حسن کی کتاب "فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ" اصل میں برس ہا برس کی اسی روایت کے خلاف ایک باغیانہ قدم ہے لیکن یہ قدم صحت مند ہے۔ یہ کتاب لکھ کر انھوں نے ادبی روایت پرستی کا ایک بہت بڑا بُت توڑا ہے اس مستحسن کام کے لیے وہ لائق مبارک باد ہیں۔ ہماری اس غلط قسم کی روایت کا شکار نہ صرف شاعر بلکہ نثر نگار بھی ہوئے ہیں چناں چہ جب میر امن نے "باغ و بہار" لکھی تو اس کو حرفِ آخر سمجھ لیا گیا اور قسام ادب نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اس کے بعد کوئی لائق تحسین نثر نہیں لکھی جا سکتی یہی وجہ ہے کہ رجب علی بیگ سرور کی تصنیف "فسانہ عجائب" کو آج تک رد کیا جا تا رہا ہے۔ اگر فصاحت اور روزمرہ دہلی والوں کا طرۂ امتیاز ہے تو بلاغت اور عبادت آفرینی لکھنؤ والوں کا مایۂ ناز ہے اس لیے دونوں میں سے کسی کو بھی ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ اگر میر کی سادگی نے اردو کو کچھ دیا ہے تو ناسخ کی پرکاری کا بھی اردو زبان پر بہت بڑا احسان ہے۔ اگر میر حسن کی مثنوی "سحرالبیان" لکھنوی تہذیب و معاشرت کا ایک منظوم مرقع ہے تو یقیناً رجب علی بیگ سرور کی کتاب "فسانہ عجائب" بھی انہی حقائق کی ایک نثری دستاویز ہے۔ "فسانہ عجائب" اردو نثر کی شاہراہ میں ایک سنگ میل ہے یہ مقفّٰی اور مسجع نثر بھی ہے اور ایک مخصوص سماج کی آئینہ دار بھی ——— اردو کی کلاسیکی اور جدید سینکڑوں کتابوں کا نچوڑ ضمیر صاحب کے تنقیدی شعور کے ساتھ رچ کر زیر بحث کتاب کی

شکل میں ہمارے سامنے نمودار ہوا ہے۔ انھوں نے سرورؔ کی نثر کے تمام پہلوؤں پر انتہائی جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تحریر میں زورِ قلم، مطالعہ اور ذہانت کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ نصابی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ کتاب طلبہ کے لیے کافی مفید ثابت ہوگی۔

اسلم پرویز



## صبحِ بنارس

مرتبہ: عشرت کرتپوری
صفحات: ۱۲۸ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد
قیمت: دو روپے ۵۰ نئے پیسے
ناشر: اردو رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، دہلی

بنارس جسے قدیم تاریخی زمانے کا نام ڈھونڈکر اب وارانسی کہا جاتا ہے گیتا میں کاشی کے نام سے آیا ہے اردو میں صبحِ بنارس ضرب المثل ہے کیوں کہ سورج کی پہلی کرن پھوٹتی ہے اور بنارس کے معبدوں کے سنہرے کلس جگمگاتے ہیں اور پھر گنگا کے پانی میں نور پیدا ہوتا ہے اور سفید مندر دلِ عابد کی طرح شفاف نظر آتے ہیں تو یہ کیفیت دل میں گھر کر جاتی ہے۔

جناب عشرت کرتپوری نے جو اس دورِ خودنمائی میں ادب کے ایک خاموش خادم ہیں "صبحِ بنارس" کے نام سے ایک مجموعہ ترتیب دیا ہے جس میں بنارس کے متعلق فارسی اور اردو کی نظمیں بڑی تلاش سے جمع کی ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ بھی بڑی کاوش سے لکھا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی نظموں کے بعد اگر کسی کے دل میں یہ وہم رہ گیا ہے کہ اردو میں مقامی رنگ نہیں ہے تو وہ اس مجموعے کے مطالعہ سے دور ہو جائے گا۔

دیباچہ میں زمانہ قبل از تاریخ کی بھی ضروریات کا ذکر ہے جن کے متعلق آسانی سے دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ کیوں کہ ہندوؤں کی دیو مالا صدیوں سے متنازعہ رہی ہے لیکن اصل چیز جو قابلِ داد ہے مولف کی تلاش و کاوش ہے۔ یہ کتاب اردو ادب میں نہایت قابلِ قدر اضافہ ہے جناب عشرت کرتپوری بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ

تمتع زہر گوشۂ یافتم
زہر خرمنے خوشۂ یافتم

لیکن اس خوشہ یابی کے لیے بہت سلیقہ اور پتّہ ماری کی ضرورت ہے یہ ایسا کام نہیں کہ

کاتا اور لے دوڑے خود عشرت صاحب کی تحریر سے ظاہر ہے کہ سترہ سال کی کوشش کے بعد یہ کام سرانجام پایا ہے۔ ابھی چار روز قبل وہ فرما رہے تھے کہ انھیں اس مجموعہ کے مرتب کرنے کے بعد ایک شعر اور دستیاب ہوا ہے۔ وہ افسوس کر رہے تھے کہ پہلے یہ کیوں نہ معلوم ہوا۔ اللہ اللہ۔ ادبی کام ایسی ہی دھن سے ہو سکتا ہے ورنہ آبروئے شیوۂ اہل نظر تو بوالہوسوں کے اس جمگھٹ میں جا ہی رہی ہے۔ دوسرے شعر میں اکبر الٰہ آبادی کا بھی ایک شعر شامل کیا جا سکتا ہے۔ عشرت صاحب شام اودھ بھی مرتب کر رہے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ اپنی شام زندگی میں اپنے وطن مالوف کے متعلق یہ مجموعہ بھی دیکھ لوں۔

گوپی ناتھ امن

○

## قومی کتابیات (شعبۂ اردو) بابت ۱۹۶۱ء

صفحات: ۱۲۰
قیمت: ۶ روپے مجلد

شائع کردہ: سنٹرل ریفرنس لائبریری، وزارت سائنسی تحقیقات و ثقافتی امور، حکومت ہند

تاریخ اشاعت نومبر ۱۹۶۲ء

ہمارے ملک کے علم و ادب کی تاریخ میں ۱۹۵۴ء کا سال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اس سال ایک قانون بنا جو ترسیل کتب و جرائد ایکٹ ۱۹۵۴ DELIVERY OF BOOKS NEWSPAPERS ACT 1954 کہلاتا ہے۔ اس قانون کی رو سے جو چیز بھی ملک میں شائع ہوگی اس کا ایک ایک نسخہ ناشر کو ملک کی چار لائبریریوں میں جمع کرانا ضروری ہے۔ یہ لائبریریاں کلکتہ، مدراس، بمبئی اور دہلی میں ہیں۔ چناں چہ دہلی میں اس مقصد کے لیے پارلیمنٹ کی لائبریری مخصوص ہے۔

ان لائبریریوں میں سال بھر میں جو کتابیں موصول ہوتی ہیں ان کی ایک مکمل فہرست رومن رسم الخط میں شائع ہوتی ہے جس کا نام انڈین نیشنل ببلیوگرافی ہے۔ اس کتاب میں ہندوستان کی ان چودہ (۱۴) زبانوں کی کتابیں درج ہوتی ہیں جو دستور ہند میں تسلیم کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی قیمت پچاس روپے ہوتی ہے۔ چوں کہ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس کو نہ تو ہر شخص خرید سکتا ہے اور نہ اس کی ہر ایک کو ضرورت ہے۔ چناں چہ اس میں سے صرف اردو کتب کی ایک فہرست الگ شائع ہوتی ہے اس کا نام ہے "قومی کتابیات (شعبۂ اردو)"۔

زیر تبصرہ کتاب بابت ۱۹۶۱ء ہے۔ اس میں ہندوستان کی ان ساری مطبوعات

(سرکاری و غیر سرکاری) کے اندراجات درج ہیں جو ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی ہیں۔ یہ کتاب حصۂ مضامین (متن) اور ابجدی ترتیب (اشاریہ) پر مبنی دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصۂ مضامین میں تمام اندراجات کی ترتیب ڈیوی اعشاری نمبروں کے مطابق ہے۔ اس حصہ میں ہر کتاب کے متعلق تفصیلات حسب ذیل ترتیب کے مطابق درج ہیں۔ اعشاری نمبر، مصنف، کتاب کا پورا نام، مقام اشاعت، ناشر، سال طباعت، تعداد صفحات، نوعیتِ تصاویر، کتاب کا سائز، جلد کی نوعیت، قیمت اور سلسلہ کا نام۔

ہر کتاب کے اندراج کے بعد بائیں طرف کولن نمبر بھی دیے گئے ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں ایک تفصیلی اشاریہ (انڈکس) بھی شامل ہے۔

مندرجہ ذیل نوعیتوں کی تصانیف اس میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔

۱۔ علامات موسیقی ۲۔ نقشے ۳۔ رسائل واخبارات (سوائے کسی نئے رسالے کا پہلا شمارہ اور کسی رسالہ کا پہلا شمارہ نئے نام سے) ۴۔ نصابی کتابوں کی کلیدیں ومعاون شرحیں ۵۔ عارضی تصانیف مثلاً تجارتی فہرستیں، کمپنیوں کی مالی توضیحات، سستی ناولیں، اشتہاری پمفلٹیں۔

یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ اس سے پہلے دو جلدیں اور شائع ہو چکی ہیں۔ یعنی بابت ۱۹۵۸ء اور ۶۰-۱۹۵۹ء یکجا۔ یہ دونوں لیتھو میں چھپی تھیں۔ یہ کتابیں مصنفین، ناشرین، تعلیمی اداروں، کتب خانوں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے خاص طور پر مفید اور ضروری ہیں۔ اور ان سے اردو ادب کی سالانہ ترقی کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

حافظ نبی احمد
لائبریرین۔ جامعہ لائبریری

## اُردو شاعری کی روایات

مصنف: شارق ...۔ ایم۔ اے
صفحات: ۱۲۸ سائز: $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$
قیمت: دو روپے

ملنے کا پتہ: مرکز ادب۔ رحمانیہ کالج رگول (ہمیر پور)

اس کتاب میں ایک درجن مفید مضامین شامل ہیں۔ بعض مضامین انٹر اور بی۔ اے کے طلبا کی مدد کے لیے لکھے گئے ہیں جو یقیناً اس مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن "نیا ادب" اس سلسلۂ مضامین کی سب سے کمزور کڑی ہے جس سے شاید ہائی اسکول کے طلبا ہی استفادہ کر سکیں گے

ہمارے نزدیک سب سے اچھوتا اور مفید مضمون "ہماری شاعری کا جغرافیائی پس منظر" ہے۔ جس کی بیک گراونڈ اتر پردیش کی سرزمین ہے۔

اس مجموعے میں آلم مظفر نگری پر ایک مضمون شامل ہے جس کی شمولیت کا یہ موقع نہ تھا پھر مصنف نے جانب داری کے جذبے سے سرشار ہوکر قلم اٹھایا ہے۔ اندازہ کے لیے ایک مثال کافی ہے

"انھوں (آلم مظفر نگری نے) سیاسی اشاروں کو نہایت لطیف انداز میں نظم کیا ہے اس اعتبار سے اردو کا کوئی غزل گو ان کے مقابل نہیں"

اس دعوٰی کی سند میں جو اشعار پیش کیے ہیں وہ خود سرنگوں ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

| | |
|---|---|
| گلشن کی بجلیوں نے خود اپنے گھر کو پھونکا | اک رشتہ عارضی تھا میرا تو آشیاں سے |
| قفس میں ہم نوا اتنا تحمل بھی نہیں زیبا | رہا باقی نہ احساس پریشانی تو کیا ہوگا |
| وفا وں پر مری ایمان لے آئے چمن والے | ہے ذکر خیر اب تو آشیاں در آشیاں میرا |

اس کتاب میں سب سے زیادہ تفصیلی، معلوماتی اور مفید و ضروری مضمون "احسن مارہروی خطوط کے آئینے میں" ہے۔ اس میں مولانا احسن مارہروی کے فن مکتوب نویسی پر گفتگو ہے اور نہایت معقول ہے۔ لیکن بعض مقامات پر غالب کا ذکر اس انداز سے ہوا ہے کہ موازنہ کا شائبہ ہو سکتا ہے۔

مجموعے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ثقیل اصطلاحیں نہیں ہیں۔ سلجھے ہوئے خیالات کو صفائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس لیے طلبا اور قارئین کو اس کے مطالعہ سے یقیناً فیض پہنچنا چاہیے۔

سیفی پریمی

## منی کا تحفہ

(سن اشاعت جنوری ۶۳ء)

از: محمد شفیع الدین نیّر ایم۔ اے
صفحات: ۹۶ سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ایک روپیہ
ملنے کا پتہ: نیّر کتاب گھر۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شفیع الدین نیّر صاحب بچوں کی دنیا میں شاید سب سے زیادہ معروف و مقبول لوگوں میں ہیں۔ بچّوں کے لیے نظمیں اور شاعروں نے بھی لکھی ہیں بعض ان میں سے چوٹی کے شاعر ہیں اور ان کی نظمیں بھی بہت بلند پایہ ہیں مگر نیّر صاحب نے تو بس اسی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ اس بچکانہ شاعری سے انھیں غیر معمولی شغف ہے۔ لگ بھگ ۲۰ سال سے وہ اسی دھن میں مست اور اپنی اسی دھن اسی لگن اسی مستقل مزاجی نیز طبع سلیم، خوش مذاقی اور بچوں کی نفسیات سے گہری

واقفیت کی بدولت وہ اس میدان میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے جب ان نظموں کا پہلا مجموعہ بچوں کا تحفہ چھپا ہے تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور دیکھتے دیکھتے اس کے کئی ایڈیشن نکل گئے۔ بچوں اور بڑوں اور بعض ماہرین تعلیم نے انہیں بے حد پسند کیا۔ اور پھر اس کے بعد نیر صاحب کی کتابوں کے کئی مجموعے نکل چکے ہیں۔ نیر صاحب نے کچھ نظمیں ایسی بھی لکھی ہیں جو بڑوں کو انوکھی انوکھی ان مل بے جوڑ اور بے سر پیر کی نظر آتی ہیں مگر اس کے برعکس بچوں کے نوک زبان ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نیر صاحب اچھی طرح جان گئے ہیں کہ بچہ کیا چیز پسند کرتا ہے۔

زیر نظر کتاب سچ مچ چھوٹی بچیوں کے لیے بہت اچھا تحفہ ہے۔ کتاب میں کل ۴۰ نظمیں ہیں۔ انوکھے اور دل چسپ عنوان ہیں۔ سادہ اور چھوٹی بحریں ہیں۔ ہلکی پھلکی باتیں ہیں۔ ان باتوں میں مٹھاس ہے۔ محبت ہے۔ خلوص ہے اور ہنر مندی کا کمال یہ ہے کہ الفاظ بہت سادہ اور آسان ہیں پھر بھی نظموں میں بلا کی روانی ہے۔

محمد حسین حسانؔ

## شاہکار (ادبی ڈائجسٹ)

ایڈیٹر: محمود احمد ہنر

سائز $\frac{30 \times 20}{16}$

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ سالانہ دس روپے

پتہ: ممتاز باغ۔ لوکر گنج۔ الہ آباد ۳

اس ادبی ڈائجسٹ کا جنم جس سال ہوا اس کے اعتبار سے بہت سے شمارے منظر عام پر آجانے چاہیے تھے لیکن درمیان میں کئی بار طویل "علامتوں" کے باعث اب تک صرف ۱۳ شمارے نکل سکے۔ اس وقت آخری دو پرچے ہمارے سامنے ہیں۔ یہ بات بہر حال بہت مسرت افزا ہے کہ "شاہکار" کی نظر انتخاب بہت گہری اور وقیع ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج تک دوسرے اور تیسرے درجے کی تخلیقات کو اس کے صفحات پر بار نہیں ملنے پایا۔ ہمیں یقین ہے کہ "شاہکار" کا یہ معیار نہ صرف یہ کہ اسی طرح برقرار رہے گا۔ بلکہ بلند سے بلند تر ہوتا جائے گا۔

آخری شمارے میں ان تمام خوبیوں کے باوجود جو چیز ہماری سنجیدگی پر بار گزری وہ ہے کاتب صاحب کی جدت جو انھوں نے عنوانات کی کتابت میں دکھائی اور خاص طور پر حصہ نظم کو "مصور" بنانے میں صرف کی۔ "شمع" کی نقالی شاہکار کو ہرگز زیب نہیں دیتی اور ہمارا مشورہ ہے کہ وہ سادگی ہی میں پرکاری کے اصول کو اپنائے رکھیں۔

(ولی شاہ جہان پوری)

# ادبی خبریں

مرتبہ: ظل عباس عباسی

## انجمن تحقیقات اردو۔ دلّی یونیورسٹی

شعبۂ اردو۔ دلّی یونیورسٹی کی انجمن تحقیقات اردو کا چوتھا جلسہ مورخہ ۲ دسمبر ۶۳ء کی شام کو ساڑھے چھ بجے ہندی کے نامور ادیب اور پریم چند کے ہم عصر و ساتھی جناب جینندر کمار صاحب کی صدارت میں دلّی یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ جلسہ کی ابتدا ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ریڈر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی کے تعارف سے ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر شمیم نکہت، لکچرر شعبۂ اردو دلّی یونیورسٹی نے اپنا گراں قدر مقالہ ۔۔۔ "بازار حسن کا ایک اہم کردار ۔۔۔ سمن" مصنف منشی پریم چند پڑھا۔ اپنے مقالے میں موصوفہ نے پریم چند کے سماجی اور مذہبی اعتقادات کے مختلف نظریات پر بحث کی۔

صاحب صدر جناب جینندر کمار نے اپنی صدارتی تقریر میں منشی پریم چند کی شخصیت کے مختلف روپ پر اظہار خیال کیا۔ جلسے کے آخر میں مقالے پر سوالات ہوئے۔ جس کے جوابات ڈاکٹر شمیم نکہت نے دیئے اور شکریے کے فرائض ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے ادا کیے۔ جلسہ رات کو نو بجے ختم ہوا۔

سکریٹری شعبۂ اردو (دلی یونیورسٹی۔ دلّی)

## یوم سرسیّد

حیدرآباد۔ یوم سرسید کے سلسلے میں اردو ہال میں ۲۳، ۲۴ نومبر ۶۳ء کو دو روزہ تقاریب منعقد ہوئیں۔ ۲۳ نومبر کے اجلاس کی صدارت جناب ڈاکٹر پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے کی اور ۲۴ نومبر کے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے فرمائی۔

پروفیسر عالم خوندمیری، پروفیسر سید محمدؒ، پروفیسر قاسم علی، جناب غلام ربانی اور جناب صلاح الدین نے مقالے سنائے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی صدارتی تقریر میں سرسید کی اردو پالیسی کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس موقع پر سرسید سے متعلق لکھی گئی تمام کتابوں اور تحریروں کی نمائش بھی کی گئی۔

## کتابوں کی نمائش

آزاد ہند اردو لائبریری چناری (شاہ آباد) گزشتہ دس سال سے علم و ادب کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس لائبریری کے زیر اہتمام کوئی نہ کوئی ادبی تقریب ہر سال منائی جاتی ہے۔ چناں چہ گزشتہ سال ایک ادبی نمائش

(باقی ص۲ پر)

# مطبوعات مکتبہ جامعہ ایک نظر میں

## بڑوں کی کتابیں

### ادب، تنقید، انشا، نظم

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| آشفتہ بیانی میری | رشید احمد صدیقی | ۲/۵۰ |
| پردیسی کے خطوط | مجنوں گورکھپوری | ۲/۷۵ |
| پریم چند | ہنس راج رہبر | ۳/۲۵ |
| تنقید کیا ہے؟ | آل احمد سرور | ۳/۲۵ |
| تذکرۂ جگر | محمود علی خاں جامعی | ۳/- |
| حسرت کی شاعری | ڈاکٹر یوسف حسین | ۱/- |
| روحِ اقبال | ” | ۷/۵۰ |
| ذکرِ غالب | مالک رام۔ایم۔اے | زیر طبع |
| روحِ تہذیب | خواجہ غلام السیدین | -/۷۵ |
| کچھ پرانے خط (حصہ اوّل) | پنڈت جواہر لعل نہرو | ۸/- |
| ” (دوم) | ” | ۸/- |
| گنجہائے گرانمایہ | رشید احمد صدیقی | ۴/- |
| محرابِ غزل | روش صدیقی | ۳/- |

### ناول، افسانے

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ایک چادر میلی سی | راجندر سنگھ بیدی | ۲/۲۵ |
| دانہ و دام | ” | ۳/۷۵ |
| باپ بیٹے | ترگنیف | ۵/- |
| بیوہ | منشی پریم چند | ۲/۵۰ |
| پرندا اور دوسرے افسانے | آصفہ مجیب | ۱/۵۰ |
| خیالستان | سید سجاد حیدر یلدرم | ۳/۷۵ |
| دلدل | ڈاکٹر بھبانی بھٹاچاریہ | ۲/۵۰ |
| دو ہاتھ | عصمت چغتائی | ۳/۵۰ |
| دیا جلے ساری رات | خواجہ احمد عباس | ۲/۵۰ |
| راہِ عمل | صالحہ عابد حسین | ۷/۵۰ |
| سات سال | ملک راج آنند | ۵/۲۵ |
| شکستِ ناتمام | جان اسٹن بک | ۲/- |
| کالے صاحب | اوپندر ناتھ اشک | ۲/۵۰ |
| کیمیاگر | پروفیسر محمد مجیب | ۲/- |
| گئودان | منشی پریم چند | ۶/۵۰ |
| میدانِ عمل | ” | ۶/۵۰ |
| نئی بیاری | مہندر ناتھ | ۲/۵۰ |
| نروان | جیلانی بانو | ۴/۷۵ |
| واردات | منشی پریم چند | ۲/۵۰ |

### ڈرامے

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| موت پر فتح | جیا لال ساز | ۱/۵۰ |
| دروازے کھول دو | کرشن چندر | ۲/۵۰ |
| آئینۂ ایام | پریسٹلے | ۳/۵۰ |
| آذر کا خواب | بیگم قدسیہ زیدی | ۱/۵۰ |
| آزمائش | پروفیسر محمد مجیب | ۱/- |
| بند لفافہ | اشتیاق حسین قریشی | ۱/۳۱ |
| خانہ جنگی | پروفیسر محمد مجیب | ۱/- |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| خالد کی خالہ | بیگم قدسیہ زیدی | ۱/۷۵ |
| جان باز | 〃 | ۱/۳۷ |
| دوسری شام | پروفیسر محمد مجیب | -/۷۵ |
| سراج الدولہ | سچن سین گپتا | ۱/۷۵ |
| کھیتی | پروفیسر محمد مجیب | -/۷۵ |
| نفرت کا بیج | اشتیاق حسین قریشی | -/۷۰ |
| نقشِ آخر | 〃 | ۱/۲۵ |
| ہیروئن کی تلاش | پروفیسر محمد مجیب | -/۶۲ |

## تعلیم

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| بنیادی استاد کے لیے | ڈاکٹر سلامت اللہ | ۲/۲۵ |
| تعلیمی خطبات | ڈاکٹر ذاکر حسین | ۳/۷۵ |
| چند پروجیکٹ | عبدالغفار مدہولی | ۲/۵۰ |
| کھیل کے ذریعہ تعلیم اول | 〃 | ۲/- |
| 〃 〃 دوم | 〃 | ۱/- |
| اُردو املا کا آسان طریقہ | 〃 | -/۷۵ |
| ہم کیسے پڑھائیں | ڈاکٹر سلامت اللہ | ۳/۵۰ |

## تاریخ و سوانح

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| امن کا راستہ | عبدالغفار مدہولی | ۳/- |
| تاریخ الامت اول | مولانا اسلم جیراجپوری | ۲/۵۰ |
| 〃 دوم | 〃 | ۳/۲۵ |
| 〃 سوم | 〃 | ۲/- |
| 〃 چہارم | 〃 | ۳/۲۵ |
| 〃 پنجم | 〃 | ۳/۲۵ |
| 〃 ششم | 〃 | ۳/۲۵ |
| 〃 ہفتم | 〃 | ۲/- |
| 〃 ہشتم | 〃 | زیرِ طبع |
| دنیا کی کہانی | پروفیسر محمد مجیب | ۳/۵۰ |
| کشمیر پر حملہ | کرشنا مہتا | ۲/- |
| گاندھی بابا کی کہانی | بیگم قدسیہ زیدی | ۳/- |
| گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں | از پیارے لال | ۵/- |

## مذہب

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| تعلیماتِ اسلام اول | مولانا عبدالسلام ندوی | ۲/- |
| 〃 دوم | 〃 | ۲/۲۵ |

# بچوں کی کتابیں

## مذہب

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ارکانِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | -/۲۵ |
| آں حضرتؐ | الیاس احمد یحییٰ | -/۵۰ |
| پاک کہانیاں اول | مقبول احمد سیوہاروی | -/۹۵ |
| 〃 〃 دوم | 〃 | -/۱۵ |
| چار یار | الیاس احمد یحییٰ | ۱/۳۰ |
| خلفائے اربعہ | خواجہ عبدالحیٰ فاروقی | ۱/۳۷ |
| رسولِ پاکؐ | عبدالواحد سندھی | ۱/۵۰ |
| سرکارِ دو عالمؐ | محمد حسین حسان | ۲/- |
| عقائدِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | -/۵۰ |

مسلمان بیبیاں اعجازالحق قدوسی ۷۵/-
نبیوں کے قصے خواجہ عبدالحق فاروقی ۸۵/-
ہمارے رسول سید نواب علی رضوی ۸۷/-
ہمارے نبی " " " ۴۰/-

## معلومات

آدمی کی کہانی مشتاق احمد اعظمی ۱/۲۵
انوکھا عجائب خانہ اول محمد حسین حسان ۵۰/-
" دوم " ۴۰/-
" سوم " ۴۰/-
" چہارم ۵۰/-
بجلی کی کہانی علی احمد خاں ۵۰/-
بجلی اور مقناطیس کے کھیل ۷۵/-
بڑادادا کی کہانی پروفیسر عبدالغفور ۵۶/-
تاریخ ہند کی کہانیاں اول خجستہ سلطانہ ۸۰/-
" " دوم ضیاءالرحمٰن ۸۰/-
" " سوم مشتاق احمد اعظمی ۷۵/-
" " چہارم " ۸۷/-
دادا نہرو منور لکھنوی ۱/۵۰
دہلی ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی ۱/۵۰
دنیا کے بسنے والے بشیر حسین زیدی ۷۵/-
دنیا کے بچے محمد حسین حسان ۶۵/-
سونے کی چڑیا محمد عبدالغفور ۱/-
سمندر کے کنارے سلطانہ آصف فیضی ۱/۱۲
سماجی زندگی اول احمد امین شیخ و غلام ابرار ۵۶/-
" دوم " " ۸۰/-
سماجی زندگی سوم احمد امین شیخ و غلام ابرار ۸۱/-
" چہارم " " " ۸۱/-
قدرت کے کرشمے ۴۲/-
گاندھی بابا کی کہانی قدسیہ بیگم زیدی ۳/-
مفید معلومات اول ۵۰/-
" " دوم ۵۷/-
" " سوم ۱/-
" " چہارم ۱/۱۳
معلومات کی پانچویں کتاب ۱/۵۰
مقناطیس کی کہانی ۴۴/-
میر تقی میر محمد حسین حسان ۱/-
ہمارا راج مدن موہن گپت ۴۲/-
ہماری پارلیمنٹ کیلاش چندر ۱/۵۰

## کہانیاں

الوخاں کی بکری ڈاکٹر ذاکر حسین ۲/۵۰
اس نے کیا کرنا جانا آصفہ مجیب ۳۷/-
ایک مزیدار کتاب ۵۰/-
ایک کچوری تیل میں اسرار ندوی ۴۰/-
بچوں کی کہانیاں عبدالواحد سندھی ۳۷/-
پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی رقیہ ریحانہ ۳۵/-
پرندوں کا ایکا سید سجاد مرزا ۲۰/-
ترکوں کی کہانیاں ۵۵/-
جنگل کا راجا صبیحہ بیگم ۳۱/-
جنگو کی بلی عبدالواحد سندھی ۲۵/-
چھوٹی لالٹین مشتاق احمد اعظمی ۳۱/-

چوہوں کی کانفرنس — احسن عثمانی — ۴۵/-
چنبیلی — محمد حسین حسان — ۵۰/-
چھپاوت کا آدم خور شیر — محمد معین — ۳۵/-
تربوزہ شہزادے کا سر بن گیا — کوثر بانو — ۳۰/-
شہزادی گلنار — پروفیسر عطاء اللہ — ۴۰/-
شہزادہ اور ٹھگ — ۴۵/-
شہزادی گلفام — ثریا بیگم — ۵۰/-
شیدلاّ — پروفیسر محمد مجیب — ۵۰/-
لال مرغی — عبدالواحد سندھی — ۵۰/-
مزہ چکھائیں گے — ۳۱/-
مرغی اجیر چلی — ڈاکٹر ذاکر حسین — ۲۵/-
ننھا ٹٹو — خورشید سلطانہ — ۳۰/-
ہمت کا پھل — عبدالواسع عصری — ۳۵/-

## ناول

تین اناڑی — عصمت چغتائی — ۱/۴۰
خرگوش کا سپنا — کرشن چندر — ۱/۷۵
تاروں کی سیر — " — ۱/۷۵

## ڈرامے

آؤ ڈراما کریں — پروفیسر محمد مجیب — ۶۰/-

دیانت — ڈاکٹر ذاکر حسین — ۵۶/-
شمو کی عید — احسن عثمانی — ۵۰/-

## متفرق

بچوں کے افسر (نظمیں) — حامد اللہ افسر — ۷۵/-
مزیدار پہیلیاں — محمود علی خاں جامعی — ۶۵/-
آسان خوشخطی اوّل — علی محمد خاں — ۳۰/-
" " دوم " " " — ۳۰/-
" " سوم " " " — ۳۰/-
" " چہارم " " " — ۳۰/-
نیا حساب برائے درجہ سوم — ۱/۱۰
آسان " " " چہارم — ۱/۴۰

## تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

قاعدہ اور دس سبق فی کتاب — ۲۵/-
مختلف ۱۲۲ کتابیں " " — ۳۱/-
" ۳ " " " — ۳۷/-
" ۱۱ " " " — ۵۰/-
" ۴ " " " — ۶۲/-
۱ کتاب (چاند) — ۷۵/-
" ۲ کتابیں فی کتاب — ۸۷/-

---

اس شمارے کی قیمت ۲۵ نئے پیسے


| سالانہ چندہ ایک روپیہ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ | فی پرچہ ۱۰ نئے پیسے |
| --- | --- | --- |

پرنٹر پبلشر سید احمد دہلوی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

نئی دہلی
ماہنامہ
# کتاب نما

نگراں
غلام ربانی تاباں

مدیر
ایمان احمد عباسی

جلد ۵ | فروری سنہ ۱۹۶۴ء | شمارہ ۲


## اشاریہ

اِس زمانے میں تحقیق کی طرف رُجحان بڑھا ہے، جس کے فیض سے اِس بات کا عام طور سے احساس کیا جارہا ہے، کہ پُرانی اور اچھی کتابوں کے بالکل صحیح متن ہمارے پاس ہونا چاہیے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ بیش تر کتابوں کے صحیح اڈیشن موجود نہیں ہیں۔ جو کتابیں اب سے سَو، پچاس برس پہلے چھپی تھیں، اُن کے اوّلین اڈیشن نایاب کی حد تک کم یاب ہیں۔ مختلف اِداروں نے بار بار اُن کتابوں کو چھاپا ہے، جتنی زیادہ یہ کتابیں چھپی ہیں، اُسی قدر غلطیاں بھی بڑھتی گئی ہیں۔ نہ معلوم کتنے پُرانے لفظ اور قدیم انداز کے جملے، جو آج اُس طرح مستعمل نہیں، اِن کتابوں میں کچھ سے کچھ بن گئے ہیں۔ زُبان وادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے عموماً، اور طلبہ کے لیے خصوصاً، یہ صورتِ حال پریشان کُن ہے۔

سَو، ڈیڑھ سَو برس پہلے بہت سے ایسے لفظ مستعمل تھے، جن سے آج ہم روشناس نہیں۔ قواعدِ زبان، املا، تلفظ اور تذکیر و تانیث میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ پہلے بہ لحاظِ کتابت، یائے معروف و مجہول کا امتیاز ملحوظ نہیں رہتا تھا، جس کی وجہ سے آج متعدد لفظوں کی تذکیر و تانیث اور بعض دوسرے مسائل میں، بہت سی اُلجھنیں سامنے آتی ہیں۔ اِن وُجوہ کی بِنا پر آج یہ بات بے حد ضروری ہوگئی ہے کہ ایسی قدیم کتابوں کو نہایت صحت و اہتمام کے ساتھ، اُصولِ تحقیق کی روشنی میں مُرتّب کیا جائے۔

ناموافق حالات کے باوجود، ابھی زُبان وادب سے دل چسپی باقی ہے، عام لوگوں میں اچھی کتابیں خریدنے کا شوق ہے، وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی چھوٹی سی لائبریری میں اُردو کی معیاری کتابیں موجود ہوں۔ لیکن اِن میں سے بہت سے اہلِ ذوق کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی، کیوں کہ اُن کا شوقِ خریداری،

نسبتاً ابھی چھپی ہوئی کتابوں کی اونچی قیمتوں کا ساتھ نہیں دے پاتا۔

صرف طلبہ کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو اس مسئلے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ تعلیم آج کس قدر مہنگی ہو گئی ہے، اس سے کون ناآشنا ہوگا۔ درمیانی طبقے اور کم آمدنی والے طبقے کے طلبہ کے لیے قیمتی کتابوں کا خریدنا کس قدر صبر آزما ہوگا، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ خصوصاً جب کہ یہ کتابیں صحتِ متن کی ضروری شرط کو بھی پورا نہ کرتی ہوں۔

ان سارے امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، مکتبہ جامعہ نے اردو کی معیاری اور سستی کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کتابوں کو پیش کیا جائے گا، جو ہمارے ادب میں مسلمہ حیثیت حاصل کر چکی ہیں، جو زبان و ادب کے لحاظ سے شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں اور جن کے بغیر نہ کوئی اچھی لائبریری مکمل ہو سکتی ہے، نہ زبان و ادب کے طالب علم ان سے بے نیاز رہ سکتے ہیں۔ ان کتابوں کی ترتیب و تصحیح میں مندرجہ ذیل امور کو خاص طور سے ملحوظ رکھا جائے گا:

(۱) اس بنیادی اصول کے تحت، کہ کتاب کا متن معتبر ترین اشاعت پر مبنی ہو، ان کتابوں کے اولین اڈیشن یا بصورتِ دیگر، قابلِ ذکر اشاعتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔ اور کئی قدیم نسخوں کی مدد سے، اس کا متن مرتب کیا جائے گا۔

(۲) جن کتابوں کے معتبر اڈیشن موجود نہیں ہیں، ان کے معتبر قلمی نسخوں کو متن کی بنیاد بنایا جائے گا۔

(۳) بیشتر کتابوں کے آخر میں ضروری الفاظ کی فرہنگ ہوگی۔

(۴) عربی، فارسی اور ہندی کے وہ لفظ، جو آج کل کم استعمال ہوتے ہیں، یا متروک ہو چکے ہیں، یا جن کے تلفظ میں کسی غلطی کا احتمال ہو سکتا ہے، ان کو احتیاط کے ساتھ، مع ضبطِ حرکات درج کیا جائے گا۔

ہمیں یقین ہے کہ زبان و ادب سے دل چسپی رکھنے والے حضرات، ہمارے اس سلسلے کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

اس سلسلے کی پہلی کتاب باغ و بہار ہوگی۔ میر امن کا یہ شاہ کار کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب پہلی بار کلکتے سے ۱۸۰۳ء میں چھپی تھی، یہ اڈیشن کم یاب ہے۔ اس کا ایک اور قابلِ ذکر اڈیشن وہ ہے، جسے مشہور مستشرق فاربس نے لندن سے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس میں خاصی بڑی فرہنگ بھی شامل ہے اور مرتب نے ضبطِ حرکات کا بھی بہت اہتمام کیا

ہے۔ یہ اڈیشن بھی کم یاب ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے اس کو ایک مفید مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو سے شائع کیا تھا۔ اس کے دو اڈیشن شائع ہوئے تھے۔ یہ نسخے بھی اب بازار میں عموماً دست یاب نہیں ہوتے ہیں۔

ہم نے فورٹ ولیم کالج کے شائع کردہ مذکورۂ بالا اڈیشن کو، اپنے نسخے کے متن کی بنیاد بنایا ہے۔ اور نسخۂ فاربس کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اشاعتِ اوّل میں جو اغلاط طباعت رہ گئی تھیں، اور جو اس کے غلط نامے میں بھی شامل نہیں ہو سکی تھیں، اُن کی تصحیح نسخۂ فاربس کی مدد سے کی گئی ہے۔ اس طرح مکتبۂ جامعہ کا یہ نسخہ باغ و بہار کے معتبر متن اور ضروری فرہنگ پر مشتمل ہے۔ اس کی ترتیب و تصحیح میں جس احتیاط و اہتمام سے کام لیا گیا ہے، اس کی بنا پر یقین کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نسخہ اربابِ ذوق کی پسندیدگی کی سند حاصل کرے گا۔ اور طلبہ کے لیے مختلف اعتبارات سے نہایت مفید ثابت ہوگا۔

---

افسوس کہ علی گڑھ کے رجسٹرار جناب سید ظہیرالدین صاحب علوی کا ۱۲ر جنوری کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم ایک عرصے سے جامعہ اردو کی خدمت میں لگے ہوئے تھے اور مسلم یونی ورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۵۶ء سے تو انھوں نے اپنا پورا پورا وقت جامعہ اردو کی نذر کر دیا تھا۔ علوی صاحب کی ان تھک محنت کی وجہ سے جامعہ اردو کے کام کو کافی فروغ ہوا اور اس کے امتحانات کی وجہ سے اردو ادب کا مطالعہ بھی بڑھا اور اس کی مقبولیت میں بھی خوب اضافہ ہوا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے! آمین

---

مکتبہ جامعہ کی ۳ نئی کتابیں جو اس ماہ شائع ہو رہی ہیں

## غزل سرا ——— مجنوں گورکھپوری

"غزل سرا" اردو غزل گو شعرا میں سے ۱۲ مشہور شعرا کی غزلوں پر مجنوں صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مقالوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مقالے جو تنقید نگاری کے اصول اور معیار پر پورے اُترتے ہیں، نہایت دیانت داری اور ذمّے داری کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ مجنوں صاحب کے ہاں تنقید کا پہلو زیادہ جان دار زیادہ نمایاں اور زیادہ صحیح ہے اس لیے نئے تنقید نگاروں کو جن کے لیے یہ کتاب شمع ہدایت کا کام دے گی، اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ یہ مقالے جو مختلف رسائل وغیرہ میں طبع ہو چکے ہیں، پہلی بار یکجا ہو کر کتابی شکل میں شائع ہو رہے ہیں۔

قیمت
چھ روپے

## ذکرِ غالب ——— مالک رام

"ذکرِ غالب" کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے" کے جواب کا متلاشی ہے۔ اس نئے ایڈیشن میں مضامین کا اضافہ ہوا ہے، حوالے مکمل کیے گئے ہیں اور پچھلے دو تین برسوں میں غالب اور اُن کے کلام پر جو مزید معلومات فراہم ہوئی ہیں وہ اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔ غرض کہ ہر پہلو سے کتاب مکمل اور نئی تالیف کی حیثیت رکھتی ہیں جن حضرات کے پاس پچھلا ایڈیشن ہو انھیں بھی یہ ترمیم شدہ نیا ایڈیشن ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

ذکرِ غالب کا یہ نیا اڈیشن بہتر کتابت و طباعت اور عمدہ جلد سے آراستہ ہے۔

قیمت:
چار روپے
۲۵ نئے پیسے

## اُوپر کی منزل

کرتار سنگھ دُگّل

دُگّل ملک کے جانے پہچانے تمثیل نگار ہیں۔ ان کے ڈراموں میں توازن بھی ہوتا ہے اور معقولیت بھی۔ ان کے ڈراموں کے پلاٹ اپنے اندر ایک معقول قسم کی رومانیت رکھتے ہیں جنھیں پڑھ کر بے انتہا لطف آتا ہے۔ اس مجموعے میں دس ڈرامے ہیں۔ ہر ڈرامہ ٹیکنیک کے لحاظ سے مکمل ہے اور پلاٹ اور منصد کی حیثیت سے کامیاب یہ ایک ایکٹ کے ڈرامے جو پہلی بار شائع ہوئے ہیں آسانی سے اسٹیج کیے جا سکتے ہیں۔

قیمت: چار روپے

پروفیسر رشید احمد صدیقی

# سیّد سجّاد حیدر یلدرم

رفقاء اور طلباء سے اکثر اس مسئلہ پر "بحثنے" کا اتفاق ہوا کہ نامعقول شخص شاعر نہیں ہو سکتا۔ جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنونِ شریفہ کے آداب کہاں سے آئیں گے۔ اصغر گونڈوی اور سید سجّاد حیدر پیشِ نظر ہیں۔ ایک کی دل افروز شاعری اور دوسرے کی حسین انشاپردازی تمام تر ان کی شریفانہ شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ جو شاعر اور انشاپرداز کی حیثیت سے بہتوں کو شہرت حاصل ہے لیکن ان کی شاعری اور انشاپردازی میں نقص بھی اسی حد تک رہتا ہے جس حد تک بحیثیت انسان وہ نامعتبر واقع ہوئے ہیں۔ فن اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ ایسا کوئی فن نہیں جو انسان سے اونچا یا اس سے علیحدہ ہو۔

یلدرم علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے اور اس زمانے کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو گویا کچھ نہ تھی۔ شاید یہ سبب ہو کہ زندگی سوا خوش رہنے اور خوش رکھنے کے لیے سب کچھ ہے۔ میں نے ان کی طالب علمی نہیں دیکھی لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب ع

بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گزری تھی بات

اس وقت سے اب تک زمانے کے رویے اور روایات میں بہت کچھ فرق آ گیا ہے۔ اقدار کا کیا کچھ فرق "جن پر مرنے والے لاکھوں تھے ان پر مرنے والا کوئی نہیں" لیکن سجّاد حیدر کی حیثیت جداگانہ تھی۔ ان میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی اور یہ ان کی سیرت و شخصیت کا بہت اہم اور مہتم بالشان پہلو ہے۔

انھوں نے روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں اور سہیں۔ ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو یکسر زیر و زبر کر سکتی تھیں لیکن یلدرم کو فن کا ایسا اعتماد اور ان کی سیرت میں ایسی پختگی تھی کہ ان کو زمانے کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ سیاسی فرائض بھی ان کے سپرد ہوئے۔ انتظامی اور ادبی بھی لیکن وہ شروع سے آخر تک اور سر سے پاؤں تک شریف تھے۔

شاعر اور ادیب رہے۔

مسلم یونی ورسٹی کے ابتدائی عہد میں مرحوم اس کے رجسٹرار رہے۔ انھوں نے مہاراجا محمود آباد، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، نواب سر مزمل اللہ خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا وطیرہ جداگانہ تھا اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ انھوں نے کام سب کے ساتھ کیا سازش کسی سے نہ کی۔ یہی ایک بات یلدرم کی شرافت نفس اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

مرحوم کو ڈپٹی کلکٹری راس آئی نہ رجسٹراری۔ وہ یونی ورسٹی میں بھی رہے اور کالا پانی میں بھی لیکن روزگار کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو گئے لیکن کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی پاداش میں نہیں جس کے بغیر کالا پانی کے تصور میں نہ گرمی آتی ہے نہ روشنی، اور یونی ورسٹی آئے تو ایسے منصب پر جسے دنیا بھر کی سرگرمیوں سے سروکار ہو سکتا ہے الّا شعر و ادب سے۔ اس یونیورسٹی میں شعر و ادب کے دیوانے دو ہی پائے گئے اور دونوں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں۔ ایک احسن مارہروی اور دوسرے یلدرم۔ ترکی، ترک اور ترکی ادب سے سجاد حیدر کو عشق تھا۔ اُن کا نام آتے ہی ان پر وارفتگی طاری ہو جاتی تھی۔ میں ترکی سے واقف نہیں لیکن ترکی ادب سے آشنا مختلف اصحاب کے ترکی کے اردو تراجم دیکھے ہیں۔ سجاد حیدر اور دوسروں کے ترجموں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ ایک بار سید صاحب سے پوچھا کہ ترکی ادب ہی جان دار ہے یا اس میں آپ کے شائبۂ خوبیٔ تحریر کو بھی دخل ہے؟ جھومنے لگے، آنکھوں میں چمک آگئی اور چہرہ جگمگا اٹھا۔ کہنے لگے جناب (مرحوم جوش میں آتے تو جناب کا لفظ ضرور استعمال کرتے اور اس پر مخصوص انداز سے زور دیتے) ترکی زبان جانتے ہیں کس کی زبان ہے۔ ہماری آپ کی نہیں ہے۔ میں نے بات کاٹ کر کہا۔ جناب تو میں بھی کہہ رہا تھا کہ میری تو یقیناً نہیں، جناب آپ کی بھی نہیں ہے۔ مسکرائے، پھر بولے ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے اور ان ہی کی ہو سکتی ہے۔ یہ ان کی زبان ہے جو نہ کبھی خود غلام رہے نہ کسی کو غلام رکھا۔ معرکہ آراؤں کی زبان ہے۔ اس میں ترکتازی ہے۔ سید صاحب پر کیفیت طاری ہو چکی تھی [illegible] نہ وہ اپنے بس میں تھے نہ میرے۔ دیر تک ان پر یہ عالم طاری رہا۔ نامق کمال کا مشہور ڈراما [illegible] الامین خوارزم شاہ میری ہی درخواست پر سید صاحب نے اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا [illegible] کا بیشتر حصہ سہیل میں شائع ہوا۔ سید صاحب قلم کاغذ لے کر خود ترجمہ کرنے نہیں بیٹھتے تھے [illegible] کسی کو مامور کر دیا جاتا۔ سید صاحب ترجمہ بولتے جاتے وہ لکھتا جاتا۔ شاذ و نادر کہیں ترمیم

کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ترجمہ پڑھتے جارہے ہوں۔ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مترادفات کیسے ہوتے تھے لیکن جہاں تک الفاظ فقروں اور ترکیبوں کا تعلق ہے مرحوم کے اس کمال کا معترف ہوں کہ وہ بڑے اچھوتے بڑے جاندار اور بڑے گوارا اردو الفاظ استعمال کرتے تھے۔ الفاظ سے انتخاب اور ترکیبوں کا اختراع ترجمہ میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ اور یہ بات صرف کسی غیر معمولی مترجم کے حصہ میں آتی ہے۔ یہاں مولوی عنایت اللہ مرحوم دہلوی یاد آتے ہیں جن سا باکمال ترجمہ کرنے والا اردو ادب میں شاید ہی کوئی دوسرا گزرا ہو۔ یہ بات ان ہی کے حصہ میں آ بھی سکتی تھی وہ اُردو کے گہوارہ میں نہیں پلے تھے بلکہ اُردو اُن کے گہوارہ میں پلی تھی۔

یلدرم نے ترکی سے تراجم زیادہ کیے ہیں اردو مضامین نسبتاً کم لکھے ہیں۔ ترکی انشار پردازی کا انداز ان میں کچھ ایسا رچ گیا تھا کہ اردو لکھنے میں ان کا قلم بڑی خوبی سے ترکی رنگ و آہنگ قبول کر لیتا تھا۔ سید کے اسالیب انشار اور ان کی موضوعات سید کی شخصیت کی بڑی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ اُردو میں انشار لطیف کی ابتدا، شرر، ریاض اور یلدرم کی تحریروں سے ہوئی۔ انشار لطیف کا رشتہ کھینچ تان کر ملا وجہی کی سب رس سے بھی ملایا جاتا ہے لیکن سب رس کا انداز متغزلانہ تصوف کا ہے جو انشار لطیف سے جوڑ نہیں کھاتا۔ انشار لطیف نے آگے چل کر ٹیگوریت کا رنگ اختیار کر لیا اور ٹیگوریت نے اُردو میں ناقابل التفات درجہ کی تحریروں کو اس درجہ عام اور مقبول بنایا کہ ثقات ادب کو احتساب کرنا پڑا اور اُردو میں یہ انداز جلد ہی ختم ہو گیا۔ یہاں تک کہ جو اصحاب اس کے سب سے بڑے حامی سمجھے جاتے تھے وہی سب سے پہلے اس کے تائب ہوئے۔ سبب یہ تھا کہ گیتانجلی کا جو اردو ترجمہ شائع ہوا اس کے چھلکے کو قبول کر لیا لیکن اس کے مغز سے ناآشنا رہے۔ یہ چھلکا اتنا مسحور کن تھا کہ تہی مغز اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے اور اس سے کام نکالنے کے درپے ہوئے لیکن گاڑی آگے نہ چل سکی۔ شرر اور ریاض کے عاشقانہ مضامین اور یلدرم کی انشار لطیف میں فرق ہے۔ شرر کا اسلوب انشار اور ان کا عشق دونوں کتابی ہیں بندھے ٹکے، ڈھلے ڈھلائے شخصی تاثرات کی ترجمانی نہیں۔ شاعرانہ زبان و بیان کی نمائش ملتی ہے۔ ریاض میں زبان و بیان کا مظاہرہ شرر سے زیادہ غیر معتدل ہے۔ ریاض کی شاعری میں جو پر تکلف لیکن سطحی شوخی ملتی ہے وہ ان کی نثر میں پہنچ کر سستی ہو گئی ہے۔ شاعری میں جو انداز بیان اس کا حسن ہے وہ نثر میں مصنوعی اور مہمل ہو جاتا ہے۔ موضوع اور سطح کے یکساں ہونے کے باوجود نثر اور نظم کے تقاضوں میں فرق

ہے۔ ریاض اور ناصر علی دہلوی نے اس امتیاز کو اپنی اپنی نثر میں نظر انداز کر دیا ہے۔
یلدرم کے یہاں بھی حسن و محبت کا کاروبار ہے لیکن یلدرم میں مجاز کی طرفگی و تازگی ہے۔ سرشار اور ریاض کی پیداوار مشینی ہے سجاد کی دستی، سجاد انصاری کو بھی انشاء لطیف کا پیرو قرار دیا جاتا ہے لیکن سجاد انصاری کے یہاں نفسیاتی تحلیل ملتی ہے جس کو انشار لطیف سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، انشائے لطیف اور غزل سرائی کا سرچشمہ ایک ہے ع

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے

لیکن جس طرح غزل میں آرٹ اور اقدار کے اختلافات ملتے ہیں ادب لطیف میں بھی یہ امتیازات نظر آتے ہیں۔ یلدرم اور ادب لطیف کے بعض دوسرے علم برداروں میں یہ فرق واضح ہے سجاد حیدر کے ہاں شوخی ہے لیکن شہد پن نام کو نہیں۔ یلدرم کی تحریروں میں عورت کا بڑا عمل دخل ہے لیکن ان کے یہاں خیالات کی رعنائی ملتی ہے۔ اعصاب کا تشنج نہیں، مہدی افادی کے ہاں خیالات کی رعنائی آتی نہیں ہے جتنی جذبات کی رنگینی۔ مہدی کے اعصاب پر اگر عورت کلیۃً سوار نہیں ہے تو ان کو تنہا بھی نہیں چھوڑتی افادی کی تحریروں میں اکثر شوق کی مثنویوں کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔

سجاد حیدر کی تحریروں میں ایک بات واضح طور پر ملتی ہے یعنی وہ جذبات کی رو اور روانی میں اپنے وزن و وقار کو بہہ جانے نہیں دیتے۔ مرحوم کے جذبات کچھ زیادہ تیز و تند نہ تھے جہاں خیالات کی رعنائی ہو وہاں جذبات کا ہیجان و طغیان یوں بھی کم ہوتا ہے۔ پھر بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آگئے ہیں سجاد صاحب نے ایک ہلکی جنبش قلم سے ان کو معتدل کر دیا ہے وہ بھی اس طور پر کہ اظہار مطلب میں کوئی فرق نہ آیا اور شرم و شرافت کا دامن بھی نہ چھوٹا سا انشائے لطیف میں خیال کی رنگینی اور نزاکت کے ساتھ جذبہ کی متانت و عفت کو جس طرح یلدرم نے متوازن رکھا ہے۔ شاید کسی اور نے نہیں رکھا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ان کی تحریروں میں جذبات سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی ہے۔ قاضی عبدالغفار اس بارے میں یلدرم سے ملتے ہیں لیکن دونوں کی ذہنی پرداخت میں تفاوت ہے۔ قاضی صاحب کی تحریر میں طنز کی تیزی و تلخی بھی شامل رہتی ہے، عبدالغفار، سجاد حیدر کی بجائے سجاد انصاری سے زیادہ قریب ہیں۔ انشائے لطیف کے تین بڑے اچھے اور مکمل نمونے ہمارے یہ تین انشا پرداز بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ سجاد حیدر، سجاد انصاری اور قاضی عبدالغفار۔

بعض اعتبار سے سجاد حیدر شروع سے آخر تک نوجوان رہے۔ وہ اس زمانے میں بھی جوان تھے جب جسم وجان کے اعتبار سے نحیف ونزار ہو چکے تھے۔ تعلیم نسواں، اردو ٹائپ، اسالیب شاعری میں نئے تجربات اور اس قبیل اور باتوں میں اوائل عمر سے سجاد حیدر ترقی پذیر واقع ہوئے تھے۔ اردو ٹائپ کو مقبول بنانے میں تمام عمر کوشاں رہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی نئی شاعری کے بڑے مدّاح تھے اور اُن کی ایک مخصوص نظم بڑے مزے لے کر پڑھتے تھے۔

اُسی زمانے میں ایک فارسی مجلّہ برلن سے ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا۔ اسی سلسلے میں ایک واقعہ یاد آتا ہے مرحوم اپنی کوٹھی سے دفتر آرہے تھے سرپر بہت سارے لفافے کاغذات کے کچھ منتشر اجزا ایک آدھ اخبار ورسالے بغل میں دبائے یہی رسالہ پڑھتے چلے جارہے تھے میں ان سے کوئی بیس بائیس قدم پیچھے تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے۔ رفتار اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی ہموار کسی قدر تیز چھوٹے چھوٹے قدم لیتے تھے۔ نگاہ نیچی تقریباً عمودی دس بارہ قدم چل کر اک ذرا رک سے جاتے اور ٹھیک سامنے ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر گرم رفتار ہو جاتے۔ اس پر ان سے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چسپت کیا تھا کہ سجّاد تم چلنے میں سانپ کو شرماتے ہو۔ وہ بھی چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے کہنے لگے سانپوں میں رہ کر صرف سانپوں کی چال آئی اس کی تعریف نہ کرو گے۔ اسی انداز سے چلے جارہے تھے کہ ایک لفافہ سرک کر زمین پر آرہا سجاد صاحب کو خبر نہ ہوئی میں نے اٹھالیا۔ کچھ دور اور بڑھے تھے کہ دوسرا لفافہ گرا۔ وہ بھی میں نے اٹھالیا۔ تھوڑی دیر بعد تیسرے لفافے نے بھی مفارقت کی۔ وہ بھی میں نے قبضہ میں کیا۔ سجّاد صاحب برابر رسالہ کے مطالعہ میں منہمک رہے۔ سیّد صاحب کے پیچھے پیچھے یونی ورسٹی آفس پہنچا۔ موصوف نے بچے ہوئے لفافے متعلقہ لوگوں کے حوالے کیے۔

معلوم ہوا تین لفافے گم ہیں۔ چونک پڑے اور سخت متفکر ہوئے۔ میں نے تینوں لفافے کچھ کچھ وقفے سے واپس کیے۔ فرمانے لگے آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اسی وقت کیوں نہ دیئے۔ میں کہا آپ مطالعہ میں منہمک تھے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔

یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے۔ فرمایا خوب یاد دلایا یہ ملاحظہ فرمایئے "ایرانشہر" ہے۔ ٹائپ میں کتنا ستھرا چھپا ہے اور کیسے اچھے اور جاندار مضامین ونظمیں ہیں۔ ایرانی وطن پرستوں نے اسے برلن سے شائع کیا ہے۔ کاش اردو میں ایسا پاکیزہ اور دیدہ زیب ٹائپ رواج پا جائے

اور جناب بات تو یہ ہے کہ جب تک آپ "بُت سنگی" (لینتھو کی چھپائی) سے رشتہ نہ توڑیں گے اردو کی اشاعت مسدود رہے گی۔ عرض کیا سیّد صاحب "بُتِ سنگی" کا تو ہمارے شعر و ادب میں ایک درجہ بھی ہے بُتِ آہنی میں کیا رکھا ہے بقول شخصے ع

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا یہی تو ستم ہے۔ آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اچھی بھلی باتوں میں کھٹس ملا دیتے ہیں۔ اکبر نے ٹائپ کی خواہ مخواہ مٹی پلید کر دی میں نے کہا سیّد صاحب اکبر نے کہیں کھٹس نہیں ملایا بھٹس میں چنگاری لگائی ہے فرمایا اور جناب آپ بھی کچھ دور نہیں کھڑے ہیں۔

سید صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ یہ لازم کوئی غیر معمولی شاعر نہ تھے ان کی سب سے پہلی نظم مرزا پھویا بتائی جاتی ہے۔ اس میں شاعرانہ خوبیاں کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن گذشتہ علی گڑھ کی زندگی کے بعض دلکش پہلو لطف سے بیان کیے گئے ہیں۔ ہلکی پھلکی تفریحی نظموں میں اس کو اچھا درجہ دیا جا سکتا ہے سیّد صاحب کی نقاشی نازک خطوط اور ہلکے رنگوں کی ہے۔ ان کا مزاج رومانی تھا وہ رومان جو انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے پستی کی طرف ہرگز نہیں۔ موجودہ عہد میں رومان کی حیثیت مسخ کر دی گئی ہے اس کو مزاج و خیال کی رنگینی و آزادی کے بجائے شخصی و انفرادی بے راہ روی قرار دیا گیا ہے۔

سجاد صاحب کی ایک نظم جو ان کی طبیعت کی رنگینی اور شخصیت کی دلآویزی کی ترجمان ہے شملہ کالکا لائن پر ایک نظارہ کے عنوان سے سب سے پہلے سہیل میں شائع ہوئی۔

سیّد صاحب کی یاد کے ساتھ یہ نظم ہمیشہ یاد آتی رہے گی۔

ماتھے پہ بندی آنکھ میں جادو ہونٹوں کی بجلی گرتی تھی ہر سو
چال لچکتی بات لہکتی جیسے کسی نے پی ہو دارو
انکھڑیاں ایسی جن میں تھے زنداں لمحے میں راد ھا لمحے میں راہو
ایسی بھڑک تھی خلق تھی حیراں ریل پر آیا کہاں سے آہو

سجاد صاحب کو جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں ترکی، ترکی ادب اور ترکوں سے والہانہ شغف تھا۔ ان میں سے کسی کا نام آجاتا تو وجد میں آجاتے۔ جس زمانہ میں مسلم یونی ورسٹی کے رجسٹرار تھے ایک بار مرحوم کو ترکی جانے کا موقع مل گیا۔ کیا بتاؤں ان پر کیا نشاط طاری تھا۔ صحت اچھی نہ تھی میں نے کہا سید صاحب سفر طویل ہے۔ تکلیف وہ بھی۔ کیسی گزرے گی؟ فرمایا ترکی

کے خیال سے طبیعت مگن ہے۔ شگون اچھا ہے اور ہر اعتبار سے اچھا۔ یا یہ خاک وہاں کی خاک میں مل جائے گی یا پھر دیکھیے گا کیا رقصاں وشاداں واپس آتا ہوں۔ چند ماہ بعد واپس آئے۔ سیّد صاحب یوں بھی سبک رفتار تھے۔ واپسی پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاؤں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ جسم میں توانائی، چہرہ پر بشاشت اور سُرخی آگئی تھی۔ پوچھا ٹرکی میں کوئی تبدیلی پائی؟ فرمایا شروع سے آخر تک تبدیلی ہی تبدیلی نظر آئی لیکن مجھے تو ٹرکی سے اُلفت ہے اس کے بدلنے نہ بدلنے سے کیا سروکار۔

ترکی ادیبہ خالدہ خانم اور ان کی ابتدائی تحریروں کے بڑے دلدادہ تھے۔ موصوفہ علی گڑھ تشریف لائیں تو یونین میں سجاد حیدر صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا اور ضمناً موصوفہ کے ابتدائی مضامین اور انشاپردازی کو بڑے لطف سے سراہا۔ خالدہ خانم نے فرمایا کہ اب وہ اگلے اسلوبِ انشا سے تائب ہوگئی ہیں اور اسے صرف ایامِ جہالت کی یادگار سمجھتی ہیں۔ سجاد صاحب خاموش ہوگئے۔ بعد میں ایک صحبت میں اس واقعہ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے خالدہ خانم کو کیا معلوم ان کی ایامِ جہالت کی باتوں نے کیا شگوفے کھلائے پھر خلط مبحث سے کیا حاصل۔ سوال یہ نہیں ہے کہ خالدہ خانم کو کیا پسند ہے، اصل یہ ہے کہ میں کیا پسند کرتا ہوں۔

بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے ان کو توڑ جوڑ بالکل نہ آتا تھا۔ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ سچے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وہ اہلِ مناصب سے کبھی مرعوب نہ ہوئے۔ فن کی داد دینے میں بڑے سخی تھے۔ سیّد کو میں نے شاید ہی کبھی "تم" کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سُنا ہو۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو ذاتی رفعت اور منفعت کا وسیلہ نہیں بنایا اور کبھی نے ان کو برہمی میں آپے سے باہر نہ پایا۔ اور ہنسی دل لگی میں بھی ان کی زبان سے کبھی ایسے الفاظ سُنے جو مذاقِ سلیم پر بار ہوں یلدرم جیسے گڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں۔ ان آداب کو وہ اس لطف سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے بغیر کسی ارادے یا تکلف کے۔ یلدرم میں رسمی تکلف بالکل نہ تھا۔ ان کی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقہ کا اقتضا ہوتا تھا۔ اور بے تکلف بھی اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسنِ معاشرت کا جز سمجھی جاتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو اونچی

(باقی ص ۲۲ پر)

ڈاکٹر معین احسن جذبی

# غزل

ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ

یہی زندگی مصیبت، یہی زندگی مسرّت
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ

کبھی درد کی تمنّا، کبھی کوششِ مداوا
کبھی بجلیوں کی خواہش، کبھی فکرِ آشیانہ

مرے قہقہوں کی زد پر کبھی گردشیں جہاں کی
مرے آنسوؤں کی رو میں کبھی تلخئ زمانہ

مری رفعتوں سے لرزاں کبھی مہر و ماہ و انجم
مری پستیوں سے خائف کبھی اوجِ خسروانہ

کبھی میں ہوں تجھ سے نالاں، کبھی مجھ سے تو پریشاں
کبھی میں ترا ہدف ہوں، کبھی تو مرا نشانہ

جسے پا سکا نہ زاہد، جسے چھو سکا نہ صوفی
وہی تار چھیڑتا ہے مرا سوزِ شاعرانہ

---

یہ غزل جذبی صاحب کے پہلے مجموعہ کلام "فروزاں" سے لی گئی۔ "فروزاں" ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۳ء تک کی بہترین نظموں اور غزلوں کا منتخب مجموعہ ہے جو ہمیں جذبی صاحب کے شاعرانہ کمالات سے روشناس کراتا ہے۔

"فروزاں" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے مل سکتی ہے۔ قیمت دو روپے ۲۵ نئے پیسے

مصنف: ڈاکٹر ملک راج آنند

ترجمہ: رضیہ سجّاد ظہیر

# سات سال

اس حادثے کے بعد میں بہت ذلیل ہو گیا خاص کر اماں کی نظروں میں۔ کیوں کہ ان کو نہ صرف میرے اس گناہ کا احساس تھا بلکہ میرے گناہ کے کفّارے میں جو بلّی بنوا کر مندر میں چڑھائی تھی۔ اس کے سونے کی قیمت بھی دینی تھی! ویسے تو انھوں نے اپنی ناراضگی کا کوئی خاص اظہار نہیں کیا لیکن اکثر خفا ہوتی رہتی تھیں اور اکثر جب بلّی کا رونا سنتیں تو مجھے اس لاپرواہی پر بُرا بھلا کہتیں۔

بارجی البتہ اب تک خوب لاڈ کرتے تھے، گود میں لے کر بے معنی الفاظ گنگناتے ہوئے جُھلاتے۔ مجھ سے اپنی مونچھیں کھنچواتے اور اماں کی توہم پرستی کا مذاق اڑاتے۔ مجھے ان کے الفاظ اور اماں کے جواب یاد ہیں۔ حالاں کہ اس وقت میں ان کا مطلب بالکل نہیں سمجھتا تھا۔

"یہ تیری ماں بالکل بے وقوف ہے" بارجی کہتے "ذرا سوچ تو بھگوان کو خوش کرنے لیے سونے کی بلّی بنوانے کی کیا تک ہے۔ آخر؟ وہ سونے کا کھلونا ضرور پنڈت بال کرشن کی تجوری میں پہنچے گا۔ تجوری اور بھر جائے گی۔ بلّی کا بچّہ تو مر چکا، ختم ہو چکا، اس بچّے کا قصور ہی کیا ہے جب کہ اس کو پتا ہی نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور یہ پاگل سُندریا خواہ مخواہ ضمیر کی کھٹک سے مری جاتی ہے۔"

ارے اب ایسے نہ بنو جیسے سب کچھ تم ہی جانتے ہو۔ بھگوان کی لیلا نیاری ہے، وہ سب دیکھتا ہے ہم کس وقت کیا کرتے ہیں۔ اگر پاؤں تلے کی چیونٹی کو بھی ہم دکھ پہنچائیں گے تو اس کو پتہ چل جائے گا اور اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے میں کبھی نہ چاہوں گی کہ وہ ہم سے خفا ہو۔ ویسے ہی ہم اپنے بُرے کرموں کا پھل بھوک چکے پرتھوی چلا گیا۔ اب انہیں لڑکوں کی اور پیدا ہونے والے بچے کی عمر بڑھے اور تم تو یہ دل لگی نہ کرتے تو اچھا کرتے۔ میں تمھارے گناہوں کا خمیازہ ویسے ہی بھگتا کرتی ہوں۔

"یہ تو عجیب دلیل ہے بھئی" بارجی نے کہا۔ "یہ کس قسم کا لغو بھگوان ہے جو اس طرح سے

انتقام لیتا ہے۔"

"مت بے دینی کی باتیں بکو" اماں چیخیں۔ "بھگوان کو گالی دیتے ہو۔ دس سال تک پورن ماشی پر برہمن کھلانے پڑیں گے۔"

بارجی نے صرف آنکھیں سکوڑلیں اور ہنسنے لگے، پھر وہ ہم سب کو سیمنٹ کر باغ والے کوئیں پر نہلانے کے لیے لے گئے۔

ان دنوں وہ ہم لوگوں کی دیکھ بھال میں زیادہ حصّہ لینے لگے تھے کیوں کہ غالباً ان کو یہ خیال تھا کہ ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور وہ ہم لوگوں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی ہیں! ہم اس بات پر بے حد خوش تھے کیوں کہ ہمارے لیے تو وہ ایک قسم کے دیوتا تھے جو پہلے ہمیشہ تھوڑا سا لاڈ پیار کر کے گھر چھوڑ جاتے تھے ــــــــ ! ماں ہی پر ہم کو کھلانے، پہنانے، نہلانے دھلانے اور بہلانے کی ساری ذمّہ داری تھی۔ بارجی ہم لوگوں کو بہلانے کے لیے ایسے طریقے اختیار کرتے تھے کہ جن میں پیسہ بالکل خرچ نہ ہو ــــــــ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ مثلاً وہ مجھے اور گنیش دونوں کو لے کر چھینٹ کے بازار جاتے، اس وقت ہم بیری والے ہوتے اور ہر جگہ سے اپنا منافع بٹورتے۔ بنیے کے یہاں سے گڑ کی ڈلیاں، کنجڑے کی جھابڑی میں کوئی سیب یا آم، حلوائی کی دکان سے برفی یا قلاقند، کیوں کہ بارجی کافی بااثر آدمی تھے اس لیے دکان دار لوگ خوشی سے ہمیں دانہ چرانے تاکہ وہ رشوت نہ معلوم ہو اور میرے ابّا جب تک بازار میں رہتے، یہ ظاہر کرتے گویا وہ دیکھ ہی نہیں رہے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ البتہ جب بازار پیچھے چھوٹ جاتا تو وہ ہم سے کہتے کہ مٹھائیوں کو قاعدے سے رومال میں باندھ لیں اور اس میں سے تھوڑی سی بچا کر "چیز" والے بکس میں رکھ دیں تاکہ کل پرسوں بھی کھائی جا سکے۔ جب افسروں کی میس کے اسٹور روم کا معائنہ کرنے جاتے تو ہم لوگوں کو ضرور ساتھ لے جاتے اور جب اسٹور کلرک ہماری جھولیوں کو چاکلیٹ لیمن ڈراپ اور پیپرمنٹ سے بھرتا ہوتا تو وہ جان بوجھ کر کسی اور طرف دیکھنے لگتے۔

ویسے تو انھوں نے ہمیں یہ سکھایا تھا کہ کوئی بھی کوئی چیز دے تو لینے سے پہلے تین بار انکار کریں لیکن یہ قاعدہ کبھی کبھی توڑ بھی دیا جاتا تھا۔ مثلاً جب بوڑھا خانساماں اللہ بخش جس کی لمبی سی سفید داڑھی تھی، ہم لوگوں کے لیے کیک نکالتا یا میس کے تنور سے گرما گرم تازی ڈبل روٹی لاتا۔ میری اماں تو بیشہ احتجاج کرتی رہتیں کہ گائے کا گوشت کھانے والے مسلمان اور عیسائیوں

کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیزیں نہ کھائی جائیں مگر بارجی اس کو چٹکیوں میں اُڑا دیتے تھے۔
ظاہر ہے کہ ہم کو ان چیزوں کی چاٹ لگ گئی تھی اور بازار یا میں ہر ہفتے پھیرے ہوا کرتے تھے کبھی کبھی ہفتے میں دو بار بھی!

صرف یہی نہیں، میرے دل میں اور بھی اونچی اونچی آرزوئیں تھیں۔ مثلاً یہ کہ ایک دن کپتان اوئن صاحب، بارجی کو ہاکی کے میدان لوا لے جانے کے لیے بگھی میں بیٹھ کر ہمارے دروازے تک آنے والے تھے تو میرا بھی جی چاہنے لگا کہ بارجی کے ساتھ میں بھی بگھی میں بیٹھوں۔ ہرلیش کے ساتھ ایک بار میں ہاکی دیکھنے گیا تھا اور وہاں میں نے صاحب لوگوں کو جھاگ دار شربت پیتے دیکھا تو میرا دل بھی چاہنے لگا کہ میں بھی پیوں!

بارجی کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی کہ میں بھی جاؤں۔ ان کا خیال تھا کہ صاحب کو اچھا نہیں لگے گا۔ لہٰذا انھوں نے کہا کہ میں یا تو ہرلیش کی سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ آؤں یا پھر پیدل ہرلیش کے ساتھ آؤں! میں نے بڑی مسکینی سے ظاہر تو یہی کیا کہ مان گیا ہوں مگر چھپ کر ایک ایسے موڑ پر بیٹھ رہا جہاں سے اوئن صاحب گزرنے والے تھے۔ پھر جب صاحب فٹن چلاتے گزرے تو میں نے ہاتھ اٹھا دیا جس کے معنی تھے کہ میں بھی ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ اوئن صاحب نے اپنے سائیس کو حکم دیا کہ مجھے اٹھا کر کشتی گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھا دے، غالباً انھوں نے مذاق میں کہا تھا، یہ آزمانے کے لیے کہ ڈرتا ہوں یا نہیں۔ جب میں نے ذرا بھی گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا تو انھوں نے مجھے اٹھوا کر اپنے سامنے والی سیٹ پر بٹھا لیا۔ میرے بارجی جب گاڑی میں بیٹھنے لگے تو وہ مجھے وہاں موجود، صاحب کا کمبل اوڑھے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گئے! پھر گھر سے لے کر میدان تک، سارے رستے وہ صاحب سے گٹ پٹ کرتے ہوئے ان کو میری شرارتوں کا حال بتاتے رہے۔

اور مجھے اس شان سے، صاحب کی بگھی میں بیٹھا دیکھ کر رجمینٹ کے تمام لڑکے آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ جب میچ کے بعد مجھے ایک بوتل لیمو بینڈ ملی۔ جھاگ دار، جو میں نے اکیلے ہی پوری پی لی۔ تو مجھے میری فتح بالکل مکمل ہو چکی تھی!

اب گنیش جب کبھی مجھے، دوسرے لڑکوں کے ساتھ پیدل ہاکی میچ دکھانے کے لیے لے جانے کی پیش کش کرتا تو میں اُسے حقارت سے ٹھکرا دیتا۔ اور اگر اوئن صاحب اس دن میچ دیکھنے نہ جاتے ہوتے تو پھر صرف ہرلیش کی پیش کش پر بھی میں سپاہیوں کے ساتھ فٹن میں جانا زیادہ پسند کرتا تھا۔ ٹیم کے کپتان حولدار حیرت سنگھ ایک بار ہمارے یہاں آئے تھے۔ پس میں نے ان سے

دوستی کا نمونہ ہی اور اس رشتے سے میں ان کے ساتھ لگ لیا کرتا تھا۔

مجھے بگھی میں بیٹھنا بہت ہی بھاتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ رجمینٹ کی ٹیم میں یہ عقیدہ پھیل گیا تھا کہ جس دن میں پہلی بار ان کی فنکشن میں گیا اس دن وہ لوگ بہت کامیاب رہے، میرا جانا نیک شگون ہوا تھا۔ چناں چہ میں مستقل ان کا مہمان ہوگیا اور ہر تقریب پر میری موجودگی ضروری ہوگئی! عجیب بات تھی کہ ایک طرف اگر اسی زمانے میں، میں نے گھر میں نحوست پھیلائی تھی تو دوسری طرف میں سورج دیوتا کا خاص الخاص بیٹا سمجھا جانے لگا۔ جو ہر وقت ہنستا ہنساتا تھا، نیک قدم تھا، جس کی حرکات سکنات میں تیزی اور پھرتی تھی اور جس کی زبان مسلسل ٹیں ٹیں کیے جاتی تھی۔

میرا لاڈ پیار اتنا بڑھا کہ میری اترا ہٹ کی کوئی حد نہ رہی۔ اب میرا یہ جی چاہتا تھا کہ خوب باہر گھوموں۔ اور بارجی کے دوست مجھے دیکھیں اور مجھے بہترین بچہ سمجھیں تاکہ میں پھر رجمینٹ کے سارے لڑکوں کے سامنے خوب شیخی بگھار سکوں کہ میں بھی کیا ہی شاندار ننھا ہوں۔ کیوں کہ میرے چھوٹے ہونے کی وجہ سے یہ لوگ مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور مجھے اپنے ساتھ کھلانے سے انکار کردیتے تھے۔

البتہ رجمینٹ والوں کے دُلارے کی حیثیت سے مجھے ایک نقصان بھی تھا اور وہ یہ کہ مجھے ہر وقت باقاعدگی کی تعلیم دی جاتی تھی، کل پرزوں والے کھلونے کی طرح اٹھنا بیٹھنا سکھایا جاتا تھا یا پھر یہ اُمید کی جاتی تھی کہ باقی وقت میں خاموش رہوں، چپکا بیٹھوں، ہلوں جلوں نہیں جیسے کوئی بہت ہی پیاری دُلاری گڑیا۔

بہرحال مجھے اس پیار: اتنا مزا آنے لگا تھا کہ روز صبح اٹھ کر میں بارجی اور راماں سے پوچھتا تھا: "آج میں کہاں جاؤں گا" وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے۔ دل میں تو وہ پرانے وقتوں کے والدین کی طرح لطف لیتے ہوں گے کہ پھر سے ان کا بچپن جی اٹھا اور وہ اس کا مزا اٹھا سکتے ہیں لیکن وہ میرے طفلانہ سوالات کو گول کرجاتے —— کیوں کہ ماں باپ یا بڑوں کا سامنا جب کسی شیطان بچے سے ہوتا ہے تو وہ یہی کرتے ہیں!

رجمینٹ بازار کے پھیرے اور سڑک سے پار ہاکی میچ دیکھنے جانا اور گھومنا جوں جوں بڑھت گیا، میری نظروں کے سامنے، سڑک کی حد سے آگے نئے نئے عالم وا ہوتے گئے جنھیں مجھے فتح کرنا تھا۔ اس لیے میں پورب پچھم اور دکن ہر طرف ہر جگہ کے بارے میں اور بھی شدت کے ساتھ سوالات کرنے لگا۔ میں نے اپنے آنگن میں بیٹھی عورتوں کو گپ شپ کرتے سنا تھا کہ لاہور کے اندر

اور لاہور کے چاروں طرف بڑی خوب صورت جگہیں ہیں جو دیکھنے کے لائق ہیں۔ میں ان جگہوں کے ناموں کو اپنی زبان پر دہراتا رہتا تھا کیوں کہ ان ناموں میں بڑی مٹھاس تھی۔ شاہ عالمی دروازہ، شاہدرہ، نیلا گنبد، انارکلی۔ شالیمار، شیش محل وغیرہ۔

لیکن میں ان جگہوں میں سے کسی جگہ کبھی نہیں لے جایا گیا۔ اور میرا تصور کوشش کرنے کے باوجود بھی ان مقامات کے شاندار حسن کا احاطہ نہیں کر سکتا تھا۔

ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے ایک ہی منظر رہتا تھا، ایک ہی سی روشنیاں دمک اٹھتی تھیں جیسے جادو کی لالٹین ہو یا دھوپ کی روشنی صحرا میں پھیلی ہوئی، کسی بھینگے کو ایک ہی طرح کی ہر جگہ سے نظر آئے۔

میرا خیال ہے کہ میرے باجی اور اماں دو ایک بار گھومنے کے لیے چپکے سے شہر چلے گئے مجھ سے جھوٹ بہانا بنا دیا کہ رشتے داروں سے ملنے جا رہی ہیں میں نے کبھی انھیں اس بات کے لیے معاف نہیں کیا کہ وہ مجھے ساتھ نہیں لے گئے اماں نے تو "چیز" والے بکس میں سے کچھ پھل یا مٹھائیاں دے کر مجھے منا لیا اور باجی نے وعدہ کیا کہ جب انھیں دفتر سے کافی لمبی چھٹی ملے گی تو وہ ہندوستان کی مختلف یاتراؤں پر جائیں گے اور مجھے ساتھ لے چلیں گے۔ ان کے اس کہنے پر اماں کی آنکھیں ایک مخصوص قسم کی مسرت سے چمک اٹھتیں۔ مگر ہمارے لیے یہ وعدہ بے معنی تھا۔ میں برابر باجی سے ضد کیے جاتا کہ میں تو انارکلی اور شالیمار دیکھوں گا اور اس مزے سے ان جگہوں کا نام لیتا کہ باجی کو بھی بڑا لطف آتا اور وہ مجھے آسمانوں تک لے جانے کے وعدے کرنے لگتے۔

پھر میں خوش ہو کر خوب ٹانگیں ہلاتا، اچھلتا اور گول گول چکر کھاتا یہاں تک کہ باجی مجھے پھرکیاں کھانے سے روک دیتے اور کہتے کہ یہ حرکت بہت بری ہے، یہ تو صرف شاہ دولے کے چوہے کرتے ہیں جو احمق اور بے عقل ہوتے ہیں۔

ایک دن باجی نے یکایک اعلان کیا کہ وہ ہم سب کو ایک بہت بڑی نمائش میں لے جائیں گے جو لاہور میں لارنس گارڈن کے منٹگمری ہال میں ہو رہی ہے۔ بڑی لمبی تیاریاں ہوئیں، اماں نے میری آنکھوں میں کاجل لگایا اور مجھے نظر بد سے بچانے کے لیے سیاہی کا ایک ٹیکہ ماتھے پر بھی، اچھے اچھے کپڑے پہنائے مگر قیمتی چیز کوئی اس ڈر سے نہیں پہنائی کہ کہیں چوری نہ ہو جائے پھر ہم سب تانگے میں لد کر نمائش کے ہال میں پہنچے جو ایک باغ کے بیچوں بیچ میں تھا ——— باغ پھولوں، بیلوں اور سایہ دار درختوں سے بھرا ہوا تھا۔

عجب بات یہ ہے کہ نمائش بھر میں جو چیز مجھے آج تک یاد ہے وہ ایک بڑا سا جوتا تھا۔ اتنا بڑا جوتا میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک برآمدے میں ایک اونچے تخت پر رکھا ہوا تھا۔ مجھے اس جوتے میں گنیش کے ساتھ اُتارا گیا، اور مجھے یاد ہے میں نے اس سلطنت پر واحد قبضہ حاصل کرنے کے لیے اپنے بھائی کو دھکا دے کر الگ رکھنے کی کوشش میں جھگڑا کیا۔ آخر کنٹونمنٹ کی بارکوں سے دور، اس نمائش میں آنے اور اس حسین دنیا کو دیکھنے کے لیے سب سے زیادہ ضد تو میں نے ہی کی تھی!

باقی مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ بڑے بڑے کمروں میں گزرے تھے جہاں بھاری الماریوں میں عجیب عجیب طرح کے زیور اور ہتھیار سجے تھے جن کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے میں بار بار الٹتا پلٹتا تھا۔ یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ وہاں اپنی بارک کے کچھ سپاہیوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور میری امّاں نے کہا تھا کہ ان سپاہیوں کی آنکھیں حیرت کے مارے ابلی پڑ رہی تھیں۔ بھلا کانگڑہ، ہوشیار پور کے جنگلی پہاڑوں میں ان لوگوں نے کبھی کاہے کو یہ سب دیکھا ہوگا۔

پھر باغ میں، اپنی ماں کی گود میں چڑھے چڑھے، میں نے جو ملائی کی قلفی کھائی، اس کا مزہ ابھی میں اپنی زبان پر محسوس کرتا ہوں۔

قلفی والا مٹی کے گھڑے میں ہاتھ ڈالتا جو اس کے پاس رکھا تھا۔ فرمائش کے مطابق جست کی بنی بڑی یا چھوٹی قلفی نکالتا، اس آٹے کو کھرچتا جس سے قلفی کے منہ پر ڈھکنا بند ہوتا، پھر ہاتھ سے قلفی کو اس طرح دباتا جیسے بکری کے تھن سے دودھ نکال رہا ہو ——— اور پھر ملائی کی برف ایک پیتل کی کٹوری میں پھسل آتی۔ وہ برف پر تھوڑا سا فالودہ ڈالتا اور چاندی کے گلاب پاش میں سے چند قطرے عرق گلاب کے اس پر چھڑکتا اور گاہک کے سامنے پیش کر دیتا۔ آہ! قلفی والے کی صدا سن کر آج بھی کس طرح دل اچھل پڑتا ہے۔

اس گاڑھی گاڑھی قلفی کے مقابلے میں بہترین ونیلا آئس کریم، گرگرا دینے والی، رنگی ہوئی آئس کریم بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اسے دیکھ کر منہ میں پانی نہیں بھر آتا۔ اس طرح کا شوق اور ہوس دوسری کوئی چیز نہیں پیدا کر سکتی۔

بعض سپاہیوں نے کہا کہ یہاں آنے سے پہلے وہ چڑیا گھر دیکھنے بھی گئے تھے اور وہاں جو جانور ہیں وہ بچوں کے دیکھنے والے ہیں۔ اب تو میں نے بہت ضد کی۔ میں کسی بات سے نہیں مانتا تھا بس یہی کہے جاتا تھا کہ چڑیا گھر کے جانور دیکھوں گا۔

اماں نے بڑی حقارت سے کہا کہ یہ سپاہی جائیں چڑیا گھر اپنے بھائی بندوں کو دیکھنے، بھلا ہمیں وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ بار جی نے کہا کہ عجائب خانہ دیکھنے میں تھک بھی بہت جائیں گے۔ دیر بھی بہت ہو گئی ہے مگر انھوں نے وعدہ کیا کہ پھر کسی دن ضرور آئیں گے۔ اس وعدے پر میں نے زمین سے اٹھنے کا ارادہ کیا جہاں میں ضد کے مارے لوٹ رہا تھا اور چڑیا گھر جانے کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ پھر ذرا میری گردن میں گدگدی کی گئی اور میں ہنسنے لگا۔ ایسی خوشی پھوٹ پڑی جیسے میں آسمان پر پہنچ گیا ہوں۔

میں اپنے بار جی سے وعدہ منوا کر ہی رہا، چناں چہ ایک دن صبح ہم لوگ سچ مچ چڑیا گھر دیکھنے کے لیے فٹن میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ میری اماں کا پیٹ اب کافی نکل آیا تھا اور وہ مجھ کو گود میں نہیں بٹھا سکتی تھیں۔ اس لیے میں ضد کرکے کوچوان کے پاس والی سیٹ پر بیٹھا جو اونچی لٹکی ہوئی تھی اور جس پر سے میں اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا کو دیکھ سکتا تھا۔

ہم لوگ اس سڑک پر روانہ ہوئے جس پر جانا میرے لیے منع تھا، جو ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتی تھی اور جس کا گھیر پہلے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی پار ہی نہیں کیا جا سکے گا، جس پر اونٹوں، خچروں، تانگوں اور بگھیوں کا لامتناہی سلسلہ ہمیشہ قائم رہتا تھا۔ اب میں اس سڑک پر چل رہا تھا! فٹن چلانے والا کوچوان بڑا شاندار راجپوت تھا اس کے دو حصوں میں بٹی ہوئی داڑھی تھی اور اس نے مجھے بتایا کہ ہم نکل کر جس سڑک پر آئے تھے وہ گرانڈ ٹرنک روڈ کہلاتی تھی اور اس کے بعد جس سڑک پر چل رہے تھے اس کا نام ٹھنڈی سڑک تھا۔

نہ جانے کیوں اس سڑک کے ماحول کے ساتھ مجھے لفظ "ٹھنڈی" زیادہ پسند آتا تھا اور لفظ "مال" نہیں اچھا لگتا تھا جو میں نے بعد میں جانا، کیوں کہ دونوں طرف لگے کیکر کے درختوں کی چھاؤں سے اس سکون کا احساس ہوتا تھا جو درختوں کے سائے میں حاصل ہوتا ہے سڑک کے دونوں طرف بنے ہوئے بنگلوں اور باغوں کے مالکوں کو حاصل تھا۔

جیسے جیسے ہم چڑیا گھر کے پاس پہنچتے گئے بھیڑ بھاڑ اور آمد و رفت بڑھنے لگی۔ چوراہوں پر تو خاص کر زندگی ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھی! پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے میں خوشی کے مارے تقریباً مدہوش ہو چکا تھا۔ سیٹ پر بیٹھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ یہ ڈر تک ختم ہو چکا تھا کہ اتنے اوپر سے کہیں گر نہ پڑوں۔ بار جی نے مجھے اتارا، اپنی انگلی مجھے پکڑائی اور دوسرے ہاتھ سے گنیش کا ہاتھ پکڑا۔ پھر ہم بڑے پھاٹک سے داخل ہو کر چھوٹے چھوٹے روشوں پر چلنے لگے جن کے پاس لگے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان جانوروں کے کٹہرے اور پنجرے تھے۔ اُفوہ! کتنے جوش سے میں نے ان

برادری والوں سے ملاقات کی، کیوں کہ میرے بارجی جنگلی جانوروں کو میرے بھائی بند کہہ رہے تھے۔
آہ۔ وہ حیرت بھری چیخیں، وہ تعجب کی صدائیں!
میرے والدین کو سب سے زیادہ تعجب تو اس بات پر ہوا کہ میں نہ شیروں اور چیتوں کے دہاڑنے سے ڈرا اور نہ دوسرے بچوں کے ساتھ ہودے میں ہاتھی پر چڑھنے سے گھبرایا۔ اسی طرح میں نے بندروں کو اپنے ہاتھ سے مونگ پھلی کھلانے میں بھی کچھ خوف ظاہر نہیں کیا۔ اماں مونگ پھلیاں لے گئی تھیں تاکہ بندروں کو کھلائیں کیوں کہ ہنومان جی کی فوج کے سپاہی تھے!
بندروں کے گروہ میں ایک بندریا بیٹھی اپنے بچے کے سر میں جوئیں دیکھ رہی تھی، اور بندر اس کے پیچھے بیٹھا بندریا کی جوئیں دیکھ رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے بڑا لطف آیا کیوں کہ سپاہیوں کی بارکوں میں، میں نے مہترانیوں کو بھی اسی طرح قطار میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی جوئیں صاف کرتے دیکھا تھا۔
گوریلوں کو دیکھ کر میں تھوڑا سا ضرور ڈرا تھا، کیوں کہ وہ انسان سے اتنے ملتے جلتے بھی تھے اور پھر بھی ایسے مختلف تھے۔ وہ اپنے آگے کا دھڑ جھکائے ٹیڑھی ٹانگوں پر چلتے، پنجے پھیلائے سامنے کی طرف گھورتے ایک پنجرے سے دوسرے پنجرے میں جاتے اور سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھتے تو ایسا لگتا کہ بس اب چڑھ بیٹھیں گے!
"بارجی ـــــ کیا جانور بھی بات کر سکتے ہیں؟" میں نے بارجی سے پوچھا۔
"نہیں بیٹا ان لوگوں میں بات کرنے کی قوت نہیں ہے بس تو تے بات کرتے ہیں تمہاری طرح باتونی ہوتے ہیں۔"
"تو کیا تو تے ہم لوگوں کی سی بولی بولتے ہیں، بارجی؟" میں نے پھر پوچھا۔
"ہاں یوں بول تو لیتے ہیں ـــــ پر وہ سمجھتے نہیں کہ کیا رٹے جا رہے ہیں۔" میں اس جواب پر بہت چکرایا۔ میرے بھولے بھالے دماغ میں الجھن سی ہوئی میں چاروں طرف سے ایک راز میں الجھا ہوں اور بے اختیار جی چاہا کہ جو کچھ میں نہیں جانتا وہ سب کچھ مجھے معلوم ہو جائے۔ مجھے جو جواب ملتے تھے ان سے میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا اور میں انجانی باتوں کے متعلق سوچتا رہتا تھا اور تصورات بناتا رہتا تھا۔ دماغ میں عجیب شکلیں صورتیں بنتی تھیں جو گٹھر کی طرح سر پر جمع ہوتی جاتی تھیں۔
پھر میں نے ایک لمبی کردن والا زرافہ دیکھا، ایسا کہ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔

ایک کونے میں کنگارو اپنے بچوں کو پیٹ کی تھیلی میں لیے بیٹھے تھے۔

بھالو تو پرانے دوست لگے ــــــ وہ دوست جسے میں نے مداری کے ساتھ ناچتے دیکھا تھا
خرگوش اور اس کے ننھے ننھے بچوں کو دیکھ کر میرا جی چاہا انھیں پیار کروں۔

اور پنجروں میں بند چڑیوں پر تو مجھے بہت ہی پیار آیا خاص کر اس عجیب اور پیار بھرے طریقے کو دیکھ کر جس سے وہ اپنے منہ کا دانہ اپنے ننھے بچوں کے منہ میں دے رہی تھیں پنجرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اڑ رہی تھیں۔ اور پھر زرد زرد کناریاں اور پدیاں جو درختوں میں جا بجا ٹنگی ہوئی لگتی تھیں۔ اور پھر ان کے ساتھ ساتھ جھوم جھوم کر میں اپنا سر ہلانے لگا۔

چلتے چلتے میرا جسم درد کرنے لگا اور دیکھتے دیکھتے بھی تھکن محسوس ہونے لگی تو میری اماں نے بار جی سے کہا کہ مجھے گود میں اٹھالیں ــــــ مجھے اپنی اماں اس وقت بہت ہی حسین لگیں۔ ان کا زرد چہرہ بہت ہی پیارا لگا جب وہ مجھ پر جھک کر بولیں کہ کیا میں بہت ہی تھک گیا ہوں۔ کیا گود میں آنا چاہتا ہوں ؟

میں اکڑ کے مارے چلتا ہی رہا ــــــ جانوروں کو دیکھتا رہا اور اس عجیب و غریب پرانے پیپل کے درخت کو جس کی شاخیں بہت سے پنجروں پر سایہ کیے تھیں، توتوں کی قینچی سی کتر کتر، فاختاؤں کا کنجوں میں کوکو کرنا، کوئل کا وہ گیت جو میرے لیے مانوس اور جانا پہچانا تھا، یہ سب سنتا رہا اور کہیں نہیں رکا۔ کیوں کہ اس زمانے میں آنکھوں میں ایک ایسا نور تھا جس کی روشنی کبھی بجھتی ہی نہ تھی۔ جسم میں ایسی قوت تھی جیسے جوالا مکھی ہو جو اُبلتا ہی چلا جائے۔

بار جی کو احساس ہوا کہ چڑیا گھر کے لمبے لمبے راستوں پر چلتے چلتے میں ضرور تھک گیا ہوں گا، چناں چہ میں کہتا رہا کہ میں بالکل نہیں تھکا ہوں مگر انھوں نے ایک نہ سنی اور مجھے گود میں اٹھالیا۔ پھر وہ سمجھ گئے کہ میرے دماغ میں اس وقت بڑی اتھل پتھل ہے اور وہ اس سوال سے گھبرا گئے۔ جو میں بار بار پوچھے جا رہا تھا ــــــ "کیا میں بھی یہاں آکر اپنی برادری والوں کے ساتھ رہ سکتا ہوں "؛ چناں چہ انھوں نے مجھے ایک کہانی سنانی شروع کی: "دیکھو!" ایک دن ایسا ہوا کہ جنگل کے تمام جانور اور سب چڑیاں ایک بڑے سے میدان میں جمع ہوئیں۔ اور شیر نے جو کہ جنگل کا بادشاہ ہے ان سب کو بتایا کہ آدمی جنگل میں رہنے کے لیے آیا ہے اور وہ یقیناً ان سب کو نگل جائے گا اگر وہ سب اس کو پہلے نگلنے میں چوک گئے "۔

"لیکن وہ کیوں ان سب کو نگل جاتا ؟" میں نے پوچھا۔ مجھے لفظ "نگل" بہت پسند آیا۔

کیوں کہ انسان جانوروں کو بندوق سے مار سکتا ہے اور ان کی جان نکال کے اس طرح ان کو نگل سکتا ہے۔ جیسے تم ہڈی کو چبا ڈالتے ہو اور نگل جاتے ہو۔"

اب مجھے لفظ "نگل" کی گھن گرج سے ڈر لگنے لگا۔ لیکن ہمت کر کے بولا "ہاں تو پھر کیا ہوا!"

"تو پھر یہ ہوا کہ آدمی پہلے ہی سے جنگل کے بادشاہ کی باتیں سن رہا تھا تو اس نے بندوق نکال اور تمام جانوروں کو گولی سے اڑا دیا ——— تو تم اگر یہاں آنا چاہتے تو پہلے تمھیں اپنی بندوق لانی پڑے گی۔ ورنہ سب جانور مل کر تمھیں نگل جائیں گے۔"

میں ایک دم سے رونے لگا۔ اماں بگڑنے لگیں "بھئی ——— کیوں اسے ایسی کہانیاں سنا سنا کے ڈراتے ہو۔"

بارجی ہنسنے لگے اور مجھے چپ کراتے ہوئے بولے "اچھا اچھا بیٹا، اب تجھے نہیں ڈراؤں گا۔"

میں نے فوراً اپنے ہاتھ کا انگوٹھا اپنے منہ میں ڈال لیا بارجی کی گود میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے۔ ان کے بازوؤں میں جھکورے کھاتے ہوئے مجھے ایسا لگنے لگا کہ سامنے پھیلے ہوئے باغ میں نہیں ہوں بلکہ جھٹپٹے کا وقت ہے اور کسی گھنے جنگل کے کنج میں ہوں۔ چاروں طرف چلتے ہوئے، راستوں پر آتے جاتے ہوئے، مرد اور عورتیں، ایک ریشمی، رنگین، پانی کی چادر کی طرح بہتے ہوئے معلوم ہوتے تھے لیکن میرے کانوں میں جانوروں کے کراہنے چیخنے اور توتوں کی ٹیں ٹیں کے سوائے کچھ نہیں سنائی دیتا تھا۔　　　(ملک راج آنند کے ناول "سات سال" سے اقتباس)

---

(صفحہ ... مضمون)

... سے بڑی صحبتوں میں ہماری اور خود اپنی نمائندگی کر سکتے تھے۔ شعر و ادب سے ان کا ذوق ... تھا اور شعر و ادب کے رنگ و رفتار پر حکیمانہ نظر رکھتے تھے۔ اچھی اور بے تکلف انگریزی لکھتے تھے جو ... ان کے عہد کے ہندوستانیوں میں بہت کم ملتی ہے ان کی قدر کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا۔ شعر و شرافت کے جو لوگ اہل یا قدر داں تھے وہ تمام کے تمام خواہ ہندوستان کے کسی گوشے میں ہوں، بلا مرحوم سے واقف اور ان کی خوبیوں کے معترف تھے۔

مرحوم ان لکھنے والوں میں تھے جن کا قائل نہ ہونا کم سواد ہونے کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ یک رنگی اور توازن ہو۔ وہ ہم سے جدا ہو گئے لیکن ہمارے بعد آنے والے ان سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ یقین ہے فردوس میں ان کو وہ رنگینیاں اور زینتیں بھرپور نصیب ہوں گی جن کی صرف جھلکیاں ان کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں۔

(... رشید احمد صدیقی ... "... نما" سے ...)

# شراب کہنہ

# غالبؔ

۱۷۹۷ء ——————— ۱۸۶۹ء

نام :- اسد اللہ بیگ خاں، عرف میرزا نوشہ، پہلا تخلص اسدؔ، دوسرا غالبؔ، نجم الدولہ دبیر الملک بہادر نظام جنگ خطاب۔ تورانی النسل، آباء و اجداد کا تعلق ترکوں کے مشہور قبیلہ ایبک سے تھا

غالبؔ کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے پہلے لاہور میں ٹھہرے اس کے بعد دہلی آگئے، دونوں جگہ ان کو عزت منصب اور توقیر حاصل رہی، غالبؔ کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں دہلی میں پیدا ہوئے تھے ان کی شادی آگرے میں ہوئی تھی اور غالبؔ کی پیدائش بھی آگرے کی ہے۔ پانچ برس کے سن میں باپ ایک لڑائی میں مارے گئے، چچا نے سر پر ہاتھ رکھا تھا کہ تین چار برس بعد وہ بھی وفات پا گئے ——— ننہال والے خوش حال تھے وہیں غالبؔ کی اطمینان اور فراغت کے ساتھ پرورش ہوئی۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں مولوی محمد معظم سے پڑھیں اس کے بعد ایک نومسلم عالم عبدالصمد کو دو برس تک اپنے گھر رکھ کر تعلیم حاصل کی۔ مطالعے اور تلاش و تحقیق سے تمام عمر شغف رہا

دس گیارہ برس کی عمر سے اردو میں شعر کہنے لگے تھے۔ چودہ برس کے اندر تقریباً دو ہزار اشعار کا ایک مجموعہ فراہم ہو گیا تھا یہ محسوس کر کے کہ اس ذخیرے میں اپنا رنگ کم اور بیدلؔ وغیرہ کی تقلید زیادہ ہے ان میں سے تھوڑا سا کلام انتخاب کر کے باقی یونہی چھوڑ دیا تھا، جو ۱۹۲۱ء میں "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے طبع ہوا)

تیرہ برس کی عمر میں دہلی کے نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی بیٹی امراؤ بیگم سے شادی ہوئی، دو تین سال بعد دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ مگر اس طرح کہ عمر بھر کرائے کے مکانوں میں رہے، سات اولادیں ہوئیں مگر سال سوا سال سے زیادہ کسی کو زندگی نصیب نہیں ہوئی۔

غالبؔ کا مزاج شاہانہ، معاشرت رئیسانہ مشغلے اور حوصلے بڑے دولت مندانہ تھے ابتدائی دور میں تو یہ شوق اور اخراجات پورے ہو جایا کرتے تھے مگر آگے چل کر اس روش کو نبھانا اور ضرورتوں

کو پورا کرنا مرزا کے لیے دشواری اور فکر مندی کا سبب بن گیا۔ اس کی خاطر ان کو حکومت روٴسا اور حکام کی مداحی کرنا پڑی وظیفہ بحال کرانے کے لیے سعی و سفارش میں سرگرداں رہے، سفر کی زحمتیں، زیر باریاں اور بہت سی خلاف طبیعت باتیں برداشت اور گوارا کرنا پڑیں۔ کشمکش حیات، نامساعد حالات اور طرح طرح کے افکار کے باوجود ان کے مزاج، معاشرت اور شاعری تلخی، تنگی، اور بے زاری یا قنوطیت نہیں حاوی ہونے پائی۔ محبت مروّت، رواداری، وضع داری، رکھ رکھاؤ اور دوست داری میں کوئی فرق نہیں آسکا۔ طبعی ظرافت سے انھوں نے ہر موقع پر کام لیا اور زندہ دلی نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ ان کی اہم ضرورتیں اور شوق کون کون سے تھے اور وہ کس طرح پورے کیے جاتے تھے ان کے بارے میں خود ہی تحریر فرماتے ہیں "...... کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام ——— قرض لیا جاتا تھا۔" اور اسی قرض کے آزار میں وہ مرتے دم تک گرفتار رہے،

غالب نے اپنی ذات اور زندگی کے بارے میں تمام ضروری اور سچی سچی باتیں اپنے مکتوب میں قلمبند کر دی ہیں ——— دعویٰ اور ناز ان کو اپنی فارسی شاعری اور فارسی دانی پر تھا مگر ان کی شہرت اور عظمت کا باعث ان کے وہ خط ہیں جو انھوں نے اردو میں لکھے اور وہ اٹھارہ سو شعر ہیں جو ان کے اُردو دیوان میں پائے جاتے ہیں۔ اُن کی نام آوری اور مقبولیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کا اُردو دیوان ان کی زندگی میں چار بار چھپا اس کے بعد سے اب تک اس کے سیکڑوں ایڈیشن نکل چکے ہیں ——— ان کے منتخب اشعار کے معانی اور مطالب اور پورے دیوان کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ عبدالرحمان چغتائی نے مصوّر ایڈیشن بھی (مرقع چغتائی) شائع کیا۔ ملکی اور غیر ملکی زبانوں اور مختلف رسم خط میں اردو کے کسی شاعر کا کلام اگر ملتا ہے تو وہ صرف دیوان غالب ہے، اس طرح ان کے خطوط کے مجموعے "عود ہندی" اور "اُردوئے معلیٰ" ان کی زندگی سے لے کر آج تک متعدد بار چھپ چکے ہیں ان کے علاوہ سیکڑوں غیر مطبوعہ خطوط اور رقعات مطبوعہ شکل میں سامنے آچکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

غالب کے یہاں دقت نظری اور مشکل پسندی کے ساتھ ساتھ ایسے شعروں کی بھی کمی نہیں ہے جو ہر خاص و عام کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں، ان کا سا تنوع، خیال آرائیاں، ندرت، مضمون آفرینی، دل کش ترکیبیں، نئے نئے استعارے اور تشبیہیں، مخصوص انداز بیان، کیف اور سرمستی کسی اور کے یہاں کم ہی ملے گی۔ ان کے تلامذہ، مداحوں اور قدر دانوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آج بھی لکھا جا رہا ہے۔ ان کی تعریف میں مولانا حالی کی "یادگار غالب" فخر عرفی و طالب کہہ کر چھپ ہو گئے

مگر عبدالرحمان بجنوری نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں — وید مقدس اور دیوان غالب"۔

غرض اس عظیم شخصیت اور باکمال شاعر نے اپنی زندگی کے آخری دن نہایت ناخوش گوار حالات میں بسر کیے اور ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو راہیٔ ملک بقا ہو کر درگاہ نظام الدین کے قریب مدفون ہوا۔ جہاں اس کی یاد میں ایک چار دیواری کے اندر چھوٹا سا خوش نما مقبرہ تعمیر کرا دیا گیا ہے۔

## انتخاب

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

بصورتِ تکلف، بمعنی تاسف — اسد میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا — بے کسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے — رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق — ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اے آرزو شہیدِ وفا، خوں بہا نہ مانگ — جز بہرِ دست و بازوئے قاتل، دعا نہ مانگ

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن — بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

دیر و حرم، آئینۂ تکرارِ تمنا — واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟ — انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

قفس میں، مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہستی کے فریب میں نہ آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

---

جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

---

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

---

سر پر ہجوم دردِ غریبی سے ڈالیئے — وہ اک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے

---

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں — پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

---

آتش افروزیٔ یک شعلۂ ایماں تجھ سے — چشمک آرائیٔ صد شہرِ چراغاں مجھ سے

---

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھائیے

---

ناکردہ گناہوں کی بھی، حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

---

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

---

(باقی ۳۲ کا)

اس سے استفادہ کر سکتے ہیں جنھیں قرآن فہمی کا شوق ہے۔ یہ قاعدے مختلف ابواب پر مشتمل ہیں ان کی ترتیب میں طالب علم اور معلمین دونوں کی سہولت پیش نظر رہی ہے۔ ہر سبق میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو کوئی دقت محسوس نہ ہو۔

شاہزادی صاحبہ قابلِ مبارک باد ہیں کہ وہ اس قسم کے قاعدے لکھ کر نہ صرف ایک بڑی ضرورت کو پورا کر رہی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تبلیغ قرآن کا بھی مفید اور اہم فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ امید ہے تبلیغ قرآن کا یہ سلسلہ آئندہ بھی قائم رہے گا۔

یہ قاعدے گجراتی رسم الخط میں لکھے ہوئے ہیں۔ (مدیر)

# نئی مطبوعات

| کتاب | مصنف | قیمت | ناشر |
|---|---|---|---|
| کلام جوہر | مولانا محمد علی جوہر | ۲/- | کتب خانہ نذیریہ، دہلی ۶ |
| مثنوی بو علی شاہ قلندر | حضرت شاہ شرف الدین بو علی شاہ | ۱/- | ″ ″ ″ |
| سوانح عمری مولانا روم | شبلی نعمانی | ۴/- | ″ ″ ″ |
| درد بڑھتا گیا (ناول) | جی۔ ایس۔ عالم | ۳/- | مکتبہ آشیانہ، دہلی |
| رات اور چنگاری (″) | عارف مارہروی | ۳/- | ″ ″ ″ |
| آگ میں پھول (″) | اے۔ حمید | ۲/۵۰ | مشورہ بک ڈپو، دہلی |
| غم زندگی (″) | دت بھارتی | ۲/۵۰ | ″ ″ ″ |
| جس راہ سے جاتا ہوں (ناول) | جمیل انجم | ۲/۵۰ | ″ ″ ″ |
| کرسٹن کیلر (″) | پردیپ | ۲/۵۰ | ″ ″ ″ |
| سفید شیطان دوم (″) | مضطر ہاشمی | ۲/۵۰ | ″ ″ ″ |
| جمیلہ بوپاشا (″) | مادام جلبی یارا بیٹ لا | ۳/- | ادبی دنیا، دہلی |
| کوثر (″) | ابن حیات | ۴/۵۰ | ″ ″ ″ |
| نیلی نوٹ بک (″) | وی۔ قزاقیوم | ۲/۲۰ | آزاد کتاب گھر، دہلی |
| سوشلزم حال اور مستقبل | کے۔ ایم۔ موم جان | ۱/۲۰ | ″ ″ ″ |

(بقیہ خبریں)

بی۔ اے۔ آنرز کے سپیشل کورس کے بھی ۲۵ فی صدی ہوا کریں گے۔ ڈگری کورس کے دو امتحان ہوں گے ایک دوسرے سال کے آخر میں اور دوسرا تیسرے سال کے آخر میں ہوا کرے گا۔

## چودہ زبانوں کا سنگم

بھارتی سنگم کے زیر اہتمام دہلی میں اگلے سال تک ایک ایسی سہ منزلہ عمارت بن رہی ہے جس میں ہندوستان کی چودہ مسلّمہ زبانوں کے ادب ایک سنگم پر آکر گلے مل جائیں گے۔ اس عمارت کے لیے حکومت نے چنکیہ پوری میں ۱۵ ایکڑ زمین دی ہے۔ اس عمارت میں ایک گردش کرنے والا تھیٹر، ایک کمرہ سیمنار کے لیے، ایک نمائش ہال، ایک لائبریری اور ۱۴ زبانوں کی تعلیم و مطالعے کے لیے ۱۴ کمرے ہوں گے۔ سنگم ادب کے ذریعے جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## سات سال

مصنف:۔ ڈاکٹر ملک راج آنند
ترجمہ:۔ رضیہ سجاد ظہیر
صفحات:۔ ۵۱۲ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد
قیمت:۔ پانچ روپے ۲۵ نئے پیسے
ناشر:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

ملک راج آنند کی کتاب Seven Summers ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ہندوستان کے بچپن کی کہانی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک ہندوستانی بچہ کیسے محسوس کرتا ہے اور کیا سوچتا ہے۔ کیسے ماحول میں پرورش ہوتی ہے وغیرہ۔ اس کہانی میں ملک راج کے حقیقت نگار قلم نے ہندوستان کے معصوم اور اصلی روپ کی جھلکیاں، مغرب کو دکھائی ہیں اور بڑی صداقت، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ دکھائی ہیں جس کی توقع اُن جیسے پختہ دست اور طباع صناع سے ہی کی جاسکتی ہیں۔ اِس کہانی کا ہیرو ایک بچہ ہے جو اپنی چار پانچ برس کی عمر سے لے کر لگے سات سال تک کی زندگی کے تاثرات و واقعات سُناتا ہے۔ یہ بچہ ایک معمولی بابو کا بیٹا ہے جو نوشیرہ چھاؤنی میں پلتا بڑھتا ہے اور پہلی جنگِ عظیم کے آغاز پر اس کے بچپن کی یہ کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

ملک راج کی اس کہانی کو "سات سال" کے عنوان سے رضیہ سجاد ظہیر نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ رضیہ صاحبہ ہماری ایک مقبول و معروف قلم نگار خاتون ہیں۔ ان کی زبان بڑی رواں اور سلیس ہوتی ہے۔ "سات سال" میں نہ صرف اُن کے قلم کی روانی آگئی ہے بلکہ ان کی زبان کا چٹخارا بھی موجود ہے۔ ترجمے کی بُو باس کا کیا سوال، "سات سال" نے خود ایک دل کش تخلیق کی شکل اختیار کرلی ہے۔ "سات سال" کے اندر رضیہ صاحبہ کے لہجے کو پہچاننے میں ذرا تکلف نہیں ہوتا، مثلاً

"ابا، اماں سے کچھ ہمدردی کرنے کے انداز میں کہتے۔ جائیں مریں سسرے۔ ہمیں اُن سے کچھ نہ چاہیے۔ ہمارے بڑھاپے کے لیے ہمارے پاس کافی ہے" ص ۲۷۹ "مجھے کچھ کھانے کی دھک ملی تو سوکھا

لکھتا آ گیا۔ نانا نے جواب دیا۔ آؤ فضلو آؤ، سر آنکھوں پر آؤ مٹ۲۹۸ نانا سے ملنے کی آتا ؤلی پڑی ہوئی
ی مٹ۲۹۴ لیکن ان کی زبان کا یہ مٹھاس اور یہ لوچ کہانی کو نوشیرہ کی سنگ لاخ سرزمین سے
رے ہٹا کر لکھنؤ کے قریب بھی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ان کے مخصوص لب و لہجے کا لطف
ے کی چیز بن کر رہ جانے کے امکانات بڑھا دیتا ہے۔

اس گمان سے قطع نظر، بہر حال ملک راج آنند کی یہ تصنیف ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے
اُردو ادب میں بھی، سات سال، ایک منفرد اضافے سے کم نہیں۔

کتابت، طباعت، صاف ستھری اور گرد پوش معقول ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری



## گالی ہندؤں کی اُردو خدمات

از: شانتی رنجن بھٹاچاریہ

صفحات ۲۹۶، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

قیمت: پانچ روپے

سن اشاعت ۱۹۶۳ء

ملنے کا پتا: ۲/۱/E ، اشوک نگر ریجنٹ پارک کلکتہ ۴۰

اہل بنگال کی علم دوستی اور ہنر پروری کسی تعارف و تشریح کی محتاج نہیں، ایک مدت سے یہ خطہ علم و
کا مرکز اور فنون لطیفہ کا گہوارہ ہے۔ اسی مردم خیز صوبے کے ایک اُردو نواز، افسانہ نگار و فاول
اور با ہمت فرد ہیں بابو شانتی رنجن بھٹاچاریہ جنھوں نے "بنگالی ہندؤں کی اُردو خدمات" لکھ کر
ے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو زبان (جس کی مقبولیت کے منحرف اور حقیقت
ر بھی اسی ملک میں موجود ہیں) سے بنگالیوں کا پرانا واسطہ ہے اور اس کی توسیع و قدر افزائی
ن کی خدمات بھی قابل لحاظ ہیں۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں مؤلف نے اپنے حیدرآباد (دکن) کا قیام، اُردو کی
افسانہ نویسی کا شوق، بنگالی ہو کر اُردو میں لکھنے کی وجہ سے لوگوں کا تعجب، طبع زاد کہانیوں
و ترجمے کا گمان اور مغالطے اس کے باوجود ایک تاریخی و تحقیقی کتاب لکھنے کا عزم، دوا دوش
ان میں ان مرحلوں سے مستقل مزاجی کے ساتھ گزر لینے کے بعد کتاب کی طباعت و اشاعت
بالآخر حکومت ہند اور حکومت (مغربی) بنگال کی اعانت و امداد۔ غرض تصور سے لے کر
تک کی روئداد بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ "اپنی باتیں" سنا کر بنگال کی مختصر تاریخ، ہندو مسلم

اتحاد، انگریزوں کی آمد، پریس کی ابتداء، اُردو صحافت، فورٹ ولیم کالج اور آخر میں "اُردو زبان اور بنگالی ہندو" ان تمام عنوانات پر نہایت خلوص اور غیر جانب دارانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے حصّے میں اُن بنگالیوں کے مختصر اور تفصیلی حالات اور تصویریں ہیں جو نہ صرف اُردو بلکہ عربی فارسی سے بھی واقف تھے اور ان زبانوں میں بھی انھوں نے کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ راجا رام موہن رائے، تارنی چرن متر، جادب کرشنا دیب مشفق، جنم جے، قرار نان، راج کرشنا دیب راجا ان بزرگوں کے نام اور ان کا ذکر تو ہم کو جا بجا تاریخ اور تذکروں میں مل جاتا ہے لیکن غنی صحیح اور تفصیلی معلومات بھٹّاچاریہ صاحب نے فراہم کی ہیں اور کسی جگہ ملنا مشکل ہے، ان کے بارے میں لکھتے وقت بعض اہلِ قلم حضرات سے جو سہو اور فروگذاشتیں ہوگئی ہیں ان پر بھی لائق مولّف نے توجہ دلائی ہے۔

کم و بیش اسّی کی تعداد میں فاضل بنگالیوں کے حالات و کوائف پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ صحافت شاعری، تذکرہ نگاری، ترجمہ، قواعد دانی اور لغت نویسی ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر ان اصحاب نے قلم نہ اٹھایا ہو جس کے بارے میں جو بات نہیں معلوم ہوسکی اس کا بھی دیانت داری کے ساتھ اعتراف کرلیا گیا ہے اور امید دلائی گئی ہے کہ تلاش و تحقیق کے بعد آئندہ اڈیشن میں اس کمی کو پورا کیا جائے گا۔ خدا کرے کہ مؤلف اپنے ان ارادوں میں کامیاب ہوں۔

یوں تو ہر علم دوست سے اس کی توقع کرنا چاہیے کہ وہ اس کتاب کو پڑھے گا اور خوش ہوگا لیکن وہ ادارے اور افراد جن پر اُردو کی سرپرستی لازم اور اردو میں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی واجب ہے، اُن کو خاص طور پر ایسے وسائل بہم پہنچانا چاہئیں جس سے اس کتاب کے نکلنے میں تاخیر نہ ہوتا کہ اس کا دوسرا ایڈیشن سامنے آسکے جو اس کے مقابلے میں کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی بہتر و خوش نما ہو۔

رشید نعمانی

✡

## "سب رس زور نمبر"

نگراں: پروفیسر عبدالمجید صدیقی، معتمد محمد اکرام الدین صدیقی

صفحات: ۳۹۴ سائز: ۲۰×۲۶/۸

قیمت سالانہ چھ روپے

ملنے کا پتہ: ایوانِ اُردو، حیدرآباد، دکن ۴

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم ہماری زبان و ادب کے ایک گراں قدر ادیب، نقّاد مصنف اور مؤلف تھے، ان کی وفات سے اُردو دنیا کو جو ناقابل فراموش نقصان اور صدمہ پہنچا

اس کا اعتراف اور اظہار ملک کے تمام مشہور و معروف اخباروں اور رسالوں میں موجود ہے پھر بھی
ضرورت تھی کہ اُردو زبان و ادب کے اتنے بڑے خدمت گزار کی زندگی اور کارناموں کو سر دست یک جا
کر دیا جائے تاکہ آج یا کل مرحوم کی شخصیت یا کارناموں کے بارے میں اگر کوئی کچھ جاننا یا لکھنا چاہے
تو اس کو وہ مواد یا مسالہ آسانی سے میسر آجائے۔ سب رس جو ڈاکٹر زورؔ مرحوم کے اپنے ادارے
(ایوانِ ادب) کا ایک قابل قدر رسالہ ہے اس کو یہ حق سب سے زیادہ پہنچتا تھا۔ اس نے یہ حق
ادا کیا اور حسن و خوبی سے ادا کیا۔

اس نمبر کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں وہ مضامین، مقالے اور منظومات ہیں جو دوسروں نے
ڈاکٹر زور مرحوم کی شخصیت فن اور ان کی رحلت سے متاثر ہو کر لکھے ہیں۔ دوسرے حصے میں مرحوم کی
۴۰ سال کی مسلسل ادبی کاوشوں کا بہت مختصر انتخاب، جو ان کے صدہا مکتوبات ۲۰۵ مضامین اور
۵۰ کتابوں (جن میں ایک انگریزی اور ایک فرانسیسی زبان کی کتاب بھی شامل ہے) میں محفوظ و
موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت فن اور وفات پر ۴۳ حضرات و خواتین اور ۱۵ شعرائے کرام
نے اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کیا ہے ان میں دور حاضر کی بہت سی ایسی مقتدر اور معروف شخصیتیں بھی
ہیں جن کی تحریر، بیانات اور اقوال اکثر حیثیتوں سے سند اور حوالے کا کام دیں گے۔ جناب رشید احمد صدیقی
سید بادشاہ حسین، ڈاکٹر نارنگ، سیدہ جعفر، احتشام صاحب، نظر مرحوم، مہندر سنگھ بیدی نصیر الدین
ہاشمی، ڈاکٹر گیان چند، خلیق انجم، اکبرالدین صدیقی حضرت محرومؔ (تلوک چند) جگن ناتھ آزاد اور ان کے
بہت سے شاگرد، ارادتمند اور رفقائے کار نے جو کچھ لکھا ہے ان کے بعد پھر ڈاکٹر زور کی زندگی، حالات
خدمات، علمی صلاحیت، انتظامی قابلیت اور ادبی کارناموں کے بارے میں شاید ہی کوئی گوشہ یا نکتہ
تشنہ یا باقی رہا ہو جس سے واقفیت نہ ہو جاتی ہو۔

رسالے میں ایسے بہت سے Portraits اور Photo Groups فوٹوگروپس
شامل ہیں جن کو دیکھ کر مرحوم کی زندگی کے مختلف دور، مشاغل اور یادگار اجتماعات کی یاد تازہ
ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ ادارہ ادبیات اُردو کا یہ خصوصی اور یادگار شمارہ بہت سی حیثیتوں سے مفید اور کارآمد
ہے۔

رشید نعمانی

**لسان القرآن**
**منہاج القرآن**

مؤلفہ: شاہزادی خدیجہ بنت سیدنا ڈاکٹر سیف الدین طع
قیمت: فی کتاب: ۷۵ نئے پیسے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳

یہ قاعدے ان بچوں کے لیے لکھے گئے ہیں جنہوں نے عربی مضمون لے رکھا ہے یا ایسے لوگ

(باقی ص ۲۶ پر)

# ادبی خبریں

مرتبہ: ظل عباس عباسی

## گیتوں کا انسائیکلوپیڈیا

ٹائمز آف انڈیا میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حکومت ہند ہندوستانی عوامی گیتوں کا ایک انسائیکلوپیڈیا شائع کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سنسکرت، بدھ مت اور جین دھرم کے قصّے کہانیاں اور دیومالائی داستانوں کی ایک فہرست مضامین بھی شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس انسائیکلوپیڈیا کا کام شروع بھی ہو گیا ہے۔

## زبان کے مسئلہ پر خودکشی

پریس ٹرسٹ آف انڈیا اس خبر کا ذمہ دار ہے کہ مدراس کے ایک ۲۷ سالہ نوجوان شری چناسوامی نے زبان کے مسئلہ پر اپنی جان دے دی۔ کہا جاتا ہے کہ شری چناسوامی نے ترچی ریلوے اسٹیشن پر دو گیلن پٹرول اپنے جسم پر چھڑک کر آگ لگالی۔ متوفی کے کاغذوں میں ایک خط پولیس کے نام ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ جنوب پر ہندی کو لادے جانے کے خلاف احتجاجاً جان دے رہا ہے۔

## اردو مذاکرہ اور نمائش کتب

دلی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے زیرِ اہتمام ۹ اور ۱۰ جنوری ۱۹۶۴ء کو اُردو ادب کے سلسلے میں مستشرقین کی خدمات کے عنوان سے ایک "اردو مذاکرہ" (سمپوزیم) منعقد ہوا۔ دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سی۔ ڈی دیشمکھ نے "مذاکرے" کا افتتاح فرمایا۔ اس مذاکرے کے سلسلے میں کتابوں کی نمائش کا انتظام دلی یونیورسٹی لائبریری کی وساطت سے کیا گیا تھا جس میں اُردو کے مایہ ناز مستشرقین و اساتذہ شعبۂ اُردو کی تصانیف پیش کی گئی تھیں۔

## تھرڈ ڈویژن کا خاتمہ

معلوم ہوا ہے کہ دلّی یونیورسٹی نے ۶۴ء سے تھرڈ ڈویژن کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہائر سکنڈری کے امتحان میں ۴۰ فی صدی سے کم نمبر پانے والے طلبہ کا داخلہ بی اے میں نہیں ہو گا۔ آئندہ سے بی۔ اے اور

باقی ص ۲۷ پر


| سالانہ چندہ ایک روپیہ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ | فی پرچہ ۱۰ نئے پیسے |
|---|---|---|

پرنٹر و پبلشر سید احمد دہلوی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

نگراں
غلام ربانی تاباں

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

مدیر
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۵ | مارچ ۱۹۶۴ء | شمارہ نمبر ۳

# اشاریہ

کتاب نما کے پچھلے شمارے کے اشاریے میں ہم نے مکتبہ جامعہ کی سستی کتابوں کی ایک نئی سیریز کا ذکر کیا تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ سستی کتابوں کی اشاعت کے اس اعلان کا ہر جگہ خیر مقدم کیا گیا۔ جیسا کہ پچھلی بار عرض کیا تھا، اس سلسلے میں ان کتابوں کو پیش کیا جائے گا جو ہمارے ادب میں مسلمہ حیثیت رکھتی ہیں اور زبان و ادب کے لحاظ سے شاہ کار مانی جاتی ہیں اور جن میں کسی وجہ سے زبان کی صحت قائم نہیں رہ سکی ہے۔ مکتبہ جامعہ کی یہ کتابیں ترتیب اور تصحیح کے لحاظ سے ہر طرح مکمل ہوں گی۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب "باغ و بہار" کتابت کی منزلوں سے گزر رہی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس سلسلے کی ہماری یہ پہلی کتاب جلد منظر عام پر آجائے گی۔
مکتبہ جامعہ کی عام کتابوں میں دو نئی کتابوں کا اضافہ اس ماہ میں ہو رہا ہے ان میں سے پہلی کتاب ہے مجنوں گورکھپوری صاحب کی "غزل سرا" (اردو) جو اردو غزل گو شعراء میں ۱۲ مشہور شعراء کی غزلوں پر تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اور دوسری کتاب ہے کرتار سنگھ دگل کے ڈراموں کا مجموعہ "اوپر کی منزل" جو پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے یہ دونوں کتابیں بھی جو اردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں، ہماری دوسری کتابوں کی طرح پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے انتہائی افسوس ہو رہا ہے کہ ۲۲-۲۳ فروری کی درمیانی شب میں ساڑھے بارہ بجے کے کچھ ہی بعد جامعہ ملیہ کے ایک اور ہمدرد اور حیاتی رکن کا انتقال ہو گیا۔
خواجہ حافظ فیاض احمد پانی پتی مرحوم جن کی پیدائش ۱۸۸۷ء میں ہوئی تھی، علی گڑھ مسلم اورینٹل کالج کے ان اساتذہ میں سے تھے جو ۱۹۲۰ء میں اس کے قیام کے پہلے ہی دن جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک معلم کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اب سے چھ سات سال قبل تک جامعہ کے کئی اہم اور ذمہ دار عہدوں پر سرفراز رہے۔
آپ نے بچوں کے لیے کئی کارآمد کتابیں لکھیں اور بچوں کے ایک ادبی ماہنامے "سنگم" کا جو بعد میں "سنگم سبھا" کے نام سے بھی شائع ہوا۔ اجراء فرمایا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے آمین۔

مرتبہ: مخمور سعیدی

# غزل کا مستقبل

(ہم کتاب نما کے جنوری ۹۴ء کے مخصوص شمارے میں "غزل مستقبل کی شاعری نہیں ہے" کے عنوان کے تحت جناب ڈاکٹر عبدالعلیم، جناب آل احمد سرور، جناب سید سجاد ظہیر، جناب راجندر ناتھ شیدا، جناب ڈاکٹر محمد حسن اور جناب گوپی ناتھ امن کے مقالات اور تقریریں شائع کر چکے ہیں۔
پچھلے دنوں دہلی کی ایک ادبی محفل "سنگم" کی ماہانہ نشست میں اس عنوان پر کچھ اور اظہار خیال ہوئے ہیں۔ ہم کتاب نما کے اس شمارے میں "سنگم" کی نشست میں پڑھے جانے والے مقالات اور تقریروں میں سے جناب علی جواد زیدی، نکہت صاحبہ، جناب رشید حسن خاں اور جناب گوپال متل کے خیالات ماہنامہ "تحریک" دہلی کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ (مدیر)

## علی جواد زیدی

اُردو ادب میں غزل کو ہمیشہ سے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جو شاعر غزل گو نہ ہوتا اس کو ابتدائی تذکرے شاذ ہی قابلِ ذکر مانتے۔ بعد کے تنقید نگار بھی جب اُردو شاعری کی بات کرتے تو غزل کے آگے سوچ نہ پاتے۔ یہاں تک کہ اسی بنیاد پر لکھنؤ اور دلّی کے دو اسکول بنا دیے گئے اور طرفہ تماشہ یہ تھا کہ یہ اسکول غزل کے نہیں بلکہ اُردو شاعری کے اسکول کہلائے جانے لگے۔ اگرچہ موجودہ صدی نظموں کی حیثیت سے سامنے آئی لیکن ہمارے ناقدوں نے چکبست اور صفی جیسے نظم گویوں تک کو ایک اعتبار سے نظر انداز کیا۔ وہ زیادہ تر غزل گویوں ہی کے بارے میں سوچتے اور لکھتے رہے۔
حالی اور آزاد نے مروّجہ غزلیاتی شاعری کے رجحانات کے خلاف آواز ضرور اٹھائی لیکن یہ تنقیدی یلغار سیاسی اصلاح پسندی کا نتیجہ تھی۔ ان کے دور میں نظم گوئی کی ابتدا ہی ہو پائی۔

نظم کی باقاعدہ تنقید کا سوال کون اُٹھاتا۔ نظم تو ایک طرف، قدیم مثنوی یا مرثیہ کی طرف بھی ان ابتدائی ناقدین نے وہ فنی توجہ نہ کی جن کے یہ اصناف مستحق تھے۔ شبلی نعمانی نے "موازنۂ انیس و دبیر" لکھ کر اس اہم خلا کو پُر کرنے کی پہلی مشکور کوشش کی لیکن یہ انھیں کی ذات تک محدود رہی۔ "شعر الہند" اور "گلِ رعنا" اگرچہ مکتبۂ شبلی ہی کی تخلیقیں ہیں لیکن ان میں بھی مختلف اصناف سخن کی تاریخی اور ادبی اہمیت کا متوازن احساس مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

ادھر چند دنوں سے صورت حال بدلی ہے۔ مثنویوں، مرثیوں، قصیدوں، رباعیوں، قطعوں پر کچھ کام ہونے لگا ہے، لیکن یہ تحقیقی اور تاریخی نوعیت کا ہے۔ نثر پر تو گویا کام ہوا ہی نہیں ہے۔ صحافت کی تاریخ پر کچھ ضرور لکھا گیا ہے لیکن ان سب میں فنی ادراک کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا آج تک اگر بھرپور فنی تنقید سے استفادہ کرنے کا کسی صنف کو موقع مل پایا ہے تو وہ صرف غزل ہے ہماری تنقید آج بھی ـــــ اور ادبی تاریخ بھی ـــــ اُردو ادب کے ہمہ جہاتی تصور سے ناآشنا ہے اور جب تک ہمارے ناقدین میں تنقیدی ہمہ گیری نہ آئے گی، غزل کے بارے میں ہمارے بہت سے غیر متوازن اور نتیجۃً ناسائنسی تصورات بھی قائم رہیں گے۔

میں اس بات کو پہلے ہی صاف کر دوں کہ میں کلیم الدین احمد کی طرح غزل کو "نیم وحشی صنفِ سخن" قرار نہیں دیتا لیکن میں مذکورہ بالا صورتِ حال کو بھی ادب دوستی قرار دینے سے معذور ہوں۔ یہ میرا یقین ہے کہ غزل ہی تمام شاعری نہیں ہے۔ میرے خیال میں اپنے حدود کے اندر نظم گویوں کے اکتسابات غزل گویوں سے پست تر درجے کے نہیں ہیں۔ موجودہ صدی کی اچھی نظموں کے علاوہ، قدیم ادبی ذخائر میں بھی اچھے واسوخت، اچھے قصیدے، اچھی مثنویاں، اچھے مرثیے اور اچھی رباعیاں موجود ہیں اور خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اردو تنقید کے جس پیمانے سے بھی ناپیے ان اصناف کی لطافت غزل سے کم نہیں۔ ہاں، غزل ہی کی طرح ان میں بھی رطب و یابس بہت ہے۔ اچھے عناصر کو چھانٹنا اور پرکھنا پڑے گا اور یہی وہ کام ہے جو ابھی تک نہیں ہوا ہے یا ہوا ہے سرسری اور جزوی طور پر۔ اس صورت حال کا کوئی جواز نہیں ہے۔

بعض حضرات نظموں اور دوسری اصناف سخن کو غزل کے پیمانے اور غزل کو نظموں اور وہ بھی دوسرے ممالک کی نظموں کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ یہ طریق کار غلط ہے۔ مختلف اصناف کا خالص موضوعی تعریف سے بھی کام نہیں چلنے کا۔ مثلاً غزل کے تصور میں عہد بہ عہد دور بہ دور تغیرات رونما ہوتے رہے ہیں۔ کبھی اس میں عشق کی محرومیوں کا گداز ملتا ہے اور کبھی ہوس کی ظاہر پسندی

کا ساز کبھی اسے تصوف نے ماورائیت دی ہے اور کبھی سیاست نے ارضیت بخشی ہے کبھی اسے
اخلاقی اقدار کے پرتو نے مفلس کے چراغ، اور "طوق زریں" کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا ہے
کبھی زبان محاورہ، تشبیہات، تلمیحات اور صنائع و بدائع پر زور رہا ہے اور کبھی تمثیل و تخیل پر۔
کبھی رمزیت ہی سب کچھ تھی، کبھی بندش کی چستی یا ترکیبوں کی شستگی ہی سے غزل اچھی یا بری
سمجھی جاتی رہی ہے۔ یہی حال نظموں مثنویوں حد یہ ہے کہ مرثیوں تک رہا ہے۔ ہم نے ابھی تک
ان اصناف کی روح تک پہنچنے اور ان تمام فنی رموز و محرکات تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی
ہے لیکن غزل کی گفتگو ہر زبان پر پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے۔ یعنی لوگ اسے اس وقت بھی پسند
کرتے تھے جب موجودہ نظموں کے سانچے وجود میں نہیں آئے تھے اور اس وقت بھی پسند کر رہے
ہیں جب کہ ساری دنیا کی نظمیں کم از کم ترجمہ ہو کر ہمارے سامنے آ چکی ہیں۔ کیا یہ ادیب و سامع
کی سہل پسندی ہے یا غزل کی سخت جانی۔ آخر ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ غزل ہمارے تہذیبی
مزاج کا اہم ترین عنصر بن چکی ہے اور اگرچہ اس میں کافی تقلیدی عناصر موجود ہیں پھر بھی بحیالعتہٗ
تقلیدی نہیں ہے۔

بعض حلقوں میں غزل کی "واپسی" اور غزل کے مستقبل کے سوال بھی اٹھائے جاتے ہیں۔
غزل ترک تو کبھی نہیں ہوئی تھی اور نہ اس کی عوامی مقبولیت زندگی کی آخری منزلوں میں پہنچی
تھی۔ ہاں ماضی قریب میں نظم کا کارواں آگے ضرور بڑھا تھا۔ آج مجھے یہ کارواں پسپا ہوتا نظر آ رہا
ہے۔ اگر اخبارات و رسائل اور منظوم مطبوعات سے اندازہ لگانے پر اعتراض نہ ہو تو گزشتہ
دہائی میں نظم گوئی کی رفتار یقیناً سست پڑ گئی ہے اور بہت سے پرانے اور مانے ہوئے
نظم گو بھی غزل پر جھک پڑے ہیں۔ اس میں بہت کچھ ہماری اس سوفی صدی سیاسی تنقید کا
بھی ہاتھ ہے جس نے نظم کے فنی عناصر کی تعین نہ ہونے دی۔ سیاسی مطابقت، واحد
خوبی اور سیاسی انحراف، واحد ستم و قبح بن گیا آج لوگ اس غلطی کو محسوس کر چکے ہیں اور
میں ان زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا جو مندمل ہو چلے ہیں، لیکن آج بھی ہماری تنقید نظم کے
ادبی محاسن کی فنی تشکیل و تعمیر کی اہم خدمت سے جی چراتی ہے۔ مختصر لفظوں میں صورت حال
یہ ہے کہ نظم کے خالص ادبی پیمانے واضح طور سے سامنے نہیں ہیں اور نسبتہً غزل کے
جمالیاتی نقوش واضح تر ہیں، اس لیے لوگ غزلوں کی طرف مڑ پڑتے ہیں۔ اور اس میں
بھی شک نہیں ہے کہ نظم سے غزل کی طرف فرار میں کچھ سہل پسندی کو بھی دخل ہے کیوں کہ

سیاسی چمک دمک سے عاری ہو کر نظم کی فن کاری اور صناعی ویسی آسان چیز نہیں رہ گئی جیسی اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں سمجھی جانے لگی تھی۔

آپ کہیں گے کہ میں غزل سے زیادہ نظم کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے بے چین نظر آتا ہوں۔ اس سے آپ یہ مفہوم نہ نکالیں کہ میں غزل کے حسن کا منکر ہوں۔ میں غزل کی صلاحیتوں کا قائل اور اس کے جادو کا معترف ہوں بلکہ میں نے تو کئی سال عالم الحاد میں گزارنے کے بعد پھر فرار اختیار کی ہے۔ غزل کے دامن کی وسعت بھی بہت بڑھی ہے اور اب یہ صرف معشوقوں سے بات کرنے والی صنف نہیں رہ گئی ہے۔ پھر، معاف کیجیے گا، بیسویں صدی کے معشوق بھی تو بدل گئے ہیں۔ لیکن غزل کی سیاسی یا سماجی معنویت سے مطمئن ہو جانا مناسب نہیں ہے۔ یقیناً بہت کچھ ہے جو غزل کے دو مصرعوں میں سما نہیں سکتا اور جسے نظم ہی اپنے دامن میں سمیٹ سکتی ہے میں غزل کے متوالوں سے خواہ مخواہ اُلجھنا نہیں چاہتا لیکن اُردو شاعری کے پرستاروں سے یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ نظم کا آفاقی پیمانہ بھی کم حسین نہیں ہے۔ اس کو اپنائے بغیر اور اس کی فنی تکمیل کیے بغیر اُردو شاعری ادب عالم میں اپنا مقام نہ پا سکے گی

غزل نازک صنف سخن ہے۔ اس کا اپنا ایک مزاج اور ایک تاریخ ہے۔ یہ اپنے لیے ایک جگہ بنا چکی ہے۔ لیکن ماضی میں بھی یہ کئی بار افراط و تفریط کا شکار ہو چکی ہے اور آج بھی فلموں اور مشاعروں کی بدولت اس کی جو مٹی پلید ہو رہی ہے اُس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ سچ ہے کہ ارباب ذوق اس ذخیرہ کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے لیکن اب تو یہ وبا اخباروں اور رسالوں تک میں پہنچ چکی ہے۔ غزل کے اختصار، ابہام، رمزیت، معنویت کو برتنے کی بجائے اگر "واہ واہ" کے شور اور "فلمی کالی رقم" کے زور میں یہ طرحداری بھی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی تو ہماری اس عزیز صنف سخن کا کیا حال ہوگا؟ اس لیے ہمیں صرف اس سے خوش نہیں ہونا چاہیے کہ آج غزلیں بہت زیادہ لکھی جا رہی ہیں اور ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کر لی ہے۔

غزل اور نظم میں توازن کی ضرورت ہے۔ جو ادب نظم سے کلیتہً چشم پوشی ہے یا نظم کو کم رتبہ سمجھتا ہے، اس کے اساسی نظریوں میں کہیں کوئی خامی ہے اور وہ ہماری تنقید اور یک رخی تنقید کی پیدا کردہ ہے۔ ضرورت ہے کہ غزل کے علاوہ جو دوسری اصناف سخن ہیں ان کو اپنایا جائے اور ان کے فنی محاسن و معائب کا سائنسی جائزہ لیا جائے۔ اور پھر ان کی روشنی میں

دوسری زبانوں کے اکتسابات کو اپنے قومی اور ادبی مزاج کے مطابق منظومات میں سمویا جائے تبھی اس ادبی عدم توازن کا خاتمہ ہوسکے گا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔

غزل اور نظم ہی کے درمیان توازن قائم کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی جو صرف تفریح طبع کا سامان بن جائے یا ایک خاص حلقہ کی چیز۔ ہمارے ادب میں غزل و نظم کی بھرمار اور افسانہ و ناول کا جو طومار ہے اُس کے مقابلے میں مفید اور ضروری سائنسی ادب ناپید ہے۔ ہم ہر طبقے ہر عمر، ہر مزاج کی تسکین کا سامان نہیں کر رہے ہیں۔ بچوں، جوانوں، بوڑھوں، عورتوں، مزدوروں، تاجروں، سیاست دانوں، کارخانہ داروں، طالب علموں اور مختلف پیشوں کی ضرورت کا ادب نہیں پیدا ہو رہا ہے۔ ہر زبان کو ایک حد تک خود کفیل ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی خدمت کرنے والے برگشتہ خاطر ہو جائیں گے اور ان زبانوں کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہوں گے جو روزمرہ کی ضرورتیں مہیا کر سکے۔ روزنہ اخبارات ہفتہ وار اور ماہوار رسائل سے لے کر عام مطبوعات تک ایک عدم توازن قائم ہے اور ہمارے ادیب اور نقد نگار ان کوتاہیوں پر نظر نہیں کرتے بلکہ "غزل" کے مستقبل کی طرح کے جزوی مسائل میں ہی الجھے ہوئے ہیں

کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم کس قسم کے ذہن کی تشکیل کر رہے ہیں؟ کیا ہم نے غور کیا ہے کہ ہم پڑھنے والوں کو کن نعمتوں سے محروم کیے ہوئے ہیں؟ بظاہر میرے ان سوالوں کا نفسِ مضمون سے براہِ راست تعلق نہیں ہے لیکن یہ غزل کی پکار، یہ نظم اور افسانے کا شور و غل ہمارے ادب کو جو نقصان پہنچا رہا ہے اُس سے آنکھیں موڑ لینا بھی کس طرح مناسب نہیں۔ "غزل کا مستقبل" بھی زبان کی صالح ترقی پر ہی منحصر ہے۔

## نکہت فرید احمد

غزل کی پچھلی زندگی پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانے کے حالات کے ساتھ ہمیشہ بدلتی رہی ہے۔ حالی سے لے کر موجودہ دور تک غزل کے اسلوب بیان اور موضوعات میں بار بار تغیر ہوتا رہا۔ حالی کے بعد اُردو غزل ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ اگرچہ وقتی اثرات کے تحت اس زمانے میں نظم سے زیادہ دل چسپی لی گئی لیکن جن شعرا نے اس کے بعد بھی غزل کی حسین دنیا کو خیرباد نہیں کہا۔ ان کے یہاں بھی موضوعات اور انداز بیان دونوں میں ایک نمایاں فرق نظر

آئے گا۔ نئے زمانے اور نئے ذہن نے غزل کے اندر نئے جادو جگائے۔ اسے نئے اشارے دیے اور اس کی ایمائیت اور اشاریت میں اضافہ کیا۔

موجودہ دور میں جب نظم کی ہیئت کو بدلنے کے لیے مختلف تجربے ہو رہے ہیں اور پرانی روِش زیادہ پسند نہیں کی جاتی۔ اس وقت بھی وہ شعرا زیادہ مقبول ہیں۔ جن کے یہاں روایت اور تجربے دونوں کو خوب صورتی کے ساتھ سمویا گیا ہے۔

ان باتوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غزل میں جہاں نئے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت ہے وہیں وہ متاثر کرنے کی بھی زبردست صلاحیت رکھتی ہے۔

انسانی مزاج میں اثر قبول کرنے کی بنیادی صلاحیتیں مشترک ہیں پچھلا ادب اس پر گواہ ہے۔ پانچ ہزار برس کی انسانی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ وہ تخلیقات جو انسانی نسل کے دور اوّل میں ہوئیں۔ جیسے یونانی ڈرامے اور سنسکرت کی لافانی تخلیقات جن میں خارجی مسائل سے زیادہ انسان کی داخلی اور ذہنی کشمکش کی نمائندگی ملتی ہے، وہ ہمیں آج بھی عزیز ہیں اور ہم کو ان میں ذہنی ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ اس سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جب تک انسانی نسل کی موجودہ خصوصیات بالکل نہ بدل جائیں، جس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، اس وقت تک وہ اصنافِ شاعری باقی رہیں گی جن میں اثر آفرینی کی صلاحیت ہے خصوصاً غزل جس کی اثر آفرینی اور نشتریت سے اس کے مخالفوں کو بھی انکار نہیں۔ وہ اپنی محدود دنیا میں اتنی وسعت رکھتی ہے کہ ہر دل اس کے زیر و بم میں اپنی دھڑکن محسوس کر سکتا ہے۔ عشق و محبت کے نازک جذبات کے اظہار کے لیے غزل جیسی لطیف اور تہہ دار صنف کا ہی سہارا لیا جا سکتا ہے۔

مستقبل صنعتی زندگی سے گراں بار ہوگا۔ اس سے بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ غزل کا جادو مستقبل میں نہیں جگایا جا سکے گا۔ کیوں کہ مشینی عہد میں انسانی مزاج میں داخلی اثرات قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن یہ حضرات اس پر غور نہیں کرتے کہ درحقیقت مستقبل ہی میں غزل کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ اقبال کے الفاظ میں مشینوں کی حکومت دلوں کے لیے پیامِ موت ہے۔ مشینوں کی حکومت کا آنا بھی ضروری ہے۔ اس لیے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ادب اور آرٹ کے ان محرکات کو زندہ رکھا جائے جو انسانی مزاج کو مشینوں کے بے رحم ہاتھوں سے محفوظ رکھیں، ان میں جذبے کی نرمی اور خلوص کی گرمی،

پیدا کرتے رہیں اور دل گداختہ و چشم نم کی کارفرمائیوں کو باقی رکھیں۔ غزل سے زیادہ اس فرض کو کون انجام دے سکتا ہے، جس کی ساری کائنات ہی سوز دروں سے عبارت ہے۔ مشینوں سے بوجھل فضا میں انسانی ذہن کی ناآسودگی اور تھکاوٹ کا تصور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت اسے رنگ و نور کی کس قدر ضرورت ہوگی۔ یہ رنگ و نور فنون لطیفہ کی حسین وادیوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

یہاں پر غزل کے لغوی معنی کی طرف بھی ذہن جاتا ہے۔ عورتیں اس کی خاص مخاطب ہیں۔ ان کے جذبات کو متحرک کرنے کا وہ بڑا ذریعہ رہی ہے۔ عشق کے سوز و گداز کی بھرپور تصویر ان کو غزل کے سوا اور کسی صنف سخن میں نہیں ملے گی۔ اس اثر انگیزی اور دل ربائی نے ان کو بھی اپنے دام میں گرفتار کرلیا۔ بہت سی شاعرات ہیں جنھیں نسبتہً کم لوگ جانتے ہیں وہ اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے غزل ہی کی طرف متوجہ ہوئیں، اس لیے کہ وہ اسی کی طرف متوجہ ہوسکتی تھیں۔ غزل پر بحث کرنے والوں کو یہ پہلو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہندوستانی عورت کے مزاج میں شرم و حیا کے جو نسلی عناصر ہیں ان کے زیر اثر وہ بے محابا اظہار جذبات نہیں کرسکتی۔ وہ اشاروں کی زبان ہی میں کچھ کہہ سکتی ہے۔ اس کی نزاکتِ احساس اور شرافتِ خیال، تفصیلی کہانیوں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے وہ صرف غزل ہی میں اپنے احساس و جذبات کی داستان سنا سکتی ہے اس طرح کہ بات بھی پوری کہہ دی جائے اور برہنہ حرف نہ گفتن کا احترام بھی رہے۔

جس طرح ایک عورت بے محابا اظہار خیال نہیں کرسکتی اسی طرح وہ حسن و عشق کے کھلے ڈلے بیان کو بھی نہیں سن سکتی۔ اس کی لطافتِ طبع اور نزاکتِ احساس اس تفصیل کی روادار نہیں ہوسکتی جس کے روادار دوسرے ہوسکتے ہیں۔ اس سے جو کچھ کہا جائے وہ بھی اگر اشاروں کی زبان میں ہو تب ہی اس کی پذیرائی ہوسکتی ہے۔ غزل کی اشاریت اور ایمائیت سے ہی کام لیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ غزل کے مخالف ہیں وہ ہندوستانی عورت کے مزاج کے ان بنیادی عناصر کو فراموش کرجاتے ہیں۔

غزل کا حسن اور جادو ایسا نہیں کہ فنا ہوجائے۔ اس کا ایجاز، اس کی ایمائیت اور اشاریت کچھ مہینوں یا چند برسوں کی محنت سے نہیں حاصل کی گئی ہیں۔ یہ تو صدیوں کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔ روایت کے اس طویل سلسلے سے اگر قطع تعلق کرلیا جائے تو یہ ایک غیر طبعی امر

ہوگا۔ کیوں کہ صدیوں کی حاصل کی ہوئی دولت کو محض اس لیے چھوڑ دینا کہ وہ سرمایہ پُرانا ہوگیا ہے، عقل مندی نہیں ہے۔ اس بات پر سب ہی نقاد متفق ہیں کہ روایت کو قطعی طور پر چھوڑ کر کوئی ادب آگے نہیں بڑھ سکتا۔ روایت اور تجربے کا توازن ہی اچھا ادب پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے غزل کی کلاسیکی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں مناسب تبدیلیاں ہر زمانے میں کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح اس کی بنیادی خصوصیات کو بھی باقی رکھا جاسکتا ہے اور اسے زمانے کے مطابق ڈھالا بھی جاسکتا ہے

غزل میں تبدیلیوں کی باتیں اکثر کی جاتی ہیں۔ میں یہاں واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ غزل میں مستقبل میں بھی کسی بنیادی تبدیلی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اردو غزل کا رشتہ فارسی غزل سے ہے، فارسی غزل کی بے شمار اور بے مثل روایتوں کو اردو غزل نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ اس طرح اس کی حیثیت عطر مجموعہ کی ہے۔ اب یہ ایک مکمل صنف ہے، جس کے اپنے آداب ہیں اور اپنی خاص روایتیں۔ اس لیے اس میں کسی بنیادی تبدیلی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

رہی موضوعات کی تبدیلی، سو وہ ہمیشہ ہوئی ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، یگانہ اور فراقؔ کے یہاں آپ کو عہد بہ عہد کے بدلتے ہوئے لب ولہجے کا واضح احساس ملے گا۔ اس لیے یہ بات قطعیت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے کہ غزل کی تبدیلی صرف لب ولہجہ کی تبدیلی ہوگی اور یہ ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ غزل کے لیے جتنی گنجائش پچھلے دور میں رہی ہے اتنی ہی آئندہ بھی رہے گی —— یہ بت ہزار شیوہ ہے اور اپنے دام میں دلوں کو ہمیشہ اسیر کرتی رہے گی۔

## رشید حسن خاں

یہ سوال کہ کیا غزل میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مستقبل میں بھی ماضی کی طرح جذبات واحساسات کے اظہار کا ایک مقبول ذریعہ بنی رہے، انسانی مزاج کی بعض بنیادی خصوصیتوں کی طرف توجہ مبذول کر دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک انسانی مزاج کی یہ خصوصیات باقی ہیں، غزل بھی باقی رہے گی۔

یہ خیال بالکل درست ہے کہ غزل پوری شاعری نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے کسی دور میں بھی انکار نہیں کیا گیا۔ ماضی کے شعری سرمائے میں غزل کے ساتھ ساتھ بے شمار قصیدے، مثنویاں، قطعات اور رباعیاں بھی شامل ہیں۔ یہ اصناف ان تمام شاعروں کے کلیات میں موجود ہیں جو غزل کے مسلم الثبوت استاد سمجھے گئے ہیں۔ گویا غزل دوسری اصناف سخن کی طرف متوجہ ہونے میں کبھی حائل نہیں ہوئی۔

لیکن جیسا کہ میں نے کہا بعض موضوعات ایسے ہیں جن کی صرف غزل ہی متحمل ہو سکتی ہے۔ بعض موضوع تفصیل کی بجائے اجمال اور اختصار کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض خیالات اور احساسات اپنے اظہار کے لیے برہنہ گوئی کی بجائے علامیت اور رمزیت کے پیرایوں کے طالب ہوتے ہیں۔ اور زبانوں کا مجھے علم نہیں لیکن اُردو اور فارسی میں ایسے تمام موضوعات کے اظہار کا ذریعہ غزل ہی رہی ہے۔ غزل کی اشاریت کی بدولت نفس واقعہ کی تلخی خوش گوار ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے اور یہ وصف کسی دوسری صنف سخن میں بمشکل ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایجاز و اختصار کی تکمیل غزل سے زیادہ اور کوئی صنف نہیں کر سکتی

غزل کی ایک اور قابل قدر خصوصیت جس میں اور کوئی صنف اس کی شریک نہیں یہ بھی ہے کہ اس کی علاماتی زبان، بدلتے ہوئے احساسات کے ساتھ ساتھ خود اپنا مفہوم بھی تبدیل کر لیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ مفہوم محض قاری یا سامع کے ذہن میں موجود ہوتا ہے جسے وہ غزل کی بلیغ معنویت اور اس کی سحرکارانہ اثر آفرینی کے تحت ان علامتوں میں منتقل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا کوئی شعر جو آج سے سو برس پہلے کہا گیا ہو آج کے کسی واقعے پر اتنی جزئیات کے ساتھ منطبق ہو سکتا ہے کہ نفس واقعہ کی پوری معنویت اس میں سمٹ کر بہہ جائے۔

بعض لوگ غزل پر پریشاں نگاری کا الزام لگا کر اسے ہدف ملامت بناتے ہیں اور اس کی صحت کے لیے مسلسل غزل کا نسخہ تجویز کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی بات وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جن کی نظر سطحی اور ذہن کوتاہ ہو۔ مختلف لمحوں کے مختلف احساسات کی ترجمانی اس منفرد خیال نگاری کے ذریعہ ہی ممکن ہے جو غزل کا خاصہ ہے۔

میرے خیال میں بحث اس پر ہو سکتی ہے کہ شاعری یا ادب کا کوئی مستقبل ہے یا نہیں۔ یہ بحث قدرے عجیب ہے کہ غزل کا کوئی مستقبل ہے یا نہیں۔ ادب کو اس طرح

خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اگر ہماری شاعری کا کوئی مستقبل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ غزل صرف ماضی کی یادگار بن کر رہ جائے۔

## گوپال متل

اس پر سب متفق ہیں کہ غزل ایک صنف سخن ہے، پوری شاعری نہیں۔ اس کے مخالفین بھی غالباً اتنے بے خبر نہیں ہوں گے کہ انھوں نے ایسا سمجھ کر اس کی مخالفت کی ہو۔ دراصل ان کا اختلاف صرف غزل کے اسلوب سے نہیں اس کے بنیادی مفہوم سے ہے۔ حالی اور جوش کی شاعری کا اسلوب غزل کا اسلوب ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غزل کے اسلوب کے مخالف نہیں ہیں۔

غزل گوئی ایک تہذیبی شغل ہے اور مولانا حالی نے غزل ہی کیا تمام تہذیبی مشاغل کی مخالفت کی ہے۔ وہ بیٹر بازی وغیرہ کو بھی بہت برا سمجھتے تھے۔ شاعروں کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اور داخلی جذبات کی ترجمانی کو وہ تضیع اوقات سے زیادہ کوئی حیثیت دینے کو آمادہ نہ تھے۔

غزل کی مخالفت، غزل تک محدود نہیں۔ یہ ایک پورے تہذیبی مزاج کی مخالفت ہے وہ سب چیزیں جو صنعتی نظام کی تکمیل میں معاون نہ ہوں غیر ضروری ہیں یا ضرر رساں ہیں۔ یہ خیال بعض دوسرے ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے اور کچھ ملکوں میں تو یہ بھی ہوا کہ شاعروں کو حسب منشا شاعری نہ کرنے کی پاداش میں، ان کی شاعرانہ حیثیت ختم کر کے دوسرے "مفید" کاموں پر لگا دیا گیا۔

میرے خیال میں صنعتی نظام میں اتنا دم ضرور ہے کہ وہ شاعروں کی اعانت کے بغیر اپنے تکمیلی مراحل طے کرتا رہے۔ پھر ہر معاشرے کی تشکیل تقسیم کار کے اصول پر ہوتی ہے، کسی کو گندم اگانا ہوگا، کوئی مکان بنائے گا اور کوئی ہماری لطف اندوزی کے لیے غزل سرائی کرے گا جب شاعر نے کہا تھا کہ ع

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

تو اس کے سامنے حقیقت یہی تھی۔

فنون لطیفہ کا آغاز انسانی تمدن کے اس دور میں ہوا جب انسان غاروں میں رہتا

بستا تھا۔ اس عہد کے بوڑھوں نے جو بقائے وجود کی جدوجہد میں کوئی سرگرم رول ادا کرنے کے اہل نہیں رہے تھے اپنے وجود کا جواز اس میں دیکھا کہ ان لوگوں کی تفریح کا کوئی سامان پیدا کریں جو اس جدوجہد میں سرگرم ہیں اور ان کے کفیل بھی۔ چناں چہ انھوں نے غاروں کو طرح طرح کے نقش و نگار سے آراستہ کرنا شروع کیا تاکہ تلاش رزق میں نکلے ہوئے لوگ جب تھکے ہارے غاروں کو واپس ہوں تو غاروں کی خوش نمائی ان کے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون اور فرحت بخش سکے۔ دوسرے فنون لطیفہ کی طرح ہر مہذب سماج میں شاعری کی افادیت بھی یہی رہی ہے کہ اس نے دنیاوی علائق میں پھنسے ہوئے لوگوں کی ذہنی اور روحانی تسکین کا سامان پیدا کیا ہے ہمارے یہاں یہی فریضہ غزل نے انجام دیا ہے اور یہ اس کی بہت بڑی افادیت ہے غزل ہمارا ایک تہذیبی کارنامہ ہے۔ ہمیں اس پر شرم نہیں۔ فخر کرنا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری ذہنی مرعوبیت اس منزل پر پہنچ چکی ہو کہ ہم کرکٹ میں اپنی دل چسپی کے اظہار میں مسرت محسوس کریں اور تپنگ بازی کو مطعون قرار دینے لگیں۔

صنعتی سماج ایک بے جان قسم کی یکسانیت پیدا کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ انسان کے معنوی وجود کے لیے مفید ہوگی یا مضر؟ اقبال نے کہا تھا ع

احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

یہ بات اب مغربی مفکرین بھی کہہ رہے ہیں اور وہاں ایسے اداروں کی حوصلہ افزائی ہونے لگی ہے جو افادیت کے میکانیکی مفہوم کے علمبردار نہ ہوں۔ حتیٰ کہ روس میں بھی اب یہ خیال جنم لے چکا ہے کہ شاعری کلیتہً افادی پیرنہیں ہو سکتی۔

غزل پر ایک بڑا الزام یہ ہے کہ اس میں جنسی معاملات کی ترجمانی کو غیر ضروری اہمیت دی گئی ہے اور اس میں یہ خطرہ ہے کہ آدمی تعیش پسندی اور بے غیرتی کا شکار ہو جائے۔ یہ خیال بنیادی طور پر غلط ہے ۱۸۵۷ء سے پہلے کا معاشرہ غزل کا معاشرہ تھا۔ غدر کے خونیں واقعات میں اس معاشرے کے افراد نے جس بے جگری اور غیرت مندی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ مردوں نے بے آبروئی کے خیال سے پہلے اپنے خاندان کی عورتوں کو قتل کیا اور پھر خود مقابل کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے مقابلے پر دوسرا معاشرہ ۱۹۴۷ء سے قبل کا معاشرہ تھا جو مولانا حالی کی اصلاحی اور اخلاقی نظموں کا پروردہ تھا۔ میرا روئے سخن کسی خاص طرف نہیں لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں یہ مناظر عام پر دیکھے گئے کہ لوگ اپنی ماؤں بہنوں بیٹیوں کو

غیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی جان بچانے کو بھاگ کھڑے ہوئے۔ جذبۂ عشق کی اہانت انسان کی بنیادی جبلتوں کو بے وقار کرنے کے مترادف ہے اور انھیں جبلتوں میں غیرت مندی بھی شامل ہے۔

انگریز حکمرانوں کی بنیادی ضرورت اطاعت شعار کلرکوں کی ایک کیمپ تیار کرنا تھا۔ شاعر والہانہ افتادِ طبع کے حامل ہوتے ہیں، محبوب کو دیکھ کر خوش ہوئے، غزل کہہ دی، حکومت سے خفا ہوئے، ہجو لکھ دی، ظاہر ہے کہ یہ جذباتی مزاج حکمرانوں کے لیے کچھ زیادہ سازگار ثابت نہ ہوسکتا تھا لہٰذا اس کی مخالفت محض اصلاح کیشی یا عقلیت پسندی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس میں حکومتِ وقت کی خوشنودی بھی مدِ نظر رہی ہوگی۔ انسانی جذبات میں جنسی جذبہ خاص طور پر انسان کو بے قابو کر دینے والا ہوتا ہے۔ اسی لیے تمام آمروں نے پہلا حملہ اسی جذبے پر کیا ہے صرف فاشی جرمنی ہی میں محبت جرائم کی فہرست میں شامل نہیں تھی۔ کیمونسٹ روس اور چین میں بھی یہ جرائم کی فہرست میں شامل ہے۔ وہاں آپ مشینوں سے تو محبت کر سکتے ہیں لیکن کسی عورت سے نہیں جذبہ ایک جگہ فنا ہوگا تو ہر جگہ فنا ہو جائے گا۔

داغؔ کے عشق کو بالعموم طور پر بازاری قرار دیا جاتا ہے لیکن آپ ان کا ایک مقطع سنیں وہ کہتے ہیں ؎

داغؔ آوارہ کو لے یار ترے کوچے سے — اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

داغؔ کو اپنے بازاری محبوب کے ساتھ بھی اتنی وابستگی تھی کہ اپنی آوارہ منشی کے باوجود اس کے کوچے میں اس طرح معتکف ہوئے کہ انھیں وہاں سے کھینچ کر ہی لانا پڑا۔ اتنی وفا تو لوگ اپنی بیویوں سے بھی نہیں کرتے۔

داغؔ نے اپنے پانچ معاشقوں کا ذکر کیا ہے، ان میں ایک عشق منی بائی حجاب کا تھا جسے انھوں نے اپنی منکوحہ بنایا اور دوسرا عشق خواجہ معین الدین چشتیؒ کا۔ جوشؔ صاحب نے اپنے اٹھارہ معاشقوں کا اعلان کیا ہے۔ ان میں کسی ولی اللہ کا نام تو کجا کسی منکوحہ کا نام بھی نہیں۔

غزل پر ایک اور الزام پریشاں نگاری کا عاید کیا جاتا ہے اور اس کے عدمِ تسلسل کو بہت بڑا عیب قرار دیا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مکمل یکسوئی عملاً کتنی دیر ممکن ہے؟ جب زندگی میں مکمل یکسوئی اور یک جہتی ممکن نہیں تو غزل کے لیے اسے کیوں ضروری قرار دیا جائے؟

غزل لوگ کہتے ہیں کہ غزل کی عمارت صرف ردیف اور قافیے کے سہارے کھڑی کی جاتی ہے۔ شاعر پہلے کاغذ پر کچھ قافیے لکھ لیتا ہے اور پھر انہیں باندھتا چلا جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی بہت بڑا الزام ہے۔ فکر سخن کے لیے کوئی نہ کوئی نقطۂ آغاز ضرور ہوتا ہے اور یہ ایک لفظ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا کوئی لفظ خواہ وہ قافیہ ہی ہو آپ کو کسی بھولے بسرے تجربے کی یاد دلانے میں معاون نہیں ہو سکتا؟

غزل کی مخالفت یا بے خبری میں ہوتی ہے یا ان لوگوں کی طرف سے جو کسی سوچی سمجھی سکیم کے مطابق انسانی سرشت کی بنیادی خصوصیتوں کو فنا کر کے اسے بے جان کٹھ پتلی بنا دینا چاہتے ہیں۔

جاگیردارانہ سماج میں کج کلاہی کی اور بھی بہت سی صورتیں تھیں جو اب باقی نہیں رہی ہیں اس لیے موجودہ صنعتی سماج میں غزل کی ضرورت اور اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ غزل کا مستقبل تابناک ہو گا یا تاریک، میں نہیں کہہ سکتا۔ تاریخ میں بہت سے حادثے پیش آئے ہیں اور آ سکتے ہیں لیکن میں یہ آرزو ضرور کر سکتا ہوں کہ غزل کا مستقبل تابندہ تر ہو۔

---

ص ۲۲ کا بقیہ

کمرے میں ایسا سکوت چھا گیا کہ اگر سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔

پہلے وہ کبھی اس طرح اچانک نہ آتا تھا۔ ہمیشہ دور سے ہی کھانستا، تاکہ سب لوگ سنبھل جائیں ـــــ اسی لیے اس وقت سب لوگ یوں سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے جیسے چڑیا کے گھونسلے میں دفعتاً باز گھس آیا ہو!

اس نے دزدیدہ نظروں سے سب کی جانب دیکھنا چاہا، لیکن اُسے یوں لگا جیسے اتنے سالوں تک ان کی طرف دھیان نہ دے کر اس نے اپنے پاس سے اتنی دور بھگا دیا ہے کہ اب اس کی خواہش پر بھی وہ لوگ اس کے قریب آنے کی جرأت نہیں کر سکتے!

جیتے جاگتے انسانوں کے اس کمرے میں قبرستان سے بھی زیادہ گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ (بشکریہ افکار کراچی)

رادھے شیام احقر

# غزل

خواب میں گر شکلِ دلبر دیکھ لیں　　جاگتا اپنا مقدر دیکھ لیں

چھوڑو اے آئینہ رو منہ پر نقاب　　ہم ذرا سدِّ سکندر دیکھ لیں

صحت اس سے پائیں گے بیمارِ عشق　　سونگھ کر زلفِ معنبر دیکھ لیں

بام پر دیکھیں جلالِ روئے یار　　آفتابِ روزِ محشر دیکھ لیں

روئے روشن اس کا کیا دیکھیں گے غیر　　پہلے منہ آئینہ لے کر دیکھ لیں

شیخ جی شیخی نہ بھولیں تو سہی　　جا کے اس کافر کے در پر دیکھ لیں

لوگ نادانستہ کیوں کرتے ہیں عشق
پہلے کچھ قابو تو دل پر دیکھ لیں

---

یہ غزل احقر صاحب کے مجموعہ کلام نقشہائے رنگ رنگ سے لی گئی ہے "نقشہائے رنگ رنگ" کے نقوش اپنے حسن و زیبائش کی وجہ سے فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں ان میں ہندی لے بھی ہے اور عجمی لے بھی۔ اس مجموعے میں مسرت و بصیرت دونوں کا سامان موجود ہے اور کتاب مجموعی طور پر حسن معنی کے علاوہ حسن صورت سے بھی مزین ہے۔ قیمت تین روپے

بلونت سنگھ

# اجنبی

برآمدے کے جس گوشے میں وہ بیٹھا ہوا تھا وہ گوشہ اس کے بنگلے کے آخری سرے پر تھا۔

رات کا وقت تھا۔ بارش سے دُھل دُھلا کر آسمان صاف ہو گیا تھا۔ ستارے چھوٹے بڑے بتاشوں کی مانند بکھرے ہوئے تھے۔ درختوں کی ٹہنیاں اور پتیاں بوجھل ہو کر جھکی ہوئی سی کسی گہری سوچ میں ڈوبی نظر آ رہی تھیں۔ بارش کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی۔ لیکن موسم بڑا سہانا تھا۔ اور ہر شے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی ——— لیکن یہ خاموشی اداسی کی وجہ سے نہ تھی۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے مسرتوں کی آخری منزل پر پہنچ کر مکمل سکون و اطمینان میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جیسے ہر درخت، ہر مکان، ہر اینٹ، ہر پتھر، گھاس کی ہر پتی، غرض کہ ہر شے پر نیند چھانے لگی تھی۔ جیسے یہ سب ہلکے نشے میں ہوں ——— اگلی صبح ہر شے جاگ اٹھے گی، اور پھر وہ سب مل جل کر ایک ہی تال پر کوئی اچھوتا نغمہ یا کوئی دل کش رقص شروع کر دیں گے!

فضا میں اس قدر سکون کا راج تھا، لیکن اس کے دماغ میں ایک نیا مدّوجزر اُٹھ رہا تھا!

اب اس کی عمر ساٹھ سال سے اُوپر تھی۔ اچھی تندرستی کے باوجود بڑھاپا! ——— پہلے جیسی اُمنگ اور ترنگ اب کہاں ——— اس وقت آرام کرسی پر نیم دراز سادہ اندھیرے کو گھور رہا تھا!

یہ بنگلہ خود اس نے بنوایا تھا۔ وہ برسوں سے اپنے کمرے کے بجائے اسی برآمدے میں اسی طرح بیٹھے رہنے کا عادی تھا۔ سامنے دھندلکے میں ٹینس کورٹ پر کھینچی ہوئی چونے کی ادھوری سی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ ٹینس کورٹ کے ایک طرف لوہے کی ایک بنچ پڑی ہوئی تھی۔ جب اس نے یہ بنگلہ بنوایا تھا، اسی وقت یہ بنچ بھی اس مقام پر نصب کی گئی تھ

اس وقت سے آج تک بارش، دھوپ اور اوس میں بنچ پڑی رہی لیکن اس کا کچھ نہ بگڑا تھا۔ نہ جانے کیسے لوہے کی بنی تھی وہ بنچ۔

زندگی میں کتنی ہی بار وہ اس بنچ پر بیٹھا تھا۔ لیٹا تھا۔ اس کا سہارا لے کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی بیوی اس کے بچے اور لاتعداد انسانوں نے اس بنچ کو استعمال کیا تھا۔ لیکن اس بنچ کا کچھ نہ بگڑا تھا۔ ہر چیز بدل گئی تھی۔ بچے جوان ہو گئے تھے۔ وہ جوان سے بوڑھا ہو گیا تھا اور وہ مکھنی سی آیا جو بچوں کی دیکھ بھال پر مامور تھی اور جس کے چکنے گالوں پر اس کی نظریں پھسلا کرتی تھیں، اب بوڑھی ہو چکی تھی —— لیکن وہ بنچ!

اگر انسان کبھی کبھی ان باتوں پر غور کرے تو ایسی بے جان چیزوں سے بھی اس کے من کو بہت دکھ پہنچے۔ عمارتیں، سڑکیں، پہاڑ، ندیاں، درخت وغیرہ انسان کی زندگی کے دوران جوں کے توں رہتے ہیں لیکن انسان بدلتا رہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے ارد گرد کی چیزوں میں کوئی فرق نہیں آیا —— کوئی تغیر نہیں ہوا۔ یہ دیکھ کر انسان کو کافی صدمہ ہو سکتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دنیا کی محفل اب بھی اپنے شباب پر ہے لیکن انسان کو اس بھری محفل سے دھکے دے کر باہر نکالا جا رہا ہے۔ وہ پہاڑ جس پر انسان کبھی چٹکیاں بجاتا چڑھ جاتا تھا، اب وہ اسے دیکھ کر ہی ہانپنے لگتا ہے۔ اور پہاڑ اس کی بے چارگی پر قہقہے لگاتا ہے —— وہ ندی جو پہلے اپنی گود پھیلائے اُسے دوسرے کنارے تک تیرنے کی دعوت دیا کرتی تھی اب اس کی کمزوری کو بھانپ کر چپکے سے مسکراتی ہوئی اس کے پہلو سے نکل جاتی ہے۔ نوجوان عورتیں جو کبھی اس کی پیار بھری نظروں کی تاب نہ لا کر نظریں جھکا لیا کرتی تھیں اب "ہٹو بابا۔ راستہ چھوڑ دو" کہہ کر بڑی تیزی سے منہ پھیر کر چلی جاتی ہیں!

اب تو ہر شے خواہ وہ جان دار ہو بے جان، اُسے یہی کہتی سنائی دیتی ہے!

"ہٹو بابا، راستہ چھوڑ دو!"

---

اس کے کانوں میں سردی محسوس ہونے لگی۔ اس نے ان پر مفلر لپیٹ لیا۔ اور برآمدے میں لوہے کے تاروں سے لٹکے ہوئے گملوں کی جانب دیکھنے لگا۔ گملوں سے نرم و نازک شاخیں اور پتیاں نیچے جھول رہی تھیں۔ ان کے ہلکے رنگ کے خوش نما پھول بالکل بے حرکت تھے جیسے رقص کرتے کرتے ایک لمحے کو رک گئے ہوں۔ گملوں سے پانی رِس کر بوند بوند فرش پر گر رہا تھا!

دفعتاً قہقہوں اور شور وغل کی آوازیں سن کر وہ چونک پڑا ــــــ

یہ اُسی کے بچے تھے۔ دو لڑکے اور تین لڑکیاں۔ سب سے بڑے بیٹے کی عمر اٹھائیس سال کے قریب تھی۔ اس سے چھوٹی لڑکی کی عمر چوبیس سال تھی اور اس کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ انیس سال کی دوسری لڑکی بھی شادی شدہ تھی۔ چھوٹا لڑکا چودہ سال کا، اور سب سے چھوٹی لڑکی بارہ سال کی تھی۔ وہ سب ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔ اس ہنسی خوشی کی محفل میں اس کی جوان بہو، ننھا پوتا اور اس کی بیوی بھی شامل تھی!

وہ سب ہنس کھیل رہے تھے اور وہ اکیلا بیٹھا تھا!

سدا سے یہی ہو رہا تھا!

پہلے اس کا جیون بھرپور تھا۔ اور اسے کبھی ان باتوں کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ اس کے اپنے احباب تھے، جن کے ساتھ سیر و تفریح، کھانا، پینا، گانا بجانا، سب ہی کچھ ہوتا تھا۔ اُن دنوں گھر کا کوئی فرد اس کا زیادہ وقت لے لیتا تو اُسے الجھن ہونے لگتی۔

ویسے بھی وہ گھر میں الگ تھلگ رہنا ہی پسند کرتا تھا۔ بچے اس کے پاس کم ہی آتے تھے۔ بیوی سے بھی اس کا تعلق اتنا ہی تھا جتنا ایک مصروف شوہر کا ہونا چاہیے۔

وہ بچوں کا رونا دھونا، اُن کا شور وغل، ان کی شرارتیں اور ضدیں برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اگر انہیں کھیل کود یا شرارتیں کرنی ہوتیں تو اس سے دور ہٹ کر کرتے تھے۔ اسی لیے اس نے اپنا کمرہ سب سے الگ کر رکھا تھا۔ بچے ذرا سیانے ہوئے تو اپنے باپ کی نظریں پہچاننے لگے اور انہوں نے خود کو بھی اسی طور پر ڈھال لیا۔

اب باپ بچوں کے طور طریقوں سے مطمئن ہو گیا تھا!

وقت گزرتا گیا۔

ہفتے، مہینے، سال بیت گئے!

اب اُس کا جسم کمزور اور ڈھیلا پڑ چکا تھا! اب وہ سیر و تفریح میں حصّہ نہ لے سکتا تھا اس میں اتنی قوت ہی نہ رہ گئی تھی کہ اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا۔ لے دے کے چند بوڑھوں کی صحبت رہ گئی تھی جن کے ساتھ چھڑی ٹیکتے ہوئے باغ میں ٹہلنے کے لیے چلا جاتا۔ ان بوڑھوں میں سے بیشتر کو نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے کوئی نہ کوئی شکایت ضرور رہتی تھی ــــ یا پھر

اپنے رشتے داروں کی باتیں اپنے دنوں کے قصے، تو دی اور خدا کی باتیں۔

اس طرح وہ بوڑھے اپنی علیحدہ دنیا میں اپنے پوپلے منہ ہلا ہلا کر باتیں کرتے تھے۔ ان باتوں کا کوئی نتیجہ کبھی نہ نکلتا تھا۔ بس یوں ہی دل کی ڈھارس بندھانے کے طریقے تھے۔ اس لیے کہ دل میں تو وہ سب ہی محسوس کرتے تھے کہ اب اُن کا کام تمام ہو چکا ہے اور انہیں آج کل میں اپنا بوریہ بستر لپیٹ کر اس دنیا سے کوچ کر جانا ہے!

لیکن دنیا کی محفل اب بھی گرم تھی۔ شمع اب بھی جل رہی تھی۔ پروانے اب بھی شمع پر قربان ہو رہے تھے۔ زندگی کی گھما گھمی میں ذرا بھی فرق نہ آیا تھا —— تو بس یہی تھی زندگی؟ اسی کے لیے اتنی پریشانیاں۔ اتنے ہنگامے؟

دنیا کی محفل سے اس طور سے بے آبرو ہو کر نکلنا کتنا اذیت ناک تھا۔ بھری محفل سے دھکے دے کر باہر نکال دینے والا اتنا دبے پاؤں آگے بڑھتا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ پہلے وہ انسان کو دھیرے دھیرے اپاہج بناتا، اور پھر ایک دن اس کی ٹانگ گھسیٹ کر باہر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک آتا —— محفل سدا گرم رہتی ہے۔ وہی ساقی، وہی جام، وہی مے —— کیا یہ سب کچھ انسان کو پاگل کر دینے کے لیے کافی نہیں!

اس نے ٹٹول کر قریبی میز سے سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی۔ اور ایک سگریٹ سلگایا۔ اٹھتے ہوئے دھوئیں کی باریک چادر میں سے وہ مٹر کی بیلوں کو دیکھنے لگا۔ جو مٹی تڑی سی کیاریوں میں لگے ہوئے بانسوں کے سہارے کھڑی تھیں۔

اس کے خیالات کا دھارا اپنی بیوی کی جانب بہہ نکلا۔ پہلے اس نے اس کے بارے میں کبھی خاص دھیان نہیں دیا تھا ——

کبھی وہ دونوں جوان تھے —— بیوی شباب کی متوالی اور شوہر بھنورا —— اب وہ بوڑھی ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی شکل پر ذہنی پریشانیوں کی کوئی نشانی نظر نہ آتی تھی۔ جب اس کے من میں کسی قسم کی کوئی الجھن ہی نہیں تو چہرے پر کوئی نشانی کیوں کر نظر آتی۔ نہ اس کا مزاج چڑچڑا تھا نہ کبھی وہ بڑبڑاتی تھی۔

وہ ہمیشہ سے عورتوں کو ناقص العقل سمجھتا آیا تھا لیکن اب وہ سوچنے لگا کہ اگر عورت کی ناقص العقلی اسے من کا چین دے سکتی ہے تو اور کیا چاہیے؟ کیا عقل مندی لے کر چاٹنا ہے؟

پہلے ایک بار اُس نے اپنے سب سے بڑے لڑکے کو ماں کی گود میں سر رکھے دیکھا تھا تھا۔ یہ بات کچھ عجیب سی لگی تھی۔ اس کے سامنے اس کا بڑا لڑکا بھیگی بلی بنا رہتا، لیکن ایک بچے کا باپ بن جانے کے باوجود اپنی ماں سے وہ اس درجے بے تکلف تھا!

باہر کی محفل کی بات تو ایک طرف رہی، خود اس کے گھر کی محفل ابھی تک گرم تھی۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ گرم کیوں کہ اس کی بہو تو گھر میں آ گئی تھی۔ اور اس نے ایک ننھے سے بچے کو بھی جنم دیا تھا۔ پوتے کے رونے کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے بچوں کے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں سنائی دیا کرتیں۔ کبھی دو سے بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے نظر آ جاتے۔ ان کی باچھیں کھلی ہوتیں۔ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے تو وہ اپنی ماں کو بھی نہ چھوڑتے تھے۔ بے چاری کو آنکھوں پر پٹی بندھوا کر "چور" پکڑنا پڑتا۔

اِدھر وہ تھا کہ بچے پیدا کر کے انھیں بھول ہی گیا۔ وہ اپنے آپ بڑے ہوتے گئے، پڑھتے لکھتے رہے اور دنیا کی محفل میں اپنی اپنی جگہ بنا بیٹھے!

دفعتاً اس کے دل میں ایک معصوم سا خیال رنگین بلبلے کی مانند اٹھا ——— "کیا وہ اپنے بچوں کے کھیل میں حصّہ نہیں لے سکتا؟ ——— اس نے سوچا ——— "وہ ابھی اتنا نحیف و ناتواں تو نہیں کہ بچوں کے ساتھ کچھ دور دوڑ نہ سکے! ——— وہ چلّا سکتا تھا۔ گا سکتا تھا۔ ناچ سکتا تھا .........!

وہ چپ چاپ سگریٹ کا دھواں اُڑاتا رہا۔

اُس کے دل کا بوجھ کچھ کچھ ہلکا ہو رہا تھا۔ لیکن ابھی کچھ اور ہمت کی ضرورت تھی۔ اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر وہ تصور ہی میں ناچنے کودنے لگا ———

بس وہ اپنی چھڑی ٹیکتا ہوا یکایک اپنے گھر والوں کی محفل میں پہنچ جائے گا۔ آخر وہ سب اسی کے بچے تھے۔ وہی ننھے منے بچے جو کبھی توتلی زبان سے باتیں کیا کرتے تھے۔ اب بڑے ہو گئے تو کیا ہوا؟ وہ بڑے ہوں گے تو اپنے لیے، اس کے نزدیک تو وہ ابھی کل کے بچّے ہی تھے!

کمرے سے باتیں کرنے ہنسنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔

کارواں چلا جا رہا تھا۔ اور وہ خواہ مخواہ کارواں سے الگ ہو کر اندھیرے گوشے

میں بھٹک رہا تھا۔ وہ بچے جو خوشی کا گیت گا رہے تھے خود اسی کے جسم اور دل کے ٹکڑے تھے۔ آخر وہ اپنے آپ کو ان سے الگ کیوں کیے تھا؟

اتنے میں اسے اپنے سب سے بڑے لڑکے کا فلک شگاف قہقہہ سنائی دیا۔
وہ چونک اٹھا۔ اس کے بیٹے کی آواز اس کی اپنی آواز سے کس قدر ملتی جلتی تھی۔
اس کے بیشتر دوستوں کا بھی یہی خیال تھا کہ اس کے بیٹے کی آواز پر خود اس کی آواز کا دھوکا ہوتا ہے۔

آخر اس کا بیٹا اس وقت کس بات پر قہقہے لگا رہا تھا؟ اس کی آواز میں کتنی مسرت کتنا سکون تھا۔ کوئی فکر نہیں۔ کوئی الجھن نہیں۔ کوئی تصنع نہیں ـــــ ایک الھڑ نوجوان کا بے ساختہ قہقہہ ـــــ جیسے خود اسی کی روح کسی نئے جسم میں داخل ہو گئی ہو!
اسے ایک نئے سرور کا احساس ہونے لگا۔ کیا ہوا اگر اس کا اپنا جسم ایک ٹوٹے ہوئے جہاز کی مانند اکھڑ رہا تھا۔ اسی کی روح اس بیٹے کے جسم میں بھی تو تھی جس کے چہرے پر ابھی ایک جھری بھی نہ ابھری تھی ـــــ ایک روز اس کا بیٹا بھی بوڑھا ہو جائے گا۔ لیکن اس وقت اس کا ننھا بیٹا جوان ہو چکا ہوگا اور اسے بھی اپنی روح ایک نئے جسم میں خوش و خرم رہتی ہوئی محسوس ہوگی ـــــ اسی طرح روزِ حشر تک یہ چکر چلتا رہے گا ـــــ غور کیا جائے تو کوئی بھی کسی محفل سے نکالا نہیں جاتا، کیوں کہ جسم بوڑھا ہوتا ہے لیکن روح ہمیشہ جوان رہتی ہے!

اس نے سگریٹ کا بچا ہوا چھوٹا سا ٹکڑا دور پھینک دیا۔ اور وہ چنگاریاں چھوڑتا ہوا اندھیرے میں چکر کھا کر برآمدے کے باہر جا گرا۔ تب اس نے اپنی چھڑی اٹھائی۔ جھک کر اپنے گھٹنوں کو ٹٹولا۔ اور ایک دم سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔
آہستہ آہستہ وہ بنگلے کے اس کمرے کی جانب بڑھا جہاں گھر والوں کی محفل گرم تھی۔
وہ رنگین قہقہے اور دلچسپ باتیں جو فاصلے سے ذرا مدھم سنائی دیتی تھیں۔ قریب پہنچ کر اور بھی صاف سنائی دینے لگیں۔ اس کا من بچوں کی معصوم ہنسی میں گھل مل کر رقص کرنے لگا!
وہ اندھیرے گوشے سے اٹھ کر آیا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھتا گیا، روشنی بڑھتی گئی۔
یہاں تک کہ وہ کمرے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اندر سے ہنسنے بولنے کی آواز برابر آرہی تھی۔

وہ دروازے پر لٹکتا ہوا پھول دار پردہ اٹھانے ہی والا تھا کہ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا اور وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا!

کمرے کے اندر کی تیز روشنی میں اس کی بیوی تکیوں کا سہارا لیے دیوان پر بیٹھی ہوئی تھی۔

سب سے بڑا بیٹا ماں کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا، اور اپنے ننھے بچے کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا، اور اُسے ہولے ہولے ہوا میں اُچھال رہا تھا۔

بچہ کلکاریاں بھر رہا تھا۔

ایک لڑکی دیوان کے پیچھے سے آگے کو جھکی ہوئی اپنی ماں کو بانہوں میں جکڑے ہوئی تھی۔

سب سے چھوٹی لڑکی ہاتھ اٹھائے اپنے کولہے مٹکا رہی تھی۔ "دیکھتی ماں! کیسے ناچتی ہے؟ بتلاؤں؟" یہ کہہ کر وہ بڑی ادا سے اپنے بازو اور کمر ہلانے لگی۔

ٹھیک اس کے پیچھے اس کا چھوٹا بھائی کھڑا ہوا اس کی چوٹی کو کپڑے کے کتے کی دم سے باندھنے کی فکر میں تھا۔ اس کے چہرے سے شرارت ٹپک رہی تھی۔

باقی لوگ اس کی اس حرکت کو تاڑ کر اُسے شہ دے رہے تھے، اور ناچنے والی لڑکی کا دھیان دوسری طرف لگائے ہوئے تھے تاکہ لڑکے کی شرارت کامیاب ہو سکے۔

ایک لڑکی قالین پر بیٹھی اشارے سے بھائی کو گرا دینے کا داؤں بتلا رہی تھی۔

ادھر چوٹی میں گرہ بندھ گئی، ادھر ہوا میں اٹھے ہوئے بچے کے منہ کی رال ٹپک کر اس کے باپ کی ناک پر گر پڑی — بس پھر کیا تھا، کمرہ قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

وہ باہر کھڑا کھڑا سارا تماشہ دیکھ رہا تھا — پھر ایک دم سے پردہ ہٹا کر وہ ان قہقہوں کے درمیان کمرے میں داخل ہو گیا!

چند لمحے تو کسی کو اس کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی، اور وہ شور بدستور قائم رہا۔ لیکن جب ان لوگوں کو اس کے اندر آنے کا احساس ہوا تو دفعتاً سب خاموش ہو گئے۔

بڑا بیٹا ماں کی گود سے سر اٹھا کر ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ لڑکی جس کی چوٹی سے کتا بندھا ہوا تھا، ایک کونے میں دُبک گئی، اور وہ لڑکا جس نے کتا باندھا تھا ڈر کر باہر بھاگ گیا۔ بہو اور دوسری لڑکیاں بھی اپنا اپنا آنچل درست کرتی ہوئی اِدھر اُدھر کھسک گئیں۔

یہاں تک کہ اس کی بیوی بھی دیوان سے نیچے اُتر کر کھڑی ہو گئی۔

(باقی صـ۲ پر)

# شراب کہنہ

# شوق

۱۷۸۲ء ——————— ۱۸۷۱ء

(شراب کہنہ" کے عنوان کے تحت شاعروں کے حالات اور نمونۂ کلام کا یہ مخصوص سلسلہ شاعر کے سن ولادت کے مطابق ایک خاص ترتیب سے شائع کیا جا رہا ہے۔ تصدق حسین شوق کا نمبر خواجہ حیدر علی آتش کے بعد آتا تھا لیکن کسی وجہ سے ہم اسے اس وقت شائع نہ کر سکے تھے۔)

نام تصدق حسین خاں، تخلص شوق، شاگردِ آتش، نسبتاً پٹھان، نواب مرزا یا حکیم نواب مرزا کے نام سے بھی مشہور و معروف ہیں۔ ان کے والد آغا علی خاں کا شمار لکھنؤ کے مشہور طبیبوں میں سے تھا۔ ان کے چچا حکیم مرزا علی خاں شاہان اودھ کے دربار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ "حکیم الملک" ان کا خطاب تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی اس کے بعد طب پڑھی، علم متداولہ اور مروجہ فنون سے بھی بقدر ضرورت واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے نہ تو اپنا آبائی پیشہ طبابت اختیار کیا اور نہ کہیں ملازمت کی۔ گھر میں باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت اتنی تھی کہ لطف و فراغت کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔

شوق پیدائشی طور سے رنگین طبع اور موزوں سرشت تھے اس پر طرہ یہ کہ ان کے چاروں طرف شاعرانہ ماحول اور اس کی پرورش کا پورا پورا سامان و اہتمام موجود تھا۔

منسوب تو ان سے بہت سی مثنویاں ہیں مگر ان کے نام کو باقی رکھنے والی "فریب عشق" "بہار عشق" اور آخری شاہ کار "زہر عشق" کو سمجھنا چاہیے۔ ان ہی مثنویوں کی بدولت وہ بدنام بھی ہوئے اور آج یہی مثنویاں ان کی نیک نامی، قادر الکلامی اور رفعت و شہرت کا سبب بھی سمجھی جاتی ہیں۔

بہت دنوں تک شوق کا ذکر کرنا ممنوع اور ان کی مثنویوں کا پڑھنا ممنوع رہا لیکن اب یہ بات مسلّم ہو چکی ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی اپنی ہوس ناکی یا لذت پرستی کی داستان

نہیں بلکہ ان مشاغل وافکار کی وہ کامیاب عکاسی ہے جس میں اس دور کے بیشتر خواص اور متوسط طبقے کے اہالیان لکھنؤ روز وشب مبتلا و معروف رہا کرتے تھے۔

شوق کی عظمت اور ان کے کمالات کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ عبداللہ اپالوی نے ان کا ایک نہایت جامع اور مستند تذکرہ ترتیب دیا۔ نیاز کو انھوں نے رلایا، مجنوں کو تڑپایا اور عبدالماجد دریابادی جیسے ثقہ انشا پرداز کے قلم سے یہ لکھوایا کہ"۔ ۔ ۔ ۔ اُردو کے بدنام شاعر رخصت! تو درد بھرا دل رکھتا تھا، تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔ تو نے موت کو یاد رکھا، تیری یاد پر انشاءاللہ موت نہ آنے پائے گی"۔

# انتخاب

خیر سے موسم شباب کٹا چلو اچھا ہوا عذاب کٹا

چمن میں شب کو گھرا ابر نوبہار رہا حضور آپ کا کیا کیا نہ انتظار رہا

بے یار گیا ہوں جو کبھی سیر چمن کو کانٹا سا چبھا دل میں اگر گل پہ پڑی آنکھ

دیوانہ بھی، سودائی بھی، فرماتے ہیں کثر ان ناموں سے جاتے ہیں پکارے کئی دن سے

## مثنوی فریبِ عشق :-

دوست جتنے تھے رہتے تھے ہم راہ "کربلا" میں کبھی کبھی "درگاہ"

وضع کی گو تھی سب کو پابندی پر نہ بچتی تھی کوئی "نوچندی"

رہتا تھا "تیرھویں کا جلسہ" یاد شام سے جاتے تھے "حسین آباد"

دوپہر رات جب گزرتی تھی ڈولی پر ڈولی پھر اترتی تھی

جی سے اپنے گزر گئی آخر کہہ کے یہ "بات" مر گئی آخر

"نہ لگائے کہیں طبیعت کو کبھی بھولے نہ اس وصیت کو

ان سے مل کر نہ جی گنوائے کبھی مرد کے فقرے پہ نہ آئے کبھی

کرتے ہیں یہ دعا حسینوں سے الحذر ان تماش بینوں سے

## مثنوی بہارِ عشق :-

حسنِ یوسف بھی اس کے آگے ماند چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند

رخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال رگِ گل سے وہ ہونٹ، پان سے لال

بے مسّی کے وہ دانت رشکِ قمر جانِ عاشق نثار ہو جس پر
ناک میں نیم کا فقط تنکا !! شوخی، چالاکی مقتضا سن کا
عکسِ رُخ موتیوں کے دانوں میں بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
رگِ گُل سے کمر لچکتی ہوئی چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

آئی ماما بھی ایک ہے ہم راہ کتنی چالاک ہے خدا کی پناہ
اپنے سائے سے بھی بھڑکتی ہے بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے
ہنسی، ٹھٹھا، ضلع جگت میں طاق چل رہی ہے زباں تڑاق پڑاق

کہتے ہیں صوفیانِ صافی دل کہ ہے عشقِ خدا بہت مشکل
عشق اللہ کا جو مائل ہو ترک دنیا کرے تو حاصل ہو
کوئی اُلفت نہ بے وفا سے کرے عشق کرنا ہے جو، خدا سے کرے

مثنوی زہرِ عشق :-

جس محلے میں تھا ہمارا گھر وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
ایک دختر تھی اس کی ماہ جبیں شادی اس کی نہیں ہوئی تھی کہیں

دل مرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا سیر کرنے کو بام پر آیا
ہوئی میری جو اس کی چار نگاہ منہ سے بے ساختہ نکل گئی آہ

عیش ہونے لگے مرے اُن کے غیر جلنے لگے یہ سُن سُن کے

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
جائے عبرت سرائے فانی ہے موردِ مرگِ نوجوانی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج آج ہیں فاتحے کو وہ محتاج
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے یہی دنیا کا کارخانہ ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان پڑھتے ہیں "کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ"
موت سے کس کو رُستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے
دل میں لے کر تمھاری یاد چلے باغِ عالم سے نامراد چلے
جب تلک چرخ نیلے مدار رہے یہ فسانہ بھی یادگار رہے
خاک تسکین جانِ زار کریں اب وصیت کریں کہ پیار کریں

# نئی مطبوعات

| کتاب | موضوع | مصنف | قیمت | | ناشر |
|---|---|---|---|---|---|
| غزل سرا اردو | (تنقید) | مجنوں گورکھپوری | ۶/- | ناشر | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵ |
| اوپر کی منزل | (ڈراما) | کرتار سنگھ دگل | ۴/- | ״ | ״ |
| کتاب طبیعات | (سائنس) | محمد فاروق | ۵/- | ״ | صدیق بکڈپو، بمبئی |
| کتاب کیمیا | (״) | ״ | ۴/- | ״ | ״ |
| اردو کمپوزیشن | (قواعد) | ״ | ۴/۵۰ | ״ | ״ |
| بادہ و جام | (مجموعہ کلام) | شارق میرٹھی | ۲/۵۰ | ״ | شارق میرٹھی، رحمانیہ کالج، مودہا |
| نوید | (ناول) | جمیل الرحمن | ۵/- | ״ | نسیم بک ڈپو، لکھنؤ |
| شبینہ | (״) | ہاجرہ نازلی | ۳/- | ״ | ״ |
| حضرت عائشہ صدیقہؓ | (سیرت) | سلام اللہ صدیقی | -/۸۸ | ״ | مکتبہ اسلامی ادب، وارانسی ۱ |
| حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان | (سیرت) | ״ | ۱/۵۰ | ״ | ״ |
| صبح غزل | (مجموعہ کلام) | شعری بھوپالی | ۵/- | ״ | اشاعت القرآن، دہلی |
| اردو تنقید کا ارتقاء | (تنقید) | عبادت بریلوی | ۹/- | ״ | اردو مرکز، دہلی ۶ |
| سرشار ایک مطالعہ | (״) | پریم پال اشک | ۵/- | ״ | آزاد کتاب گھر، دہلی ۶ |
| نئے تنقیدی گوشے | (״) | ممتاز حسین | ۶/- | ״ | ״ |

اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو (اضافہ شدہ ایڈیشن) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۱/۹۰ پبلشر آزاد کتاب گھر دہلی ۶

اجالے سے پہلے (نیا ایڈیشن) ابراہیم جلیس ۳/- ناشر مکتبہ ماحول، کراچی

شمع زندگی (ناولٹ) خواجہ معراج الدین ۲/- ״ ״

نئے ایڈیشن — ناشر: لاجپت رائے اینڈ سنز دہلی ۶

کربلا (پریم چند) ۳/- — غبن (پریم چند) ۵/- — روٹھی رانی (پریم چند) ۱/۵۰ — خواب و خیال (پریم چند) ۳/۵۰

نرم گرم (کنہیا لال کپور) ۲/۷۵ — روحانی اشارے (شوبرت لال) ۱/۲۵ — ٹیگور کے ڈرامے ۳/-

## زیر طبع

تاجدار مدینہ کی شہزادیاںؓ سلام اللہ صدیقی ناشر پندرہ روزہ برادری، لکھنؤ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## دیوان قائم

مرتبہ: ڈاکٹر خورشید الاسلام
صفحات: ۲۶۸ سائز ۱۸x۲۲/۸ مجلد
قیمت: سات روپے
سن اشاعت: دسمبر ۶۳ء
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

قائم چاندپوری پر اپنا مضمون لکھتے ہوئے میں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ قائم جیسے رمز شناس اور نکتہ سنج شاعر کا دیوان اب تک شائع نہ ہو سکا۔ اس پر بھی تیئس سال کی مدت گزر گئی اور اردو کے کسی محقق یا صاحب ذوق کو ابھی تک یہ توفیق نہ ہو سکی تھی کہ وہ قائم کا کلام مرتب کر کے شائع کر دیتا۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے اردو کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور اردو کے ہمدردوں اور بہی خواہوں پر ناقابل فراموش احسان کیا ہے کہ دیوان قائم کا ایک بڑا ستھرا ایڈیشن ابھی دسمبر ۶۳ء میں شائع کیا ہے جس کی ترتیب میں وہ کوئی دو سال سے منہمک تھے۔

"دیوان قائم" کے اس مطبوعہ نسخہ کی سب سے زیادہ نمایاں اور قابل توجہ خصوصیت یہ ہے کہ نہ تو طویل تنقیدی محاکمہ لکھ کر اس کو گرانبار کیا گیا ہے اور نہ محققانہ بوالفضولیوں کا ڈھیر لگا کر دیوان کا مطالعہ کرنے والوں کو تھکانے اور عاجز کرنے کی صورت پیدا کی گئی ہے۔ بس چار صفحوں کی تمہید میں چند ضروری باتیں کہہ دی گئی ہیں جو بصیرت سے خالی نہیں ہیں اور جن میں ہمارے لیے کئی بلیغ اشارے ہیں۔ کلیات قائم کے مختلف نسخوں اور مختلف تذکروں اور معروضوں کے جو اختلافات ملتے ہیں ان کو سلیقہ کے ساتھ کتاب کے آخر میں اکٹھا کر دیا گیا ہے تاکہ جس کو ان سے دلچسپی ہو وہ ان کے مطالعہ سے لطف یا فائدہ اٹھائے اور جو ایسی باتوں کا ذوق نہیں رکھتا اس کا مطالعہ مکدر نہ ہونے پائے۔ کاغذ، کتابت و طباعت کی متین سادگی

مرتب کے سنجیدہ اور شائستہ مذاق پر دلالت کرتی ہے۔"دیوان قائم" جس وقت میرے ہاتھ میں آیا تو مجھے ایک گراں قدر نئی یافت کا احساس ہوا۔

اُردو نظم اور نثر کے نہ جانے کتنے ایسے ہی دفینے ہیں جو ابھی انکشاف کے محتاج ہیں۔ ضرورت ہے کچھ ایسے لوگوں کی جو اسی دھن اور لگن کے ساتھ ان کو ایک ایک کرکے تنقیدی نکتہ آفرینی اور تحقیقی ادھیڑبن کا اہتمام کیے ہوئے بغیر جوں کا توں ہمارے لیے محفوظ کردیں ورنہ اندیشہ ہے کہ ہماری یہ میراث ہمیشہ کے لیے کھو کر رہ جائے گی اور ہم تہذیبی اور ادبی اعتبار سے دیوالیہ ہو جائیں گے۔

مجنوں گورکھپوری

## مفہوم القرآن

از: محمد ادریس کیف بھوپالی
صفحات: ۸۰ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۸}$
ہدیہ: تین روپے
ملنے کا پتہ: معراج پبلیکیشن شیخ سلیم گیٹ بنارس

قرآن مجید کے اردو ترجمے بہت ہو چکے ہیں۔ شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی سے لے کر اس وقت تک بیسوں اہل علم نے یہ مقدس خدمت انجام دی ہے اور اپنے اپنے دور کی زبان میں اپنے اپنے انداز میں قرآن مجید کے مفہوم و مطالب سے غیر عربی داں اصحاب کو واقف کرانے کی کوشش کی ہے لیکن پیش نظر کتاب میں ایک اور انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اب تک تمام ترجمے نثر میں کیے گئے تھے منظوم ترجمے متفرق اجزا اور سورتوں کے تو بعض اصحاب نے کیے تھے مگر پورے قرآن مجید کے مطالب نظم میں اب تک کسی نے نہیں پیش کیے تھے۔ نثر کے مقابلے نظم میں دلکشی زیادہ ہوتی ہے لیکن نثر نظم کی پابندیوں کی وجہ سے بے کم و کاست لفظ بہ لفظ ترجمہ ناممکن ہے۔ اس بنا پر جناب کیف نے ترجمہ کے بجائے مفہوم پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس خیال سے انھوں نے اس کا نام بھی مفہوم القرآن رکھا ہے مزید احتیاط کے لیے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ کا مستند ترجمہ بھی مقابل کے صفحات پر اصل قرآنی عبارت کے ساتھ درج کر دیا ہے تاکہ زبان شعر کے ساتھ نثر میں بھی قرآن مجید کا صحیح مطلب بھی قاری کے پیش نظر رہے۔ ویسے کیف صاحب نے نظم میں بھی حتی المقدور مفہوم قرآن مجید کا پورا پورا مطلب ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور پوری احتیاط سے کام لیا ہے اس کے باوجود وزن اور زور بیان میں کوئی کمی نہیں آنے پائی

اُمید ہے کہ کیف صاحب کی اس کوشش کی قدر کی جائے گی اور ان کا یہ منظوم ــــــ "مفہوم القرآن" قبول عام حاصل کرے گا

(مولانا) عبدالسلام قدوائی

## مطائبات شبلی

مرتبہ: ایس جالب مظہری

صفحات: ۱۲۸ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد

قیمت: دو روپے ۵۰ نئے پیسے

شائع کردہ: علوی بکڈپو محمد علی روڈ بمبئی ۳

مولانا شبلی مرحوم کے علمی اور ادبی کارناموں سے اس وقت ابن عظیم میں کون تعلیم یافتہ ہے جو واقف نہیں۔ آپ نے ادبی علمی، تاریخی، اخلاقی، اور فلسفیانہ مباحث پر ایک ایسا ذخیرہ مہیا فرما دیا ہے کہ لوگ صدیوں تک اُس سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ مولانا کی ذات علم و ادب اور زبان اُردو کی خدمت کے لحاظ سے اُن معدودے چند بزرگوں میں تھی جن کا شمار انگلیوں پر ہو سکتا ہے۔

یوں تو موصوف کے کارنامے ہی ان کی زندہ یادگار ہیں۔ لیکن علاوہ چھوٹے موٹے مضامین کے جو مولانا کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ ایک طویل اور ضخیم مجلد "داستان شبلی" کے نام سے آپ کی زندگی اور علمی کارناموں کی حامل شائع ہو چکی ہے۔

اس تعلق کی بنا پر جو دلدادگان اردو ادب کو مولانا کی ذات سے ہے، جناب مظہری صاحب نے بھی مذکورہ بالا نام سے آپ کی مختلف تصانیف اور مکاتیب سے جزوی جزوی واقعات پر مشتمل ایک کتاب "مطائبات" کے نام سے مرتب فرمائی ہے۔ اور یہ اس لیے قابل قدر ہے کہ کسی بزرگ کی جستہ جستہ باتیں بھی طالب ہدایت کے لیے مشعل کا کام دیتی ہیں۔

مذکورہ بالا کتاب میں مولانا کی علمی اور ادبی خدمات ایک مختصر بیان کے علاوہ آپ نے چیدہ چیدہ واقعات کو جو مطائبات ہی پر نہیں بلکہ مواعظات پر بھی مبنی ہیں مختلف حصوں میں تقسیم فرما دیا ہے تاکہ لوگ اپنے ذوق کے مطابق ان سے مستفید ہو سکیں۔

محمد شفیع الدین نیر ایم، اے

## ماہنامہ کتاب چوک لکھنؤ

مرتبہ: رام لعل و عابد سہیل

صفحات: ۲۱۲ سائز: ۲۰×۳۰/۸

قیمت { معمولی جلد: ۶/۱ ، گلیز کاغذ مجلد: ۳/

قیمت سالانہ مع دو خاص نمبر: چھ روپے

ماہنامہ "کتاب" کا جنوری ۶۳ء کا موجودہ شمارہ افسانہ نمبر کی حیثیت سے ۱۹۶۲ء کے بہترین افسانوں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔

اس انتخاب میں دیباچے کے طور پر مرتبین نے جو سرگزشت لکھی ہے وہ واقعی قابلِ غور ہے ہندو پاک کے دو ڈھائی ہزار افسانوں میں سے ۲۵، ۳۰ افسانوں کا انتخاب کرنا اور انھیں بہترین قرار دینا بڑا مشکل کام ہے۔ دراصل یہ پسند اپنی اپنی والی بات ہے اور اس لیے اسی طرح کے کسی بھی انتخاب کے حق میں "حرفِ آخر" کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

"کتاب" کے اس افسانہ نمبر میں ۲۷ افسانے شامل ہیں اور بیشتر کے خالق ہمارے چوٹی کے افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ نگاروں کے نام گنانا اور ان کے افسانوں کی فرداً فرداً تجزیاں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ اس لیے بھی کہ انتخاب اتنا جامع اور مکمل ہے کہ اگر چند افسانوں کی تعریف کے بعد مجبوراً بقیہ کو نظر انداز کیا تو یہ ناانصافی ہوگی۔ ایک کمی البتہ یہ ضرور محسوس ہوتی ہے کہ افسانوں کے ساتھ یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ سب سے پہلے کہاں اور کب شائع ہوئے۔ اگر یہ معلومات بھی دی گئی ہوتی تو اچھا رہتا۔ انتخاب کے آخر میں "اردو افسانے کے تین دور" کے عنوان سے ڈاکٹر وزیر آغا کے بصیرت افروز مضمون نے اس انتخاب کو اور بھی جان دار بنا دیا ہے۔ کتابت اور طباعت بھی معیاری ہے اور رنگین ٹائیٹل جاذبِ نظر ہے۔ (مدیر)

ماہنامہ "سروج" قصاب پورہ، دہلی

مدیر: ایچ۔ اے۔ حمید صدیقی
مدیران اعزازی: سیفی پریمی اور عشرت قادری
سائز: ۳۰×۲۰ ۸
قیمت سالانہ: پانچ روپے، فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

دہلی کے ایک مشہور دواخانے سے ایک رسالہ قریشی اپنے دواخانے کے نام پر تین سال سے شائع ہو رہا تھا جس کی شکل شروع شروع میں تو دواخانے کی فہرست کی سی تھی لیکن جس نے بعد میں بہت جلد ایک ادبی مجلہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ زیرِ نظر شمارہ "سروج" جو اپنے نام کا پہلا شمارہ ہے اسی "قریشی" کا بدلا ہوا نام ہے۔

"سروج" ہندی کا لفظ ہے جس کے معنی کنول کے ہیں۔ زیرِ نظر "سروج" کو دیکھ کر جو اسم بامسمّٰی ہے، بے اختیار کلمۂ تحسین منہ سے نکل جاتا ہے۔

اداریہ۔ ادبی تحقیقی مضامین۔ افسانے۔ غزل اور نظم کا عمدہ انتخاب۔ کتابوں پر تبصرے غرض سب ہی میں ایک تنوع موجود ہے اور اس کا ایک ایک حصہ قابل تعریف۔ اور ان سب کے لیے قابل مدیران مبارک باد کے مستحق ہیں۔　　(مدیر)

# ادبی خبریں

مرتبہ ظل عباس عباسی

## شعبۂ اُردو دلی یونیورسٹی میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تقریر

دلی یونیورسٹی کے شبینہ کالج کے شعبۂ اُردو کی طرف سے یکم فروری ۶۴ء کی شام کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے "اردو زبان کی ابتدا اور انیسویں صدی تک اس کے ارتقا" کے عنوان سے ایک مبسوط تقریر فرمائی۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ریڈر شعبۂ اُردو دلی یونی ورسٹی نے کی اور خیر مقدم ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے۔

جلسے کے اختتام پر جناب مغیث الدین فریدی صاحب استاد شبینہ کالج نے معزز مہمان کا شکریہ ادا کیا۔　　(سید مرتضیٰ حسن بلگرامی۔ سکریٹری شعبۂ اُردو)

## مراٹھی بمبئی کی سرکاری زبان

بمبئی میونسپل کارپوریشن نے مراٹھی کو سرکاری زبان قرار دیدیا ہے۔ کارپوریشن کی قرارداد میں کہا گیا ہے کہ مراٹھی نہ جاننے والے کارپوریشن کے ملازمین انگریزی استعمال کرسکتے ہیں، اور کارپوریشن کے جلسوں میں گجراتی، ہندی اور اُردو کے استعمال کا حق بدستور رہے گا۔

## وفیات

۸، فروری ۱۹۶۴ء کو رام پور میں حضرت شاد عارفی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کا شمار اردو کے مشہور شاعروں میں ہوتا تھا۔ آپ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۶۱ سال کی تھی۔

---

# فارم IV حسب قاعدہ ٨ بابت "کتاب نما" نئی دہلی

١۔ مقام اشاعت: جامعہ نگر، نئی دہلی

٢۔ وقفہ اشاعت: ماہنامہ

٣۔ پرنٹر کا نام: سید احمد ولی۔ قومیت: ہندوستانی۔ پتہ: جامعہ نگر، نئی دہلی

٤۔ پبلشر کا نام: سید احمد ولی۔ قومیت: ہندوستانی۔ پتہ: جامعہ نگر، نئی دہلی

٥۔ ایڈیٹر کا نام: ریحان احمد عباسی۔ قومیت: ہندوستانی۔ پتہ: جامعہ نگر، نئی دہلی

٦۔ مالکان کے نام و پتے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ چیئرمین پروفیسر محمد مجیب، جامعہ نگر، نئی دہلی

ڈائرکٹرز۔ ١۔ سید مجتبیٰ حسین زیدی، جامعہ نگر، نئی دہلی

٢۔ ڈاکٹر عبد العلیم ٣ یونیورسٹی روڈ، علی گڑھ

٣۔ مسٹر ایم آر جنائے مہر بلڈنگ۔ چوپاٹی۔ بمبئی ٧

٤۔ مسٹر ایم ایچ ہاشم پریم جی ٥ گھوگا اسٹریٹ، بمبئی ١

٥۔ ہز ہائی نس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور کعبہ پریڈ کولابہ بمبئی

٦۔ مرزا محمود بیگ۔ پرنسپل دہلی کالج۔ دہلی

٧۔ کرنل بشیر حسین زیدی ایم پی ١٢/١ اجنتا لین نئی دہلی

کمپنی کے سرمایہ کے ١ فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار:

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اسلام جیم خانہ۔ کنیڈی سی فیس، بمبئی

شری مالک رام لوبچہ۔ ہندوستانی سفارتخانہ۔ برسلز (بلجیم)

میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق [illegible]

دستخط احمد ولی

[illegible] ١٩٦٤ء پبلشر


کتاب نما

| سالانہ چندہ ایک روپیہ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی | فی پرچہ [illegible] پیسے |
|---|---|---|

(پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ [illegible] نئی دہلی سے شائع کیا)

نگراں
غلام ربانی تاباں

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

مدیر
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۵ | اپریل ۱۹۶۴ء | شمارہ نمبر ۴

# اشاریہ

ہمیں فخر ہے کہ مکتبہ جامعہ اپنی معیاری اور صاف ستھری کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں اپنا ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ مکتبہ جامعہ نے اب تک بچوں اور بڑوں کے لیے ہر قسم کی ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہی کتابیں شائع کی ہیں جو ہر طبقے اور ہر حلقے میں پسند کی گئی ہیں۔ ہماری اب بھی برابر یہی کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ معیاری اور عمدہ کتابیں شائع کرتے رہیں ہمارے اس سال کے اشاعتی پروگرام میں جو کتابیں شامل ہیں ان کی اشاعت پر ہم اور بھی بجا طور پر فخر کر سکیں گے۔ ان کتابوں میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی کتاب "یادگار شخصیتیں" میر امن دہلوی کی "باغ و بہار"۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی "خنداں"۔ میکش اکبرآبادی کی کی "نقد اقبال"۔ مولانا اسلم جیراج پوری کی "تاریخ الامت حصہ ہشتم"۔ کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے مجموعے "سپنوں کا قیدی" اور "پت جھڑ کی آواز" اور عصمت چغتائی کا ایک نیا ناول، راجندر سنگھ بیدی کا ایک نیا افسانوں کا مجموعہ اور سید احتشام حسین کی ایک نئی تنقیدی کتاب کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ہمیں یقین ہے یہ کتابیں اردو ادب میں گراں قدر اضافے کا باعث ہوں گی اور ہر جگہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائیں گی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

# خطبۂ افتتاحیہ

(وہ خطبہ جو ۶۴ء کے جشن جمہوریہ کے موقعے پر لال قلعے میں پڑھا گیا)

جناب صدر، شرفائے ادب، خواتین و حضرات

آپ نے طلب فرمایا، میں حاضر ہو گیا۔ عذر و معذرت میں شاعرانہ کسر نفسی تک کے آداب ملحوظ رکھے۔ اب وسوسہ ہو رہا ہے کہیں ہم دونوں نے غلطی تو نہیں کی، عجلت میں "ایجاب و قبول" اکثر مہنگا پڑتا ہے۔ بہر حال اب تو اس افتاد کو خوش و ناخوش انگیز کرنا ہی پڑے گا۔ شریفوں میں یہی دستور چلا آ رہا ہے۔ عام طور پر ایسی تقریبوں میں، جن سے ہم آپ آج گزر رہے ہیں، ایک طرف مہمان اپنی نااہلی و معذوری اور دوسری طرف میزبان کے لطف و کرم کا اعتراف کرتا ہے۔ یقین مانیے زبان حال سے میں بھی کر رہا ہوں۔ لیکن اس وقت میرا حال اس حبشی طالب علم کا سا ہو رہا ہے جس کا پر تپاک خیر مقدم انگلستان کی ایک مشہور دانش گاہ کی انجمن اتحاد میں کیا گیا تو اس نے شکریے کی جوابی تقریر میں کہا.....

"صاحبو، آپ کے احسان و عنایت سے میرا عجیب عالم ہے۔"

*I am blushing all over ; Only you cant see it*

میرا بھی یہی حال ہے۔ اس لیے آپ مجھے بھی اس حبشی کی مانند سمجھیں، صرف اتنے سے فرق کے ساتھ کہ مجھے ہندوستان کا حبشی سمجھیے۔ جنوبی افریقہ کا نہیں! یہ اس لیے کہنا پڑا کہ آج کل دنیا کی غیر صالح سرگرمیوں میں "این ہم بچہ شتر است" کا ٹھپا بہت جلد لگا دیا جاتا ہے۔ کہیں میں نہ اس زد میں آ جاؤں۔

صاحبو، جس منصب پر اور جس تقریب میں اس وقت آپ مجھے دیکھ رہے ہیں وہ صرف آپ کے حکم کی تعمیل میں ہے ورنہ غالب کی زبان میں جام و سبو کب کا توڑ چکا تھا۔ آسمان سے بادۂ گلفام بھی برستا تو خاطر میں نہ لاتا لیکن کیا کیجیے، آسمان سے "بادۂ گلفام"

برسے یا نہ برسے، برقِ بے اماں اکثر گرا کرتی ہے۔ "روسیاہ" ہونے نہ ہونے کے علی الرغم، روئے سخن مشاعرہ کمیٹی کے کرتا دھرتا، آپ کے اور میرے مکرم، گوپی ناتھ امن کی طرف ہے۔ موصوف خود تو امن سے رہتے ہیں لیکن دوسرے کے لیے بے اماں ہیں۔ اس پر ستم یہ ہے کہ تعلقاتِ عامہ کو خوش گوار اور استوار رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ بہر حال، ستم ہویا کرم "می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہ اُوست"۔

حضرات، یہ جانتا ہوں کہ اس عظیم الشان مشاعرہ میں شعرائے کرام سے لطف اندوز ہونے کے لیے آپ نے زحمت اُٹھائی اور جلسے کو رونق بخشی ہے۔ ایسے میں میرا حائل ہو جانا کوئی قابلِ فخر بات نہیں۔ لیکن اُمید کرتا ہوں کہ جس طرح آپ ان دنوں ٹھنڈا اور مہنگائی برداشت کر رہے ہیں مجھے بھی انگیز کرنے کی کوشش کریں گے بشکر نہیں تو صبر سے کام لیجیے۔ تفریح میں تکلیف بھی کبھی کبھی مزا دے جاتی ہے۔ پھر بھی آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جو فرض مجھے سونپا گیا ہے اس کی جلد سے جلد خانہ پری کر کے، اربابِ شعر و سخن کے لیے جگہ خالی کر دوں گا لیکن ایسا کرنے میں کچھ دیر ہو جائے تو آپ آزردہ نہ ہوں، یہ فائدہ بھی کچھ کم نہیں کہ آپ کو ایسے شخص سے ایسا کلام سننے کی مشق ہو جائے گی جو پسندِ خاطر نہ ہو! یہ مشق آسان نہیں۔ آتے آتے آتی ہے۔ لیکن جب آجاتی ہے تو جمہور اور جمہوریت کے درمیان جو تفاوت ہے (اور کبھی کبھی یہ بہت زیادہ ہوتا ہے) وہ رفتہ رفتہ کم ہونے لگتا ہے اور دلسوزی اور دانش مندی، احتیاط و انتظار سے کام لیا جائے تو بالآخر دور ہو جاتا ہے اس لیے یہ مشق ہر قیمت پر ارزاں ہے۔

صاحبو، یہ جشنِ جمہوریہ کا سالانہ اُردو مشاعرہ ہے، احباب جمع ہیں "التفاتِ دلِ دوستاں" میسر ہے "دردِ دل" نہ کہہ سکوں یا مناسب پیرائے میں نہ کہہ سکوں اور جمہور و جمہوریت کے متشابہ کا شکار ہو جاؤں تو قابلِ عفو ہوں۔ ذاتی طور پر جو بات صحیح اور مناسب سمجھتا ہوں اسے کہہ ضرور دیتا ہوں یہ نہیں دیکھتا کہ اس کا اثر ہوا یا نہیں۔ البتہ اس کا اطمینان کر لیتا ہوں کہ پولیس یا پریس کی زد پر تو نہیں ہوں! تو کہنا یہ ہے کہ ہم جتنے "جمہور" ہیں، ہم میں ابھی اتنی "جمہوریت" نہیں آئی ہے! حکومت یقیناً جمہور کی یا جمہوریہ ہے جس کے لیے ہم آپ قابلِ تہنیت ہیں لیکن حکومت کے ساتھ جمہور کا بھی "جمہوریت نہاد" ہونا ازبس ضروری ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، آج کی اس مبارک تقریب میں اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے جمہور

جمہوریت کا تصور کیا اور کتنا ہے، اس لیے میرے نزدیک یہ اجتماع اتنا مشاعرہ نہیں ہے جتنا آزمائش! So Beware

صاحبو، اگر آپ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں تو امید ہے آج شب وہ آداب ملحوظ رکھے جائیں گے جو ایسی تقریبوں میں قلعہ معلیٰ اور حضرت دہلی" میں کبھی رکھے جاتے تھے جس کی بازیافت کے لیے ہم ہر سال اس موقع پر اکٹھا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کبھی یہ مشاعرے مخصوص حلقوں میں، مخصوص آداب کے ساتھ منعقد ہوتے تھے۔ شعرا اور سامعین بھی منتخب ہوتے تھے۔ مشاعرے ایک طرح کی آموزگاہیں ہوتی تھیں جہاں ہم حفظِ مراتب سیکھتے اور برتتے تھے ان سے ہمارے علمی و تہذیبی وقعت و وقار میں قیمتی اضافہ ہوا۔ اُستادی شاگردی کے رشتے قائم ہوتے جو تمام عمر اور نسلاً بعد نسلٍ شرف و سعادت کا سرچشمہ بنے رہتے!

لیکن دوستو اور بزرگو" زمانہ دگرگونہ آئین نہاد"۔ اب سلطانیٔ جمہور" کا زمانہ ہے اس لیے مشاعرے بھی اسی انداز کے ہونے لگے۔ لیکن بات تو پھر وہیں پہنچ گئی جہاں سے شروع ہوئی تھی یعنی مشاعرہ میں جمہوریت کی فضا بھی قائم رکھنا پڑے گی۔ بات صاف صاف ہی کیوں نہ کہی جائے کہ آپ کو ہر شاعر کا ہر طرح کا کلام تحمل سے سننا پڑے گا، چاہے وہ شاعر یا اس کا کلام آپ کو پسند آئے یا نہ آئے۔ دوسری طرف شعرائے عالی مقام سے عرض کروں گا کہ وہ" بازارِ مصر" میں آئے ہیں تو اس کے لیے بھی تیار رہیں کہ کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے گا چلن میں۔" یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے کلام کی تصنیف پر تو ریاض نہ کیا ہو اور حاضرین سے تحسین نہ پانے پر آزردہ بھی ہوں۔ کھلے بازار میں متاع کاسد کو فروغ نہیں ہوتا۔ شعروادب میں نہ Fair Price Shops ہوتی ہیں نہ بلیک مارکیٹ!

حضرات، اب ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جو ذرا تلخ ہے۔ اس پر شکر بھی نہیں چڑھا سکتا، اس لیے کہ سنتا ہوں اس نواح میں ان دنوں شکر رنجی تک کے لیے شکر" مشکل سے ملتی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ اتنا شاندار مشاعرہ جیسا کہ چند برسوں سے اسی لال قلعہ میں منعقد ہوتا ہے کسی اور جگہ نہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اس وقت میرے تصور میں ماضی کے وہ تمام تاریخی، علمی، تہذیبی اور سماجی مناظر ابھر رہے ہیں جن سے یقیناً آپ بھی ناآشنا نہیں ہیں، کتنے حسین و حزیں مناظر! ان کا تقاضا ہے کہ اس تقریب

کے شایان شان ہمارے شعرا اپنی بہترین اور تازہ ترین تخلیق شعری جن پر پورا سال اور بہترین توجّہ صرف کی گئی ہو، پیش کیا کریں۔ آپ یقیناً مجھ سے زیادہ اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے کلام سے اُردو شاعری کس درجہ وقیع ہو جائے گی۔ اور شعر و ادب پر ان شعراء کا کتنا بڑا احسان ہوگا۔ دوسری طرف یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے معرکے اور آزمائش کی تقریب میں کوئی شاعر اپنا پُرانا یا معمولی کلام سنانے کی جرأت کیوں کر کرتا ہے اور سامعین سُننا کیسے گوارا کر سکتے ہیں۔ کیسے مان لوں اور خاموش رہوں کہ شاعر ہوتے ہوئے وہ ایسا کر سکتا ہے۔ شاعر تو ملک اور قوم کی حمیت و آبرو ہوتا ہے۔ آخر وہ موقع کب آئے گا جب وہ اپنی بہترین شخصی و شعوری صلاحیتوں کو بر سر کار لائے گا۔ تکلّف برطرف اگر اسے اس کا احساس نہیں ہے تو اس کی جگہ اس محفل میں نہیں!

صاحبو! مجھے شاعر کی صحیح یا غلط شہرت سے شاعری کی منزلت زیادہ عزیز ہے۔ کوئی شاعر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، شاعری اور سامعین کے ساتھ بے تکلفی برتنے کا حق نہیں رکھتا۔ بالخصوص ایسے مشاعرے میں جیسا کہ آج منعقد ہے اور ہر سال ہوتا رہتا ہے۔ یہ اتنا مشاعرہ نہیں ہے جتنا معرکہ ہے۔ اگر شعرا نے اس موقع پر جی چرایا یا سہل انگاری سے کام لیا تو میرے نزدیک انھوں نے ہمارے اور ہمارے شعر و ادب کے ساتھ غدّاری کی جس کو نہ ہم کبھی معاف کر سکتے ہیں، نہ آنے والی نسلیں! میری اس بے باکی کو معاف کر دیجیے، غلط آدمی کو ایسے موقع پر انتخاب کرنے سے اسی طرح کی باتیں سننی پڑتی ہیں!

اب ایک بات جناب صدر سے بھی کہنی ہے وہ یہ کہ ان کے فرائض میں ایک ناقابل رشک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ شاعر کو سامعین کی اور سامعین کو شاعر کی بے تکلفی سے بچاتے رہیں۔ دونوں کو ایک لطیفہ بھی سنانا چاہتا ہوں! ایک مشہور لیکن کسی وقت غیر متمدن ملک میں ایک قاعدہ سا بن گیا تھا کہ وہاں کوئی گانے والا ہُنر جتانے اور روزی کمانے کے لیے آئے تو سامعین بڑے شوق سے اس کا گانا سننے آتے لیکن گانا اگر پسند نہ آتا یا اکتا جاتے تو بے تکلف اُسے گولی مار دیتے! بالآخر تقریب کے مہتمم کو جلی حرفوں میں یہ کتبہ ڈائس پر لگانا پڑا، جس کے پہلو میں کھڑا ہو کر گانے والا "عرض ہنر" کرتا تھا!

Gentleman, Don't Shoot the Singer, He

کتبہ تو اس وقت فراہم نہیں ہو سکتا۔ is trying his best امید ہے کہ اس گزارش کا سامعین لحاظ ضرور فرمائیں گے۔

صاحبو، کچھ ایسا محسوس کرنے لگا ہوں کہ آپ اب تک مجھ سے اکتائے نہیں۔ اس لیے اپنے اور آپ دونوں کے بارے میں کچھ شبہے میں پڑ گیا۔ بہر حال جب آپ کا عفو و کرم اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ مزید مجھے بے تکلف ہونے کی جرأت ہو رہی ہے، کسی اور سے اتنی نہیں جتنی بانیانِ مشاعرہ سے وہ یہ کہ یہ مشاعرہ ہمارے ملک میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس لیے اس سے ہم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تجویز یہ ہے کہ ہر سال کے مشاعرے کی سرگزشت نہایت معروضی طریقہ پر شرح و بسط سے کسی مستند اہل قلم سے مرتب کرائی جایا کرے، مثلاً کون کون سے شاعر کہاں کہاں سے آکر شریک ہوئے۔ ان کا فوٹو، ان کی زندگی کی مختصر روئداد، کلام کا نمونہ، اس پر تبصرہ، سامعین پر کلام کا ردعمل، اس کے علاوہ مقتدر ادبی شخصیتوں کا جو شریک بزم ہوئے، ان کے اسمائے گرامی اور مناسب تعارف محفل مشاعرہ کی ترتیب و تزئین، دوستانہ و منصفانہ طور پر، دل چسپ اور ادبی رنگ میں مرتب اور محفوظ کر لیے جایا کریں اس پر یقیناً دو چار ہزار روپے صرف ہوں گے جس کا فراہم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ لیکن اس کے مقابلے میں اس نفع کا اندازہ کیجیے جو امتدادِ زمانہ سے اُردو شعر و ادب کی سمت رفتار کے سمجھنے میں حاصل ہوگا۔ اُردو کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اُردو کے قدیم ناقص اور نامکمل تذکرے بھی آج کتنے کمیاب لیکن مفید ہیں، اس لیے اس مشاعرہ کی مکمل یادداشت آئندہ ہمارے لیے بڑا قیمتی سرمایہ ثابت ہوگی۔ اس پروگرام پر مناسب رد و بدل کے ساتھ ضرور عمل کیا جائے۔ اس طرح کی دستاویزوں سے قوم، ملک اور شعر و ادب کی ساکھ قائم ہوتی ہے۔

آخر میں اس دعا کے ساتھ سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں کہ آئندہ میری وجہ سے آپ اس آزمائش میں نہ مبتلا ہوں جس میں آج شب ہونا پڑا۔

اس اعتذار و اعتراف کے بعد، نہایت خوشی اور فخر سے آپ کے حکم کی تعمیل میں، اس مشاعرے کے افتتاح کا اعلان کرتا ہوں، خدا ہماری مدد فرمائے۔ آمین!

نیاز مند
رشید احمد صدیقی

(بشکریہ "جامعہ" دہلی)

شادعظیم آبادی (مرحوم)

# غزل

کٹ گئی شب تو، مبارک تم کو تنویرِ صبح
اے مؤذّن، اے شفق، اے آہِ پُرتاثیرِ صبح

رات آخر ہے، دکھا اے آسماں تنویرِ صبح
کیوں غلافِ شب میں کر رکھی نہاں تصویرِ صبح

یا حقیقت میں ہے باقی رات اب تک اے فراق
یا دَبا شورِ فغاں میں نعرۂ تکبیرِ صبح

کم نُما تارے کئی ہیں یا کہ پریاں غوطہ زن
موج خیز ایک نور کا دریا ہے یا نورِ صبح

تُجھ کو لازم ہے کئی نازک دماغوں کا لحاظ
باغ میں چھَن چھَن کے آئے اے صبا تنویرِ صبح

ہر طرف تسبیح خواں ہیں بُلبُل و درّاج و کُبک
باغ میں گل بانگ کا ہے شور یا تکبیرِ صبح

کھِل رہے ہیں سوسن و نسرین و ریحان و انار
نور تن پہنا گئی ہے باغ کو تاثیرِ صبح

جس طرف آنکھیں اُٹھاؤ عالمِ تصویر ہے
چھا گیا سارے جہاں پر حُسنِ عالم گیرِ صبح

بھینی بھینی بُو گُلوں کی لے چلی بادِ صبا
عطر بیزی دشت میں کرنے لگی تاثیرِ صبح

فیل جس دُھن میں مقید ہے اسی میں مور بھی
اک رسن میں تو نے جکڑا سب کو اے زنجیرِ صبح

گر مرا خونِ تمنّا بھی شفق میں مل گیا
رنگِ نو پیدا کرے گا صفحۂ تصویرِ صبح

شادؔ سُنتا ہوں کہ جنّت میں یہی ہوگا سماں
رُوح میری کیوں نہ خوش ہو دیکھ کر تصویرِ صبح

(بشکریہ "شاعر" بمبئی)

عصمت چغتائی

# بچھو پھوپی

(عصمت چغتائی کے افسانوں کے مجموعے "دو ہاتھ" سے لیا گیا)

جب پہلی بار میں نے اُنھیں دیکھا تو وہ رحمان بھائی کے پہلے منزلہ کی کھڑکی میں بیٹھی لمبی لمبی گالیاں اور کوسنے دے رہی تھیں۔ یہ کھڑکی ہمارے صحن میں کھلتی تھی اور قانوناً اُسے بند رکھا جاتا تھا۔ کیوں کہ پردے والی بی بیوں کا سامنا ہونے کا ڈر تھا۔ رحمان بھائی رنڈیوں کے جمعدار تھے۔ کوئی شادی بیاہ، ختنہ، بسم اللہ کی رسم ہوتی۔ رحمان بھائی اونے پونے ان رنڈیوں کو بلا دیتے اور غریب کے گھر میں بھی وحیدہ جان مشتری بائی اور انوری کہروا ناچ جاتیں۔

مگر محلے ٹولے کی لڑکیاں بالیاں اُن کی نظر میں اپنی سگی ماں بہنیں تھیں اُن کے چھوٹے بھائی بُندو اور گیندا آئے دن تانک جھانک کے سلسلے میں سر پھٹول کیا کرتے تھے۔ ویسے رحمان بھائی محلّے کی نظروں میں کوئی اچھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی بیوی کی زندگی ہی میں اپنی سالی سے جوڑ توڑ کر لیا تھا۔ اس یتیم سالی کا سوائے اس بہن کے اور کوئی نہ تھا۔ بہن کے ہاں پڑی تھی۔ اس کے بچے پالتی تھی۔ بس دودھ پلانے کی کسر تھی۔ باقی سارا گو موت وہی کرتی اور پھر کسی نک چڑھی نے اُسے بہن کے بچے کے مُنہ میں ایک دن چھاتی دیتے دیکھ لیا۔ بھانڈا پھوٹ گیا اور پتہ چلا کہ بچوں میں آدھے بالکل "خالہ" کی صورت پہ ہیں۔ گھر میں رحمان بھائی کی دلہن چاہے بہن کی دُرگت بناتی ہوں پر کبھی پنچوں میں اقرار نہ کیا۔ یہی کہا کرتی تھیں "جو کنواری کو کہے گا اُس کے دیدے گھٹنوں کے آگے آئیں گے" ہاں بر کی تلاش میں ہر دم سوکھا کرتی تھیں۔ پر اس کیڑے بھرے کباب کو کہاں جڑتا؟ ایک آنکھ میں یہ بڑی کوڑی سی پھلی تھی۔ پیر بھی ایک ذرا چھوٹا تھا۔ کولھا دبا کر چلتی تھی۔

سارے محلّے سے ایک عجیب طرح کا بائیکاٹ ہو چکا تھا۔ لوگ رحمان بھائی سے کام پڑتا تو دھونس جما کر کہہ دیتے محلّے میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی یہی کیا کم عنایت

تھی۔ رحمان بھائی اسی کو اپنی عزت افزائی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر طول طویل گالیاں دیا کرتی تھیں۔ کیوں کہ باقی محلے کے لوگ ابّا سے دبتے تھے۔ مجسٹریٹ سے کون بیر مول لے۔

اُس دِن پہلی دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہماری اکلوتی سگی پھوپی بادشاہی خانم ہیں اور یہ لمبی لمبی گالیاں ہمارے خاندان کو دی جا رہی تھیں۔

امّاں کا چہرہ فق تھا اور وہ اندر کمرے میں سہمی بیٹھی تھیں جیسے پھوپھوپی کی آواز ان پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے گی۔ چھٹے چھ ماہے اسی طرح بادشاہی خانم رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر ہنکارتیں۔ ابّا میاں اُن سے ذرا سی آڑ لے کر بڑے سے آرام کرسی پر دراز اخبار پڑھتے رہتے اور موقع محل پر کسی لڑکے بالے کے ذریعہ کوئی ایسی بات جواب میں کہہ دیتے کہ پھوپی بادشاہی پھر شتابیاں چھوڑنے لگتیں۔ ہم لوگ سب کھیل کود، پڑھنا لکھنا چھوڑ کر صحن میں گھتّا بنا کر کھڑے ہو جاتے اور مُرمُر اپنی پیاری پھوپی کے کوسنے سُنا کرتے۔ جس کھڑکی میں وہ بیٹھی تھیں وہ ان کے طُول طویل جسم سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ابّا میاں سے اتنی ہم شکل تھیں جیسے وہی مونچھیں اُتار کر دوپٹہ اوڑھ کر بیٹھ گئے ہوں اور باوجود کوسنے اور گالیاں سُننے کے ہم لوگ بڑے اطمینان سے تکا کرتے تھے۔

ساڑھے پانچ فٹ کا قد، چار انگل چوڑی کلائی، شیر کا سا کلّا، سفید بگلا بال، بڑا سا دہانہ، بڑے بڑے دانت، بھاری سی ٹھوڑی! اور آواز تو ماشاءاللہ ابّا میاں سے ایک سُر نیچی ہی ہوگی۔

پھوپی بادشاہی ہمیشہ سفید کپڑے پہنا کرتی تھیں۔ جس دن پھوپا مسعود علی نے مہترانی کے سنگ کلیلیں کرنی شروع کیں، پھوپی نے بٹّے سے ساری چوڑیاں چھناچھن توڑ ڈالیں۔ رنگا دوپٹہ اتار دیا اور اس دن سے وہ انھیں "مرحوم" "یا مرنے والا" کہا کرتی تھیں۔ مہترانی کو چھونے کے بعد انھوں نے وہ ہاتھ پیر اپنے جسم کو نہ لگنے دیے۔

یہ سانحہ خاصی جوانی میں ہوا تھا اور وہ جب سے "رنڈاپا" جھیل رہی تھیں۔ ہمارے پھوپا ہماری امّاں کے چچا بھی تھے۔ ویسے تو نہ جانے کیا گھپلا تھا۔ میرے ابّا میری امّاں کے چچا لگتے تھے اور شادی سے پہلے جب وہ چھوٹی سی تھیں تو میرے ابّا کو دیکھ کر ان کا پیشاب نکل جاتا تھا اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ان کی منگنی اسی بھیانک دیو سے ہونے والی

ہے تو انھوں نے اپنی دادی یعنی ابا کی پھوپی کی پٹاری سے افیون چرا کر کھالی تھی۔ افیون زیادہ نہیں تھی اور وہ کچھ دن لوٹ پوٹ کر اچھی ہو گئیں۔ اُن دنوں ابا علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے ان کی بیماری کی خبر سُن کر امتحان چھوڑ کر بھاگے۔ بڑی مشکل سے ہمارے نانا جو ابا کے پھوپی زاد بھائی بھی تھے اور بزرگ دوست بھی، انھوں نے سمجھا بجھا کر واپس امتحان دینے بھیجا تھا جتنی دیر وہ رہے بھوکے پیاسے ٹہلتے رہے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میری اماں نے اُن کا چوڑا چکلا سایہ پردے کے پیچھے بے قراری سے تڑپتے دیکھا۔

"امداد بھائی! اگر انھیں کچھ ہو گیا ...... تو ـــ" دیو کی آواز لرز رہی تھی۔ نانا میاں خوب ہنسے۔

"نہیں برادر خاطر جمع رکھو۔ کچھ نہ ہوگا۔"

اس وقت میری منّی سی معصوم ماں ایک دم عورت بن گئی تھی۔ اُس کے دل سے ایک دم دیو زاد انسان کا خوف نکل گیا تھا۔ جبھی تو میری پھوپی بادشاہی کہتی تھیں کہ میری اماں جادوگرنی ہے اور اس کا تو میرے بھائی سے شادی سے پہلے تعلق ہو کر پیٹ گرا تھا۔ میری اماں اپنے جوان بچوں کے سامنے جب یہ گالیاں سنتیں تو ایسی بسور بسور کر روتیں کہ ہمیں اُن کی مار فراموش ہو جاتی اور پیار آنے لگتا۔ مگر یہ گالیاں سُن کر ابا کی گمبھیر آنکھوں میں پریاں ناچنے لگتیں۔ وہ بڑے پیار سے ننھے بھائی کے ذریعے کہلواتے "کیوں پھوپی، آج کیا کھایا ہے؟"

"تیری میّا کا کلیجہ" اس بے تکے جواب سے پھوپی جل کر مرنڈا ہو جاتیں۔ ابا پھر جواب دلواتے۔

"ارے پھوپی، جب ہی مُنہ میں بواسیر ہو گئی ہے، جلاب لو جلاب!"

وہ میرے نوجوان بھائی کی مچلاتی لاش پر کوّوں، چیلوں کو دعوت دینے لگتیں۔ اُن کی دلہن کو جو نہ جانے بے چاری اس وقت کہاں بیٹھی اپنے خیالی دولھا کے عشق میں لرز رہی ہوگی، رنڈاپے کی دُعائیں دیتیں اور میری اماں کانوں میں انگلیاں دے کر بُدبُداتیں "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔"

پھر ابا اکساتے اور ننھے بھائی پوچھتے۔

"پھوپی بادشاہی، مہترانی پھوپی کا مزاج تو اچھا ہے؟ اور ہمیں ڈر لگتا کہ کہیں پھوپی کھڑکی میں سے نہ پھاند پڑیں۔

"اے جا سنپولیے! میرے منہ نہ لگ، نہیں تو جوتی سے مسل دوں گی۔ یہ بڈھا اندر بیٹھا کیا لونڈوں کو سکھا رہا ہے۔ مغل بچہ ہے تو سامنے آ کر بات کرے۔"

رحمان بھائی، اے رحمان بھائی، اس بوڑانی کتیا کو سکھیا کیوں نہیں کھلاتے۔" ابا کے سکھانے پر ننھے بھائی ڈرتے ہوئے بولتے۔ حالاں کہ انھیں ڈرنے کی کوئی ضرورت تو نہ تھی۔ کیوں کہ سب جانتے تھے کہ آواز ان کی ہے مگر الفاظ ابا میاں کے ہیں۔ لہٰذا گناہ ننھے بھائی کی جان پر نہیں۔ مگر پھر بھی بالکل ابا کی شکل کی پھوپی کی شان میں کچھ کہتے ہوئے انھیں پسینے آجاتے۔

کتنا زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہمارے ددھیال اور ننھیال والوں میں۔ ننھیال حکیموں گلی میں تھا اور ددھیال گاڑی بانوں کٹہرے میں۔ ننھیال والے سلیم چشتی کے خاندان سے تھے۔ جنھیں مغل بادشاہ نے مرشد کا رتبہ دے کر نجات کا راستہ پہچانا۔ ہندوستان میں اُسے بسے عرصہ گزر چکا تھا۔ رنگتیں سنولا چکی تھیں، نقوش نرم پڑ چکے تھے۔ مزاج ٹھنڈے ہو گئے تھے۔

ددھیال والے باہر سے سب سے آخری کیمپ میں آنے والوں میں سے تھے۔ ذہنی طور پر ابھی تک گھوڑوں پر سوار منزلیں مار رہے تھے۔ خون میں لاوا دہک رہا تھا۔ تلوار جیسے نقوش، لال فرنگیوں جیسے منہ، گُریلوں جیسی قد و قامت، شیروں جیسی گرجدار آوازیں، شہتیر جیسے ہاتھ پاؤں۔

اور ننھیال والے، نازک ہاتھ پیروں والے، شاعرانہ طبیعت کے، دھیمی آوازیں بولنے چالنے کے عادی، زیادہ تر حکیم، عالم اور مولوی تھے جبھی محلّے کا نام حکیموں گلی پڑ گیا تھا۔ کچھ کاروبار میں بھی حصہ لینے لگے تھے۔ شال باف، زردوزا اور عطار وغیرہ بن چکے تھے۔ حالاں کہ میری ددھیال والے ایسے لوگوں کو کنجڑے قصائی ہی کہا کرتے تھے کیوں کہ وہ خود زیادہ تر فوج میں تھے۔ ویسے مار دھاڑ کا شوق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کشتی، پہلوانی، تیراکی میں نام پیدا کرنا، پنجہ لڑانا، تلوار اور پٹے کے ہاتھ دکھانا اور چوسر پچیسی کو جو میری ننھیال کے مرغوب ترین کھیل تھے۔ ہیجڑوں کے کھیل سمجھنا۔

کہتے ہیں جب آتش فشاں پہاڑ پھٹتا ہے تو لاوا وادی کی گود میں اُتر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے ددھیال والے ننھیال والوں کی طرف خود بخود کھنچ کر آ گئے۔ یہ میل کب اور کس نے شروع کیا، سب شجرے میں لکھا ہے مگر مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ میرے دادا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ دادیاں بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ مگر ایک چھوٹی سی

بہن بن بیاہی تھی۔ نہ جانے کیوں کر وہ سخوں میں بیاہ دی گئی۔ شاید میری اماں کے دادا نے میرے دادا پر کوئی جادو کر دیا تھا کہ انھوں نے اپنی بہن بقول پھوپی بادشاہی کنجڑوں قصائیوں میں دے دی۔ اپنے "مرحوم" شوہر کو گالیاں دیتے وقت وہ ہمیشہ اپنے باپ کو قبر میں چین نہ ملنے کی بددعائیں دیا کرتیں جنھوں نے چغتائی خاندان کی مٹی پلید کر دی۔

میری پھوپی کے تین بھائی تھے۔ میرے تایا، میرے ابا میاں اور میرے چچا۔ بڑے دو اُن سے بڑے تھے اور چچا سب سے چھوٹے تھے۔ تینوں بھائیوں کی ایک لاڈلی بہن ہمیشہ کی نخریلی اور تنک مزاج تھیں۔ وہ ہمیشہ تینوں پر رُعب جماتیں اور لاڈ کرواتیں۔ بالکل لونڈوں کی طرح پلیں۔ شہ سواری، تیراندازی اور تلوار چلانے کی بھی خاصی مشق تھی۔ ویسے تو پھیل پھال کر ڈھیر معلوم ہوتی تھیں مگر پہلوانوں کی طرح سینہ تان کر چلتی تھیں۔ سینہ تھا کبھی چار عورتوں جتنا۔

ابا مذاق میں اماں کو چھیڑا کرتے۔

"بیگم، بادشاہی سے کشتی لڑو گی؟"

"اوئی توبہ میری" عالم فاضل باپ کی بیٹی میری اماں کانوں پر ہاتھ دھر کر کہتیں۔

مگر وہ ننھے بھائی سے فوراً پھوپی کو چیلنج بھجواتے۔

"پھوپی، ہماری اماں سے کشتی لڑو گی؟"

"ہاں۔ ہاں بُلا اپنی اماں کو۔ آجائے خم ٹھونک کر۔ ارے الّو نہ بنا دوں تو مرزا کریم بیگ کی اولاد نہیں۔ بُلا ملّازادی کو........" اور میری اماں اپنا لکھنؤ کا بڑے پائنچوں کا پاجامہ سمیٹ کر کونے میں دُبک جاتیں۔

"پھوپی بادشاہی، دادا میاں گنوار تھے نا؟ بڑے نانا جان انھیں آمدنامہ پڑھایا کرتے تھے۔" ہمارے پرنانا کے دادا جان نے کبھی دادا میاں کو کچھ پڑھا دیا ہوگا۔ ابا میاں چھیڑنے کو بات توڑ موڑ کر کہلواتے۔

ارے وہ اسُنّیجے کا ڈھیلا کیا میرے باوا کو پڑھاتا۔ مُجاور کہیں کا، ہمارے ٹکڑوں پر پلتا تھا" یہ سلیم چشتی اور اکبر بادشاہ کے رشتے سے حساب لگایا جاتا۔ ہم لوگ یعنی چغتائی اکبر بادشاہ کے خاندان سے تھے جنھوں نے میری ننھیال کے سلیم چشتی کو پیرومرشد کہا تھا۔ مگر پھوپی کہتیں "خاک پیرومرشد کی دُم! مُجاور تھے مُجاور"

تین بھائی تھے مگر تینوں سے لڑائی ہو چکی تھی۔ وہ غصّہ ہوتیں تو تینوں کی دھجیاں بکھیر دیتیں۔ بڑے بھائی بڑے اللہ والے تھے، انھیں حقارت سے فقیر اور بھک منگا کہتیں۔ ہمارے ابا گورنمنٹ سروس میں تھے، انھیں غدّار اور انگریزوں کے غلام کہتیں، کیوں کہ مغل شاہی انگریزوں نے ختم کر ڈالی ورنہ آج 'مرحوم' پتلی دال کے کھانے والے مُلا ہے یعنی میرے پھوپا کے بجائے وہ لال قلعے میں زیب النساء کی طرح عرق گلاب میں غسل فرما کر کسی ملک کے شہنشاہ کی ملکہ بنی بیٹھی ہوتیں۔ تیسرے یعنی چچا دس نمبر کے بدمعاشوں میں سے تھے اور سپاہی ڈرتا ڈرتا مجسٹریٹ بھائی کے گھر اُن کی حاضری لینے آیا کرتا تھا۔ انھوں نے کئی قتل کیے تھے۔ ڈاکے ڈالے تھے۔ شراب اور رنڈی بازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ انھیں ڈاکو کہا کرتی تھیں جو ان کے کیریکٹر کو دیکھتے ہوئے قطعی ٹھُس پھُسا لفظ تھا۔

مگر جب وہ اپنے 'مرحوم' شوہر سے غصّہ ہوتیں تو کہا کرتیں "مُنہ جلے۔ نگوڑ ماری ناہٹی نہیں ہوں۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ اُن کو خبر ہو گئی تو دُنیا کا نہ رہے گا۔ اور کچھ نہیں اگر چھوٹا سُن لے تو پل بھر میں انتڑیاں نکال کے ہاتھ میں تھما دے۔ ڈاکو ہے ڈاکو۔۔۔ اس سے بچ گیا تو منجھلا مجسٹریٹ تجھے جیل میں سڑوا دے گا۔ ساری عمر چکیاں پسوائے گا اور اس سے بھی بچ گیا تو بڑا جو اللہ والا ہے، تیری عاقبت خاک میں ملا دے گا۔ دیکھ مغل بچی ہوں۔ تیری امّاں کی طرح شیخانی فنانی نہیں" مگر میرے پھوپا اچھی طرح جانتے تھے کہ تینوں بھائی اُن ہی پر رحم کھاتے ہیں اور وہ بیٹھے مسکراتے رہتے ہیں۔ وہی میٹھی میٹھی زہریلی مسکراہٹ جس کے ذریعے سے میرے ننھیال والے ددھیال والوں کو برسوں سے جلا رہے ہیں۔

ہر عید بقر عید کو میرے ابا میاں بیٹوں کو لے کر عید گاہ سے سیدھے پھوپی امّاں کے ہاں کوسنے اور گالیاں سننے جایا کرتے۔ وہ فوراً پردہ کر لیتیں اور کوٹھری میں سے میری جادوگرنی ماں اور ڈاکو ماموں کو کوسنے لگتیں۔ نوکر کو بلا کر سوّیاں بھجواتیں۔ مگر یہ کہتیں "پڑوسن نے بھیجی ہیں۔"

"اُن میں زہر تو نہیں ملا ہوا ہے؟" ابا چھیڑنے کو کہتے اور پھر ساری ننھیال کے چیتھڑے بکھر جاتے۔ سوّیاں کھا کر ابا عیدی دیتے جو وہ فوراً زمین پر پھینک دیتیں کہ "اپنے سالوں کو دو۔ وہی تمہاری روٹیوں پر پلے ہیں" اور ابا چپ چاپ چلے آتے اور وہ جانتے تھے کہ پھوپی بادشاہی وہ روپے گھنٹوں آنکھوں سے لگا کر روتی رہیں گی۔ بھتیجوں کو وہ آڑ میں بلا کر عیدی دیتیں۔

"حرامزادو! اگر امّاں ابّا کو بتلایا تو بوٹیاں کاٹ کر کتّوں کو کھلا دوں گی" امّاں ابّا کو معلوم تھا کہ کتنی عیدی ملی۔ اگر کسی عید پر کسی وجہ سے ابّا میاں نہ جا پاتے تو پیغام پر پیغام آتے۔ "نصرت خانم بیوہ ہو گئیں، چلو اچھا ہوا۔ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا" بُرے بُرے پیغام شام تک آتے ہی رہتے اور پھر وہ خود رحمان بھائی کے کوٹھے پر سے گالیاں برسانے آجاتیں۔

ایک دن عید کی سویّاں کھاتے کھاتے کچھ گرمی سے جی مالش کرنے لگا۔ ابّا میاں کو اُلٹی ہو گئی۔

"بادشاہی خانم کہا سنا معاف کرنا، ہم تو چلے" ابّا میاں نے کراہ کر آواز بنائی اور پھوپی لشتم پشتم پردہ پھینک چھاتی کوٹتی نکل آئیں۔ ابّا کو شرارت سے ہنستا دیکھ اُلٹے پاؤں کوستی ہوئی لوٹ گئیں۔

"تم آگئیں بادشاہی تو ملک الموت بھی گھبرا کر بھاگ گئے۔ ورنہ ہم تو آج ختم ہی ہو جاتے" ابّا نے کہا۔ نہ پوچھیے پھوپی نے کتنے وزنی کوسنے دیے۔ انھیں خطرے سے باہر دیکھ کر بولیں۔ "اللہ نے چاہا بجلی گرے گی۔ نالی میں گر کر دم توڑ دگے۔ کوئی میّت کو کاندھا دینے والا نہ بچے گا" اور ابّا چڑانے کو انھیں دو روپے بھجوا دیتے۔

"بھئی ہماری خاندانی ڈومنیاں گالیاں دیں تو انھیں بیل تو ملنی ہی چاہیے" اور پھوپی بوکھلاہٹ میں کہہ جاتیں۔

"بیل دے اپنی امّاں بہنیا کو" اور پھر فوراً اپنا منہ پیٹنے لگتیں۔ خود ہی کہتیں "اے بادشاہی بندی، تیرے منہ کو کالک لگے۔ اپنی میّت آپ پیٹ رہی ہے۔" پھوپی کو اصل میں بھائی سے ہی بیر تھا۔ بس ان کے نام پر آگ لگ جاتی۔ ویسے کہیں ابّا کے بغیر امّاں نظر آجاتیں تو گلے لگا کر پیار کرتیں۔ پیار سے نُچھو نُچھو کہتیں۔ "بچّے تو اچھے ہیں"۔ وہ بالکل بھول جاتیں کہ یہ بچّے اسی بدذات بھائی کے ہیں جسے وہ ازل سے ابد تک کوستی رہیں گی۔ امّاں ان کی بھتیجی بھی تو تھیں۔ بھئی کس قدر گھپلا تھا میری ددھیال ننھیال میں۔ ایک رشتے سے میں اپنی امّاں کی بہن بھی لگتی تھی۔ اس طرح میرے ابّا میرے دولہا بھائی بھی ہوتے تھے۔ میری ددھیال کو ننھیال والوں نے کیا کیا غم نہ دیے۔ غضب تو جب ہوا جب میری پھوپی کی بیٹی مسرّت خانم ظفر ماموں کو دل دے بیٹھیں۔

ہوا یہ کہ میری امّاں کی دادی ابّا کی پھوپی جب لب دم ہوئیں تو دونوں طرف کے لوگ

تیمارداری کو پہنچے۔ میرے ماموں بھی اپنی دادی کو دیکھنے گئے اور مسرت خانم بھی اپنی اماں کے ساتھ ان کی پھوپی کو دیکھنے آئیں۔

بادشاہی پھوپی کو کچھ ڈر خوف تو تھا نہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ میرے ننھیال والوں کی طرف سے انھوں نے اپنی اولاد کے دل میں اطمینان بخش حد تک نفرت بھر دی ہے اور پندرہ برس کی عمر میں مسرت خانم کا ابھی سن ہی کیا تھا۔ اماں کے کولھے سے لگ کر سوتی تھیں۔ دودھ پیتی ہی تو آنکھیں لگتی تھیں۔

پھر جب میرے ماموں نے اپنی کرنجی شربت بھری آنکھوں سے مسرت جہاں کے جھلدار سراپے کو دیکھا تو دیٹیں کی دیٹیں جم کر رہ گئیں۔

دن بھر بڑے بوڑھے تیمارداری کر کے تھک ہار کر سو جاتے تو یہ فرمانبردار بچے سرہانے بیٹھے مریضہ پر کم، ایک دوسرے پر زیادہ نگاہ رکھتے۔ جب مسرت جہاں برف میں تر کپڑا بڑی بی کے ماتھے پر بدلنے کو ہاتھ بڑھاتیں تو ظفر ماموں کا ہاتھ وہاں پہلے سے موجود ہوتا۔

دوسرے دن بڑی بی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں لرزتی کانپتی گاؤ تکیے کے سہارے اُٹھ بیٹھیں۔ اُٹھتے ہی سارے خاندان کے ذمہ دار لوگوں کو طلب کیا۔ جب سب جمع ہوئے تو حکم ہوا "قاضی کو بلواؤ۔"

لوگ پریشان کہ بڑھیا قاضی کو کیوں بلا رہی ہے۔ کیا آخری وقت سہاگ رچائے گی۔ کس کو دم مارنے کی ہمت تھی۔

"دونوں کا نکاح پڑھاؤ" لوگ چکرائے کن دونوں کا۔ مگر اِدھر مسرت جہاں پٹ سے بے ہوش ہو کر گریں اُدھر ظفر ماموں بوکھلا کر باہر چلے۔ چور پکڑے گئے۔ نکاح ہو گیا۔ بادشاہی پھوپی سناٹے میں رہ گئیں۔

حالاں کہ کوئی خطرناک بات نہ ہوئی تھی۔ دونوں نے صرف ہاتھ پکڑے تھے۔ مگر بڑی بی کے لیے بس یہی حد تھی۔

اور پھر جو بادشاہی پھوپی کو دورہ پڑا ہے تو بس گھوڑے اور تلوار کے بغیر ہی انھوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ کھڑے کھڑے بیٹی داماد کو نکال دیا۔ مجبوراً ابّا میاں دولھا دُلھن کو اپنے گھر لے آئے۔ اماں تو چاند سی بھابی کو دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ بڑی دھوم دھام سے ولیمہ کیا۔ بادشاہی پھوپی نے اُس دن سے اپنی بیٹی کا مُنہ نہیں دیکھا۔ بھائی سے

پردہ کرلیا۔ میاں سے پہلے ہی ناچاقی تھی۔ دنیا سے منہ پھیرلیا۔ ایک زہر تھا کہ اُن کے دل ودماغ پر چڑھتا ہی گیا۔ زندگی سانپ کے پھن کی طرح ڈسنے لگی۔

"بڑھیا نے پوتے کے لیے میری بچی کو پھنسانے کے لیے مکر گانٹھا تھا۔"

وہ برابر یہی کہے جاتیں۔ کیوں کہ واقعی وہ اس کے بعد بیس سال تک اور جئیں کون جانے ٹھیک ہی کہتی ہوں پھوپی۔

مرتے دم تک بہن بھائی میں میل نہ ہوا۔ جب ابا میاں پر فالج کا چوتھا حملہ ہوا اور بالکل ہی وقت آگیا تو انھوں نے پھوپی بادشاہی کو کہلا بھیجا۔

"بادشاہی خانم، ہمارا آخری وقت ہے۔ دل کا ارمان پورا کرنا ہو تو آجاؤ۔"

نہ جانے اس پیغام میں کیا تیر چھپے تھے۔ بھیا نے پھینکے اور بہنیا کے دل میں ترازو ہوگئے۔ ہلہلاتی، چھاتی کوٹتی، سفید پہاڑ کی طرح بھونچال لاتی ہوئی بادشاہی خانم اس ڈیوڑھی پر اتریں جہاں اب تک انھوں نے قدم نہیں رکھا تھا۔

لو بادشاہی، تمھاری دعا پوری ہو رہی ہے" ابا میاں تکلیف میں بھی مسکرا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اب بھی جوان تھیں۔

پھوپی بادشاہی باوجود سفید بالوں کے وہی منّی سی بچھّو لگ رہی تھیں جو بچپن میں بھائیوں سے مچل مچل کر بات منوا لیا کرتی تھیں۔ اُن کی شیر جیسی خرانٹ آنکھیں، ایک میمنے کی معصوم آنکھوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے آنسو اُن کی سنگِ مرمر کی چٹان جیسے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"ہمیں کوسو بچھّو بی" ابا نے پیار سے کہا۔ میری امّاں نے سسکتے ہوئے بادشاہی خانم سے کوسنے کی بھیک مانگی۔

"یا اللہ.... یا اللہ......" انھوں نے گرجنا چاہا۔ مگر کانپ کر رہ گئیں "یا....

....اللہ...... اللہ...... میری عمر میرے بھیا کو دیدے....... یا مولا........

... اپنے رسولؐ کا صدقہ......" وہ اُس بچے کی طرح جھنجلا کر رو پڑیں جسے سبق یاد نہ ہو۔

سب کے منہ فق ہوگئے۔ امّاں کے پیروں کا دم نکل گیا۔ یا خدا آج بچھّو پھوپی کے منہ سے بھائی کے لیے ایک کوسنا نہ نکلا۔

صرف ابا میاں مسکرا رہے تھے جیسے اُن کے کوسنے سُن کر مسکرا دیا کرتے تھے۔

سچ ہے بہن کے کوسنے بھائی کو نہیں لگتے۔ وہ ماں کے دودھ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔

## شرابِ کہنہ

# مومن

۱۸۰۰ء ——————— ۱۸۵۱ء

حکیم مومن خاں مومن۔ گھر والوں کا رکھا ہوا نام حبیب اللہ، مگر دنیا ان کو اُسی نام اور تخلص سے جانتی اور یاد کرتی ہے جو اُن کے بزرگوں کے بزرگ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے پیدائش کے وقت تجویز کر دیا تھا۔

مومن کے دادا حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں شاہ عالم کے عہد میں کشمیر سے دلی آئے تھے اور شاہی طبیبوں میں داخل ہو گئے تھے۔ حسنِ خدمات کے صلے میں جاگیر، مراعات وظیفہ اور پنشن کا جو سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوا تھا وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور تک مومن خاں کو بھی ملتا رہا۔

ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی عربی درسیات کی تکمیل شاہ عبدالقادر سے کی طب اپنے والد غلام نبی خاں اور چچا سے پڑھی پھر انھیں بزرگوں کی زیرِ نگرانی اپنے آبائی مطب میں نسخہ نویسی کی۔ بے حد ذہین اور غیر معمولی حافظے کے مالک تھے۔ حساس طبیعت اور موزوں سرشت تھے ہی شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے چند دنوں شاہ نصیر سے اصلاح لی اس کے بعد اس سلسلے کو ترک کر کے اپنی خداداد صلاحیتوں سے ایک صاحبِ طرز شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہونے لگے۔ شیفتہ، تسکین، وحشت اور نسیم جیسے مشاق اور صاحبِ دیوان شاعروں نے ان کو اپنا اُستاد بنایا۔

طب اور شاعری کے علاوہ علم نجوم سے زبردست واقفیت اور رمل کی مہارت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ وقت کے بہترین شطرنج کھیلنے والوں میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔

مومن خاں نہایت خوش رو، خوش آواز، جامہ زیب، زندہ دل، یار باش اور رنگین مزاج آدمی تھے۔ تین تیس سال کی عمر میں دنیا کی لذتوں اور جوانی کے مشغلوں سے کنارہ کش ہو کر سید احمد شہید کے مرید ہو گئے اور اس کے بعد کی زندگی زہد و پاک بازی کے عالم میں گزاری۔

مومن اپنے عہد کے بڑے جامع اور باکمال شاعر تھے کوئی صنفِ سخن ایسی نہیں جس میں دادِ سخن وری نہ دی ہو۔ انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے، مثنویوں میں ان کی آپ بیتی جھلکتی ہے۔ قصائد میں خودداری، مذہبیت اور خود پسندی یا ایک جگہ شکر گزاری نظر آتی ہے۔ قطعات اور تاریخوں میں لطف و اعتماد کے ساتھ عام راہ سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی ہے غزلیں ان کی نازک خیالی، معنی آفرینی، اثر، کیف اور ترنم سے لبریز ہیں۔ اُمرا کی مداحی یا ہجو گوئی سے اپنا قلم یا زبان آلودہ نہیں کی۔ دولت و شہرت کی خاطر اپنے وطن سے باہر جا کر رہنا ہرگز گوارا نہیں کیا۔ منصب و توقیر حاصل کرنے کے موقعے کئی بار آئے مگر انھوں نے اپنا رُخ اس طرف کیا ہی نہیں۔

ان اوصاف و کمالات کے باوجود بعض اعتقادی مسائل اور علمی معاملات میں ان کے یہاں غلو، اور شدّت بھی پائی جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ مومن خاں اپنے بعض ہم عصروں کے مقابلے میں زرا دیر میں ممتاز و مقبول ہوئے۔ بہر کیف آج بیسویں صدی کا سخت سے سخت نقّاد اور نکتہ چین مومن کی غزل گوئی کا مدّاح اور ان کے اکثر محاسن کا معترف ہے۔

اُردو کلیات کے علاوہ مومن کا فارسی زبان میں بھی ایک دیوان موجود ہے جس کی "دل فریبیاں" بعض لوگوں کے خیال میں اُردو کے کلام سے کچھ کم نہیں ہیں۔

## انتخاب

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں جاری — چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

نہ مانوں گا نصیحت، پر نہ سُنتا میں تو کیا کرتا — کہ ہر ہر بات میں ناصح تمھارا نام لیتا تھا

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں — اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم — منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

تا نہ خلل پڑے کہیں آپ کے خوابِ ناز میں — ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں	تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام	آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع	مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

کیسے گلے رقیب کے کیا طعنِ اقربا	تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھے وہ	بدنامیٔ عشّاق کا اعزاز تو دیکھو

صبحِ عشرت ہے نہ شامِ وصال	ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

سوتے سے اُٹھ کر آئے ہیں، یارب نہ جائیں وہ	شرمندہ آہِ شب سے دُعائے سحر نہ ہو

مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجرِ یار کی	آخر تو دشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ

تابِ نظّارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں	اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

ہم نکالیں گے سُن اے موجِ ہوا بل تیرا	اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

---

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ	تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

---

کیوں کر یہ کہیں منّتِ اعدا نہ کریں گے	کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسےٰؑ	اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھّا نہ کریں گے

---

شبِ ہجر میں ہجومِ بلا ہے	زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

---

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے	تم نے اچھّا کیا نباہ نہ کی

---

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی	تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

کہا اُس بُت سے مرتا ہوں، تو مومن	کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

---

خدا کی بے نیازی ہائے مومن	ہم ایماں لائے تھے نازِ بتاں سے

---

# پاکستانی رسائل

۱۔ **اُردو نامہ** (سہ ماہی) ترقی اُردو بورڈ، کراچی (شمارہ نہم جولائی ۶۲ء تا شمارہ دہم اکتوبر ۶۲ء فی پرچہ -/۱)

۲۔ **سویرا**، لاہور (شمارہ ۱۷-۱۸ -/۳، شمارہ ۲۲ تا ۲۴ فی -/۲، شمارہ ۲۷ ۳/۵۰،
شمارہ ۲۸ -/۴، شمارہ ۲۹ -/۵، شمارہ ۳۳ -/۲)

۳۔ **صحیفہ** (سہ ماہی) مجلس ترقی ادب، لاہور (شمارہ ۱۱ و ۱۲ فی ۲/۲۵، شمارہ ۱۵ -/۱،
شمارہ ۱۶ تا ۲۱ فی -/۲، شمارہ ۲۲ تا ۲۵ فی ۱/۵۰)

۴۔ **نیا دور**، کراچی (شمارہ ۲۷-۲۸ -/۲، شمارہ ۲۹-۳۰ -/۴، شمارہ ۳۱-۳۲ -/۳)

۵۔ **نگار**، کراچی (نیاز نمبر دو جلد -/۸، خدا نمبر -/۳، ہماری شاعری نمبر -/۴، مصحفی نمبر -/۳،
اقبال نمبر -/۲، نظیر اکبرآبادی نمبر -/۳، تازہ شمارہ ۰/۷۵)

۶۔ **سیارہ**، کراچی (اقبال نمبر ۲/۵۰)

۷۔ **سوغات**، کراچی (خاص نمبر -/۴)

۸۔ **افکار**، کراچی (شمارہ نمبر ۱۴۷ -/۱، تازہ شمارہ -/۱)

۹۔ **نقش**، کراچی (فروری ۶۲ء، مارچ ۶۳ء، اپریل ۶۳ء فی -/۱)

۱۰۔ **الزبیر**، بہاولپور (غیر ملکی افسانہ نمبر ۱/۵۰)

۱۱۔ **نقوش**، لاہور (شوکت نمبر -/۷، عام شمارہ ۹۳ -/۳)

---

"جامعہ" دہلی کے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۷ء تک کے مختلف شمارے بھی مل سکتے ہیں
جن کی تفصیل ایک خط بھیج کر معلوم کی جا سکتی ہے۔

ملنے کا پتہ:- **مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ۔ جے جے ہسپتال، بمبئی ۳**

پاکستانی رسائل کے خریدار اگر اپنا پتہ (انگریزی میں) ہماری بمبئی برانچ پر نوٹ کرا دیں گے تو
انھیں ان کے پسندیدہ رسائل کے آنے پر مطلع کر دیا جائے گا۔ براہ کرم اپنا پتہ آج ہی بھجوا دیجئے۔ شکریہ

# نئی مطبوعات

| کتاب | | مصنف | قیمت | ملنے کا پتہ |
|---|---|---|---|---|
| نزہتِ دل | (مجموعہ کلام) | مہر بھسلائی | | بمبئی میں ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی ۳ |
| چاند کا گھاؤ | (ناول) | کرشن چندر | ۵/۰ | " پنجابی پستک بھنڈار، دہلی |
| دل کی آگ | ( " ) | گوردیو سنگھ | ۳/۵۰ | " گرونے پبلشرز، بھنڈار |
| رُبابی | ( " ) | عذرا جمال | ۷/- | " اُردو مرکز، دہلی ۱۱ |
| میاں بیوی کے حقوق | (مذہب) | مفتی عبدالغنی | ۵/۰ | " دینی بک ڈپو، دہلی |
| مواعظ اوّل | (تقاریر) | مولانا اشرف علی تھانوی | ۱/۳۷ | " " " " |
| " دوم | ( " ) | " " | ۱/۳۷ | " " " " |
| کلیاتِ شکیل | (کلیات) | شکیل بدایونی | ۳/- | " اعوان پبلیکیشنز، کراچی |
| غلاموں کا دیس | (ناول) | مائل ملیح آبادی | ۲/۵۰ | " " " " |
| چند تصویرِ بُتاں | ( " ) | عادل رشید | ۳/۲۵ | " " " " |
| نگاہِ اُلفت | ( " ) | مجاہد لکھنوی | ۲/۵۰ | " " " " |

---

## آرٹ ـــــــ سید مجیداللہ

آرٹ ایک بڑا جامع اور وسیع المعانی لفظ ہے۔ اس کے اظہار کے بے شمار اسلوب، اس کی تشریح کے جُدا جُدا انداز اور تشکیل کے بنتے نئے طرز اور اصول ہیں۔ یہ کتاب آرٹ کی معرفت اور مختلف النوع قسموں کی اجمالی سیر کراتی ہے۔

قیمت ۳/-

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## "وادیٔ گل"

(سن طباعت ۱۹۶۳ء)

از: رفعت سروش
صفحات: ۱۷۶ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد
قیمت: تین روپے ۲۵
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی

رفعت سروش کا نام موجودہ اردو شاعری میں جانا پہچانا نام ہے۔ وہ ۱۹۳۸ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اس طرح اُن کی شاعری پر چوتھائی صدی بیت چکی ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے مجموعہ اشعار کی طباعت کے سلسلے میں اُس جلدبازی سے کام نہیں لیا جس پر "کاتا اور لے دوڑے" کی مثل صادق آئے، بلکہ انھوں نے اس کا انتظار کیا کہ اُن کی شاعری کوئی خاص نہج اختیار کرلے اور ان کا فن اپنے مزاج کو پہچاننے لگے تب وہ اپنے اشعار کو بازار میں لائیں۔ اس طرح اگرچہ "وادیٔ گل" ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ لیکن اس میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۲ء تک کی بیس برس کی نظمیں شامل ہیں۔ ابتدائی غزلیں، طویل نظمیں اور نغمے اس کے علاوہ ہیں اور بعد کے مجموعوں میں پیش کیے جانے والے ہیں۔

اڑتیس برس کی عمر کو طویل نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس عمر میں بھی سروش نے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے اور ہزاروں تجربے کیے ہیں۔ وہ بقول خود "شورش جہاں" اور "نغمۂ جواں" دونوں سے کھیلے ہیں اور زندگی کے ہر تجربے اور حادثے سے شعر کے صنم تراشتے رہے ہیں۔ ان کا تصوّر حقیقت بھی انفرادی اور ذاتی نہیں بلکہ آفاقی ہے، اور اس کا خمیر رجعت پسندی سے نہیں بلکہ ترقی پسندی سے تعمیر ہوا ہے۔

رفعت سروش کی شاعری، تلاش حُسن میں تڑپتی ہوئی رُوح کی شاعری ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کا تخیّل لمسِ حسن کی لطافتوں سے آشنا ہے۔ "نجم سحر"

"طوفان سو گئے ہیں"۔ "دُلھن"۔ "حریم ناز"۔ "تجسس"۔ "محرومی"۔ "گھر کی رانی" اور اس سے قبیل کی دوسری نظموں میں حقائق میں پوشیدہ اور سطح خیال پر بکھرے ہوئے حسن کی جھلک نظر آتی ہے اور تسکین ذوق کا سامان مہیا کرتی ہے۔ "مخصوص مسافر" کی طرح کی نظموں میں خطیبانہ انداز بھی آیا ہے اور "آخری جام" میں چراغ سے چراغ جلانے کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن مجموعی حیثیت، رفعت سروش کی نظموں میں ایک اپناپن ہے۔ یہ ترقی پسند ادب کے جذباتی دور کے بعد کی شاعری ہے، جس میں روایت وفن سے بیگانگی یا بغاوت کا جذبہ مدھم پڑ چکا ہے اور جن نئی راہوں کی طرف پیش رو صرف اشارے کر پائے تھے، شاعر کی صلاحیت اظہار اُسے اُن راہوں پر دور تک لے گئی ہے اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ رفعت سروش کی سعی مشکور ہے۔

رفعت سروش کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فن کے تقاضوں سے آنکھیں نہیں موڑتے اور طرز اظہار ندرت و لطافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ حسن و عشق کا افسانہ ہو، یا کشمکش حیات کی کہانی، ہزار دہرائی ہوئی بات ہو، یا بالکل ہی ذاتی واردات، سروش کے کہنے کا اپنا انداز ہے، جس میں احساس کی نزاکت بھی ہے، اور شاعرانہ وضاحت بھی۔ سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اُن کے یہاں "وہ فنّی کھانچے" نہیں ملتے جس کو بعض بے راہ روفن کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔

اُمید ہے کہ رفعت سروش کے اس مجموعہ کا ادبی حلقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا۔

علی جواد زیدی



## اُردو رُباعیات
(سن اشاعت ۱۹۶۳ء)

از: ڈاکٹر سلام سندیلوی
صفحات: ۸۲۹ سائز $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ مجلد
قیمت: بارہ روپے
ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

رباعی پر اب تک ہماری زبان اور ہمارے ملک میں کوئی مخصوص اور جامع کتاب نہیں لکھی گئی، اس کمی کو محسوس کر کے ڈاکٹر سلام سندیلوی نے عنوان پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا

اور ۱۹۵۷ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر مقالے میں ترمیم و اضافہ کرکے ایک ضخیم اور مبسوط کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے کتاب کا آغاز ڈاکٹر وحید مرزا اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے پیش لفظ سے ہوا ہے۔ اس کے بعد مؤلف کا دیباچہ ہے۔

پوری کتاب میں کل آٹھ باب ہیں جن میں "رباعی کی ایجاد" سے "اردو رباعی کی سمت اور مستقبل" تک کی تمام جزویات اور تفصیلات کا احاطہ کیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ رباعی کے سلسلے کی کوئی بحث، اصول، قیاس، اختلافی مسئلہ ایسا نہیں جس پر تحقیقی نگاہ نہ ڈالی گئی ہو اور پھر اس پر ایک متوازن لب و لہجے سے اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔

اسی کاوش اور اہتمام کا نتیجہ ہے کہ رباعی کی ضمن میں فارسی اور اردو شاعری کی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ حسنِ اتفاق سے ان دونوں زبانوں کے اکثر خوش گو اور ممتاز شاعروں نے رباعی پر ضرور طبع آزمائی کی ہے۔ چناں چہ رودکی اور اس کے ہم عصر ابوشکور بلخی (فارسی کا اولین رباعی گو) سے لے کر خواجہ عزیز لکھنوی اور غلام قادر گرامی تک، پھر اردو میں محمد قلی قطب شاہ (اردو کا پہلا رباعی گو) سے لے کر جوش، فراق اور اثر صہبائی تک غرض ایک ہزار سال کا فارسی شاعری کا جائزہ اور تین سو سال کی اردو شاعری کا احاطہ کرکے صدہا شاعروں کے کلام سے رباعیوں کی تلاش، چھان بین، پھر ان کو عشقیہ، اخلاقی، فلسفیانہ، مذہبی، عارفانہ المیہ، خمریہ، سیاسی اور سماجی وغیرہ اتنے بہت سے متنوع اور مختلف عنوانات کے تحت انتخاب کرنا۔ یہی اپنی جگہ پر کون سا معمولی یا آسان کام تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہر دور کی خصوصیتوں پر تبصرہ، ہر قابلِ ذکر شاعر کے بارے میں ضروری معلومات کلام پر رائے پھر اس میں سے اپنے موضوع اور کام کی چیز (رباعیات) کا ڈھونڈھ نکالنا۔ بلاشبہ ایک نہایت وقیع، بڑا اہم، اور بہت سی حیثیتوں سے قابل تعریف اور قابل قدر کارنامہ ہے۔

میر انیس، مرزا دبیر، مولانا حالی، رواں، امجد، یگانہ، جوش اور فراق ان شعرائے کرام کی رباعیوں سے اردو کا خزانہ مالا مال ہے۔ ان کے علاوہ امیر مینائی، منیر شکوہ آبادی اور فانی کی رباعیوں کی بدولت اس خزانے میں جو گراں بہا اضافے ہوئے ہیں ان کی طرف "اردو رباعیات" کے مؤلف سے پہلے بہت کم لوگوں کی نظر گئی ہوگی۔ یہ بھی ان کے ذوق نظر کا ایک نمایاں ثبوت اور حسن انتخاب کی بیّن دلیل ہے۔

معائب میں تنگ نظری اور شدت سے کہیں کام نہیں لیا گیا۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ دورِ حاضر کے بعض شاعروں کے محاسن کے بیان میں حقیقت سے زیادہ عقیدت کا پہلو غالب آگیا ہے۔ شعرا کے سالہائے ولادت و وفات کے سلسلے میں ہجری اور عیسوی کی کھچڑی کچھ عجیب سی لگتی ہے حالاں کہ اک ذراسی توجہ اور کوشش سے یکسانیت پیدا کی جاسکتی تھی۔ سن ہجری کی اہمیت سے انکار نہیں مگر اس زمانے کی کسی مفید اور معقول کتاب میں سنِ عیسوی کی مطابقت نہ پاکر ایک خلش ضرور ہوتی ہے۔ اسی طرح بہت سی خوبیوں کے باوجود کتابت و طباعت جا بجا معیاری اور صاف نہیں ہے، اسی بنا پر بعض نام یا اچھے مصرعے اور شعر لطف و صحت کے ساتھ آسانی سے پڑھے نہیں جاسکتے۔

اب یہ ناانصافی ہوگی اگر ایسے لائق اور باہمت افراد اور اداروں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ آخر میں ڈاکٹر وحید مرزا کی اس "دعا" پر کہ اس بیش قیمت مقالے کو "شہرت اور قبول عام حاصل ہو" ہم سب کو آمین کہنا چاہیے۔ رشید نعمانی



## خالی مکان

(سن اشاعت ۶۳ء)

شاعر: محمد علوی
صفحات: ۱۲۰ سائز ۱۸×۲۲/۸ مجلد
قیمت: چار روپے
ناشر: مکتبہ سوغات، بنگلور ۵

"خالی مکان" کے نام سے گمان تو کسی "جاسوسی ناول" یا "افسانوں کے مجموعے" کا گزرتا ہے کہیں ایسا ہے نہیں۔ یہ گجرات کے ایک نوجوان شاعر محمد علوی کا مجموعہ کلام ہے جس میں سے کچھ زیادہ نظمیں اور پچیس کے قریب غزلیں شامل ہیں۔ ان کی نظمیں عموماً مختصر ہیں اور بعض بہت مختصر۔ گلشنِ اُردو میں "نظم مختصر" کا پستہ قد پودا ابھی اپنی جڑیں جما نہیں سکا ہے اور تجربے کی منزل میں ہے۔ محمد علوی اپنی جودتِ طبع کے سہارے اس تجربے میں شامل ہوئے ہیں۔ اُن کی نظم "تخلیق" ملاحظہ ہو۔

ایک زنگ آلودہ — توپ کے دہانے میں
ننھی منی چڑیا نے — گھونسلہ بنایا ہے

اسی طرح اُن کی چند نہایت ہی ننھی منی نظمیں اور بھی ہیں۔ یوں تو ان کی بیشتر نظمیں ایک سیدھے سادے بیان کی سی کیفیت لیے ہوئے ہیں اُن کے مشاہدے میں اکثر نظر نے کام کیا ہے جس کی ایک اچھی مثال اُن کی نظم "پگلی لڑکی" ہے۔ علوی کے یہاں ابھی فکر کی کمی تو ضرور ہے مگر ان کا کلام نئے پن کی تازگی رکھتا ہے۔ انھوں نے چند معریٰ نظمیں بھی پیش کی ہیں لیکن کلام کی سطح پر کوئی فرق اس بنا پر نہیں آیا ہے۔

علوی کی غزلیں بھی اُن کی نظموں کی طرح گہرائی اور گیرائی سے عموماً بے تعلق ہیں۔ تاہم ایسے اشعار دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔

باتیں کہی کہی سی ہیں — پھر بھی نئی نئی سی ہیں
آگ اپنے ہی لگا سکتے ہیں — غیر تو صرف ہوا دیتے ہیں
چلتے چلتے پاؤں پتھر ہو گئے — ہم تو رستے کا مقدر ہو گئے
جو بھی ملتا ہے باندازِ دگر ملتا ہے — دور تک تیرے تغافل کی خبر جاتی ہے
رکھتا ہے احتیاط بہت دل بھرا ہوا — چُپ چُپ رہا ہے جب کبھی دو سرا ہوا
جب خوشی آئے تو محسوس نہ ہو — کوئی اتنا بھی تو مایوس نہ ہو

"خالی مکان"، مکتبہ سوغات کی پیش کش ہے جسے پورے حُسنِ سلیقہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اِس مجموعے کو گُلِ نورس سمجھ کر خوش آمدید کہنا چاہیے۔ اس دور میں ایسے نوجوان شاعر ایک فالِ نیک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عبد اللہ ولی بخش قادری



## نغمۂ روح

(سن طباعت مارچ ۱۹۶۴ء)

شاعر: صادق دہلوی
صفحات: ۲۰۸ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ مجلد
قیمت: تین روپے
ملنے کا پتہ: کتب خانہ رشیدیہ، اردو بازار، دہلی ۶

'نغمۂ روح' ایک صوفی شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جس میں غزلیات اور آخری جز میں نظمیں شامل ہیں۔ کلام میں روانی اور پاکیزہ عناصر محبت کی کمی نہیں ہے۔

'نغمۂ روح' کے مقدمے میں جناب ساغر نظامی نے فرمایا ہے "فن اور اس کے ہر تعلقے

میں شعرا ردور ہو چکے ہیں۔ دور بھی اور بے نیاز بھی۔ لیکن میں پورے وثوق کے ساتھ سب سے پہلی بات یہ کہہ سکتا ہوں کہ صادق صاحب کا کلام فنّی اغلاط سے پاک اور مبرّا ہے" (مقدمہ ص۱۱) ہمارے نزدیک یہ دونوں باتیں ذمّہ داری سے نہیں کہی گیئں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نہ راس آیا محبت میں سکون دل تو کیا ہوگا!
سفینہ آکے ڈوبا برلب ساحل تو کیا ہوگا
صفہ ۸۱

"برلب ساحل" میں "بر" حشو ہے۔

صفہ ۱۳۵
چشم گریاں سے رواں ہے غم فرقت میں لہو
آپ یہ موسم برسات بدل سکتے ہیں

موسم برسات = یہ مرکب اضافی درست نہیں۔ موسم، عربی لفظ ہے اور برسات ہندی ہے

کچھ دیر اور ٹھیر تصوّر میں حُسن ناز
تصویر بن سکے نہ محبت میں ہم ابھی
صفہ ۱۶۱

"ٹھیر" کا فصیح استعمال بروزن "نظر" ہے۔ مثلاً

دوڑ کر بھی چلے ٹھہر بھی گئے ـــــــ سحر

صفہ ۱۸۰
ظالموں نے آڑ لے کر قضیہ سوئیز کی
ڈال دی ہے اب ہلاکت میں عرب کی زندگی

قضیّہ (قضِیْ یَہ) بروزن عطیّہ (عَطِیْ یَہ) لکھنا چاہیے۔ سوئیز کا لفظ بھی مشکوک ہے۔

لیکن ان باتوں کا عام قاری سے تعلق نہیں ہے۔ شاعر کے یہاں روحانی اور ذہنی نشاط کے لیے بہت کچھ ملتا ہے۔ "خیال وبیان" دونوں اعتبار سے شاعر کا کلام اپنے اندر اپیل رکھتا ہے۔ درج ذیل اشعار سے "نغمۂ روح" کی خوبی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

میرے دم سے رونقِ گلشن
پھر بھی میرا نام نہ آئے

شب فراق کی تاریکیوں کو کیا کہیے
سمجھ رہا ہوں ستاروں میں روشنی کم ہے

عشق میں ایسا گم ہو جاؤں
دُنیا ڈھونڈے ہاتھ نہ آؤں

کیا گزری ہے عشق میں دل پر
اہلِ خرد کو کیا سمجھاؤں

میں نے پی ہے اُن کی نظر سے
صادق کیسے ہوش میں آؤں

کتاب سلیقے سے چھپی ہے۔ شاعر کی تصویر بھی شامل ہے۔ اور سرورق عمدہ ہے۔

سیفی پریمی



## حریم نور

(سن طباعت فروری ۶۱ء)

شاعر: صادق دہلوی
صفحات: ۱۲۸ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد
قیمت: دو روپے پچاس نئے پیسے
ملنے کا پتہ: کتب خانہ رشیدیہ، اردو بازار، دہلی ۶

صادق دہلوی حضرت مخمور دہلوی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں مخمور صاحب کی شاعری کا سوز اور شخصیت کی کشش کی ان کی شاعری اور شخصیت پر بہت گہری چھاپ ہے ان کے کلام کے مطالعہ اور ان سے مل کر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ استاد سے جتنا صادق صاحب نے حاصل کیا ہے اتنا اس دور میں بہت کم شاگرد حاصل کر پاتے ہیں۔

حریم نور۔ صادق صاحب کی نعت اور منقبت کا ایک حسین مجموعہ ہے آج کل بہت سے شعراء رسماً یا ضرورتاً نعت کہہ لیتے ہیں لیکن نعت کہنے کے لیے جس وجدان اور رحمۃ اللعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک سے جس گہری عقیدت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اکثر شعراء کے یہاں نہیں ملتی۔ غزل تو تھوڑے سے مطالعہ اور محنت سے کہی جا سکتی ہے لیکن اعلیٰ ترین نعت صرف گہرے لگاؤ کے بعد ہی کہی جا سکتی ہے۔ صادق صاحب دو مرتبہ دیار حبیب میں باریاب ہو چکے ہیں وہ ایک سچے مسلمان اور صوفی ہیں اس لیے ان کی نعت پڑھنے کے بعد ایک خاص قسم کا کیف محسوس ہوتا ہے اس مجموعہ میں جس قدر نعتیں ہیں وہ بڑے دل نشین انداز میں کہی گئی ہیں۔

لاکھوں سلام اس شہ والا صفات پر — دستور حق تمام ہوا جس کی ذات پر

منزل عرفاں نہیں دشوار کچھ میرے لئے — ہر قدم پر رہبری کرتا ہے عرفان نبی

زہے نصیب کہ دنیا و دیں سنوار دیئے — بتا کے رزق حلال و حرام ساقی نے

زمانے نے شاید یہ سمجھا نہیں ہے — بہ ناہ خدا ہے پناہ محمدؐ

جسے آرزو ہو جسے جستجو ہو — اسے مل ہی جاتی ہے راہ محمدؐ

صادق صاحب نے اپنی نعتوں میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ وہ حقیقت

سے دور نہ ہونے پائیں۔ ابتدا میں مولانا اخلاق حسین قاسمی کا تعارف۔ مولانا محمد حفظ الرحمان مرحوم اور مفتی عتیق الرحمان صاحب۔ خلیق برنی۔ شاہ عبدالعزیز نیز مولانا فارقلیط کی تعاریظ وغیرہ ہیں جن کو پڑھنے کے بعد شاعر کی شخصیت سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ حریم نور ایک خوب صورت تخلیق ہے جس کا بلا لحاظ مذہب و ملت مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

عشرت کرتپوری



## گھڑی کی کہانی

(سن اشاعت ۶۳ء)

از:۔ انصار اعظمی
صفحات:۔ ۳۲ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت:۔ ۵۰ نئے پیسے
ناشر:۔ احباب پبلشرز مقبرہ عالیہ، گولہ گنج لکھنؤ

انصار اعظمی صاحب نے اس کتاب کو بہت اچھے انداز سے شروع کیا ہے۔ اس کتاب میں "انسانوں کی پہلی گھڑی" سے لے کر اب تک کی عام گھڑیوں کا ذکر سیدھے سادے اور ترتیب کے ساتھ نہایت سلیقے سے کیا گیا ہے۔ شکلیں بھی واضح اور صاف ہیں۔

کتاب کے آخر میں نئے زمانے کی گھڑیوں کا ذکر جتنے پرلطف انداز میں کیا ہے وہ قابل ستایش ہے۔ وقت کی اہمیت اور ایک سکنڈ کے دس لاکھویں حصہ کی بات چھیڑ کر مصنف نے سائنس اور جدید سائنس کی سرحدوں کو بھی چھو لیا ہے۔

یہ کتاب بچوں کے لیے مفید، پر از معلومات اور بہت دلچسپ ہے موجودہ دور کے بچوں کے لیے صحیح معنوں میں ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے اور سائنس کے مختلف اور مشکل پہلوؤں کو اتنے ہی اچھے اور خوب صورت الفاظ میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے ملک کے بچے شروع ہی سے تلاش، جستجو اور سائنس کی طرف متوجہ ہوں۔

محمد امین
(جامعہ ملیہ اسلامیہ)

## نوائے سیفیہ

(سائز ۲۰×۳۰/۴ صفحات ۱۶)

نگراں:۔ عبدالقوی دسنوی
ایڈیٹر:۔ آفاق حسین صدیقی متعلم بی۔ اے سال دوم
نائب ایڈیٹر:۔ آفتاب خاں متعلم بی۔ ایس سی سال دوم
پتہ:۔ شعبۂ اردو، سیفیہ ڈگری کالج، بھوپال

یہ اخبار سیفیہ ڈگری کالج بھوپال کے شعبہ اردو کا ترجمان ہے۔ اس کے اب تک

دو شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک اکتوبر ۶۳ء اور دوسرا جنوری ۶۴ء میں۔ ان دونوں شماروں میں پیغامات و تاثرات، ایڈیٹوریل، ادبی و سائنسی مضامین، غزل اور نظم، مختصر افسانے، کالج کی سرگرمیوں کی روداد، ادبی خبریں، مختلف اقتباس غرض اور بھی بہت کچھ شامل ہے اور ان میں سے بیشتر خالق کالج کے طلبا ہیں جو واقعی ایک قابلِ تحسین کوشش ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ مضامین معیاری ہیں، ان میں تنوع ہے اور وہ عام اخباری انداز سے مختلف ہیں "آج کا بچہ کل کا نیتا" تو خیر دیر سے ہوگا لیکن آج کے نوجوان اور خاص طور سے کالج کے نوجوان بلاشبہ کل کے "نیتا" ادیب، شاعر غرض سب ہی کچھ ہیں۔ اس لیے یہ اور بھی ضروری ہے کہ انھیں کام کرنے کا سلیقہ آتا ہو اور انھیں یہ بات تجربے سے بھی معلوم ہو کہ کام کس طرح کیا جانا چاہیے کہ وہ زیادہ بہتر ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے اسکول اور کالجوں کے اخبار و رسالے یقیناً مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ 'نوائے سیفیہ' کے اربابِ حل و عقد قابلِ مبارک باد ہیں کہ ان کی یہ کوشش نہ صرف بہت کامیاب رہی بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایک اچھی مثال ثابت ہوگی۔

"نوائے سیفیہ" میں کہیں قیمت وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں لکھا ہے کہ مدتِ اشاعت کیا ہے۔ اگلے شمارے میں اگر اس کی بھی وضاحت کر دی جائے تو مناسب ہے۔



**ماہنامہ ٹافی لکھنؤ**
(سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۱۶)

مدیران: اوصاف احمد۔ معظم جعفری
قیمت فی پرچہ: ۱۰ نئے پیسے سالانہ ایک روپیہ
پتہ: ۲۱ گوتم بدھ مارگ، لکھنؤ

"ٹافی" اب سے پہلے ۲۰×۳۰/۴ سائز کے ۴ صفحات پر اخباری شکل میں شائع ہوا کرتا تھا لیکن اب پچھلے دو مہینوں سے اسے بدل کر کتابی سائز کر دیا گیا ہے۔ دوسری تبدیلی اس میں یہ ہوئی ہے کہ اب اس کی تمام کہانیاں اور نظمیں وغیرہ دوسرے اخبار اور رسالوں سے ہی نقل کر کے شائع کی جاتی ہیں۔ گویا اب یہ بچوں کا ڈائجسٹ ہو گیا ہے۔ اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا ہے کہ اب اس میں چنیدہ چنیدہ کہانیاں ہی شائع ہوتی ہیں لیکن یہ بھی بہت ضروری ہے کہ اس کے کچھ صفحات بچوں کی نگارشات کے لیے بھی وقف ہوں۔ اس میں کہانیوں کے علاوہ بچوں کے کام آنے والے معلوماتی مضامین بھی ہوں۔ اس کے بعد ہی صحیح معنوں میں اسے بچوں کا رسالہ کہا جا سکتا ہے دوسرے اسے ۱۲ صفحات کا کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ جن رسائل و اخبارات سے مضامین نقل کیے جاتے

# ادبی خبریں

مرتبہ:- ظلّ عبّاس عبّاسی

## ادبی مقابلہ

روزنامہ انقلاب، بمبئی کے علمی و ادبی صفحے ہفت رنگ کی طرف سے جشن مہاراشٹر کے موقعے پر ادبی مقابلہ ہوگا۔ مقابلے میں عمدہ مقالہ نگار کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی کی طرف سے "مہاراشٹر پرائز" میں ۲۵ روپے کی کتابیں پیش کی جائیں گی۔ ادبی مقالے کے لیے ساحر لدھیانوی اور راجندر سنگھ بیدی میں سے کسی ایک کی شخصیت اور فن پر مقالے لکھے جاسکتے ہیں۔ یہ مقالے ۲۵ راپریل ۶۴ء تک شام کے چھ بجے تک دفتر انقلاب۔ ۲۴۵ مولانا آزاد روڈ، بمبئی میں وصول کیے جائیں گے۔

## اُردو کتابوں پر انعام

ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی نے ۱۹۶۳ء میں شائع ہونے والی مختلف زبانوں کی گیارہ کتابوں پر پانچ پانچ ہزار روپوں کا انعام دیا۔ اُردو کی کتابوں میں جناب خواجہ غلام السیدین صاحب کی کتاب "آندھی میں چراغ" انعام کی مستحق قرار پائی ہے۔

حکومت اترپردیش نے اطہر پرویز صاحب کی کتاب "اُردو ادب کا مطالعہ" پر ۵۰۰ روپے کے انعام کا اعلان کیا ہے۔

## شامِ غزل

دلی یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو کے زیر اہتمام ۱۸ رمارچ کی شام کو چھ بجے ایک رنگارنگ پروگرام "شامِ غزل" کے عنوان سے منعقد کیا گیا جس میں آل انڈیا ریڈیو کے بہترین فن کاروں نے حصّہ لیا اور غالب، ظفر، مومن اور جدید شعرا کی غزلیں پیش کیں۔ فلم کے مشہور مغنّی بھوپندر سنگھ نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ "شامِ غزل" کی ابتدا سرجیت سنگھ نے غالب کے کلام سے کی۔ اس کے بعد ستیش کمار اور ملک کے مشہور مغنّی اُستاد ہلال خاں اور محترمہ اوشا سیٹھ نے شعرا کی غزلیں پیش کیں جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔ "شامِ غزل" میں ڈاکٹر نگیندر۔ صدر شعبۂ ہندی اور ڈاکٹر سروپ سنگھ پرنسپل کروڑی مل کالج۔ اور یونی ورسٹی کے اساتذہ و طلبا و دیگر اسٹاف نے شرکت کی اور اس پروگرام کو بے حد پسند کیا۔ آخر میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ اُردو نے تمام حاضرین اور فنکاروں کا شکریہ ادا کیا اور سرٹیفکٹ کورس کی نگراں ڈاکٹر شمیم نکہت کو اس جلسے کی کامیابی پر مبارکباد دی۔

(سید مرتضٰی حسین بلگرامی)

## اُردو مجلس کا ماہانہ اجلاس

حیدرآباد۔ اُردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس اتوار (۲۳ر فروری ۱۹۶۴ء) اُردو ہال واقع حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ صدر اُردو مجلس رائے جانکی پرشاد صاحب نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ ممتاز مزاح نگار جناب رشید قریشی (مصنف "من کی دنیا") اور جناب بھارت چند کھنّہ (مصنف ٹھنڈی بجلیاں) نے دلچسپ مزاحیہ مضامین سُنائے۔

محفل شعروسخن میں میر یٰسین علی خاں۔ برقؔ موسوی۔ شور بینائی۔ وقار خلیل۔ رؤف خلش۔ صلاح الدین نیرؔ۔ رگھوبنسی نزلؔ۔ ناز حیدر۔ برقؔ یوسفی۔ رحمٰن جامی۔ اور فیض الحسن خیالؔ نے غزلیں۔ نظمیں اور سانیٹ سُنائے۔

جناب محمد منظور احمد معتمد اُردو مجلس کے شکریے پر یہ ادبی اجلاس برخاست ہوا۔ اُردو مجلس کی طرف سے مارچ کے تیسرے ہفتے میں شاندار پیمانے پر "یوم غالب" منایا جا رہا ہے جس میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ صاحبان غالب کے فکروفن کو خراج عقیدت ادا کریں گے اور ممتاز شعرا صاحبان غالب کو منظوم نذر عقیدت ادا کریں گے۔

## ٹیلیفون کے ذریعے تعلیم

کولمبیا میں ایک چھوٹا کالج ہے جس کے ٹیچر طلبا کو لمبے فاصلے کے ٹیلی فونوں کے ذریعے تعلیم دیتے ہیں۔ امریکہ کی دوسری ریاستوں کے دس کالج بھی ان ٹیلی لکچروں میں شرکت کر رہے ہیں۔

## سب سے چھوٹی کتاب

دنیا کی سب سے چھوٹی کتاب ہالینڈ کے ایک مطبع نے شائع کی ہے اس کتاب کی لمبائی چوڑائی چار اعشاریہ ایک ملی میٹر ہے کتاب کا مضمون خدا سے دُعا ہے جو سات زبانوں یعنی انگریزی، فرانسیسی، جرمن، ڈچ اطالوی، لیپائی اور سوئیڈش میں ہے۔ ہالینڈ کے اس مطبع نے یہ کتاب اپنی ۱۰۰ویں سال گرہ پر پیش کی ہے۔

## کتاب نما



| سالانہ چندہ ایک روپیہ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ | فی پرچہ ۱۰ نئے پیسے |
|---|---|---|

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

| منیجنگ ایڈیٹر<br>غلام ربانی تاباں | ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی | ایڈیٹر<br>ریحان احمد عباسی |
|---|---|---|
| جلد نمبر ۵ | مئی سنہ ۱۹۶۴ء | شمارہ نمبر ۵ |

# اشاریہ

مکتبہ جامعہ اپنی معیاری اوصاف ستھری کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ایک نمایاں مقام تو رکھتا ہی ہے لیکن اس میں بھی جو خصوصیت اور برتری اُسے بچّوں کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مکتبہ جامعہ نے نہ صرف یہ سلسلہ شروع کرنے میں پہل کی بلکہ اس نے اپنی ان کتابوں کے ذریعے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ ان کے پڑھنے سے بچّوں کو بہترین سماجی اور سیاسی مواد بہم پہنچا کر ان میں عمدہ تعمیری ذہنیت پیدا کرنے کے وسائل فراہم کیے جائیں۔ بچّوں کی صالح اور تعمیری ذہنیت بنانے میں رسالہ "پیامِ تعلیم" کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہ رسالہ مکتبہ جامعہ کے اہتمام میں سنہ ۱۹۲۶ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں چند ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے اس کی اشاعت بند کردی گئی تھی۔ ہمیں اب یہ اعلان کرتے ہوتے انتہائی خوشی ہو رہی ہے کہ مکتبہ جامعہ نے بچّوں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اسے دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پیامِ تعلیم کا پہلا پرچہ جولائی سنہ ۱۹۶۴ء میں منظرِ عام پر آسکا ہے۔ بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کے ادارتی فرائض بچّوں کے پرانے ساتھی پیامِ تعلیم کے سابق ایڈیٹر جناب محمد حسین حسّان صاحب انجام دے رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے مکتبہ کے اس اقدام کو ہر جگہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

مجنوں گورکھپوری

# کلامِ بیدار

اُردو شاعری کی تاریخ میں صرف ایک دور ہم کو ایسا نظر آتا ہے جس کو قصائدِ سودا کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی عمومی حیثیت سے صرف غزل کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اور جس میں غزل جلد جلد تمام ابتدائی مدارج طے کرکے تخلیقی کمال کو پہنچ گئی۔ اگر اس دور کی دوبارہ تقسیم نہ کی جائے تو اس کی ابتدا حاتم اور مرزا مظہر سے ہوتی ہے۔ میر۔ درد۔ سودا اس کے مرکزی ارکین ہیں اور پھر اُن کے آگے پیچھے غزل گویوں کا ایک طویل گروہ نظر آتا ہے جس میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ خاص وقعت رکھتا ہے۔ متغزلین کا جو جمگھٹ اس دور میں ملے گا اس کی نظیر اس کے بعد کسی دور میں نہیں ملتی۔ اس دور کی مثال انگریزی ادبیات میں دورِ الزبتھ کی سی ہے جو شعر و موسیقی کا دور تھا۔ اس کے بعد اب تک جتنے دور گزرے ہیں ان میں سے جس کسی کو دیکھیے آپ کو زیادہ سے زیادہ دو تین غزل گو ایسے ملیں گے جو واقعی غزل گو کہے جاسکتے ہیں اور جن سے منسوب ہو کر اس دور نے شہرت پائی۔ مصحفی تو اپنے زمانے میں تنہا نظر آتے ہیں۔ خیر جرأت کو بھی ملا لیجیے تو دو ہوتے۔ انشا کو غزل گو کہنا ان کے ساتھ دل لگی کرنا ہے غالب اور مومن کے زمانے میں ذوق کو اور آتش کے زمانے میں ناسخ کو صرف رسماً اور تخلیقاً غزل گو مانا جاسکتا ہے۔ لیکن جس دور میں میر، درد اور سودا کا ڈنکا بجا وہ صرف غزل گوئی کا دور تھا۔ علاوہ اِن تین کے ایک خاص تعداد ایسے شاعروں کی تھی جنھوں نے غزل کو اپنا معیارِ کمال سمجھا اور یہ سمجھ کر اپنی ساری عمر اس کمال کو حاصل کرنے میں صرف کردی۔ میر، درد، اور سودا کے مقابلہ میں ان کو جتنا چاہیے گھٹا لیجیے لیکن وہ خود اپنی جگہ اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور اگر ہم اُن کو نظرانداز کردیں تو ہمارا اردو غزل کا مطالعہ یقیناً نامکمل رہ جائے گا۔ ان شاعروں میں خصوصیت کے ساتھ قائم، اثر،

یقین، تاباں، بیاں، میرضیا اور بیدار ہیں۔ اردو غزل کی تحسین و تہذیب میں ان لوگوں نے جو حصہ لیا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا محض تنگ نظری اور کور ذوقی ہے۔ اس مختصر مقالے میں ہم اپنا دائرۂ موضوع بیدار تک محدود رکھیں گے۔

بیدار کا کلام اوّل اوّل تو تذکروں ہی میں میری نظر سے گذرتا رہا اور میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ بیدار کے یہاں بھی وہ تمام خصوصیات یک جا ہیں جو اس دورِ تغزل کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اس دور کی ایک عمومی شان یہ ہے کہ غزل کا دائرہ زیادہ تر عشق اور وہ بھی اس کے داخلی پہلو تک محدود ہے اور جذبات و واردات سے باہر شاعر بہت کم کسی چیز سے سروکار رکھتا ہے اور پھر ہر شاعر حسن و جذبات و واردات کو ایک خاص نشاط و ولولہ، ایک خاص مستی اور سرشاری، ایک خاص تخیلی پندار و اعتماد کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ بیدار کی شاعری میں یہی خصوصیات حاوی اور نمایاں ہیں۔ اس لیے جہاں میں اِس دور کے اور شعرا کے کلام ڈھونڈا کرتا تھا وہاں بیدار کے کلام کی بھی جستجو رہتی تھی۔ خوش قسمتی سے بہت جلد مجھ کو مولانا حسرت موہانی کا "اردوئے معلیٰ" بابت مئی و جون ۱۹۲۵ء مل گیا جس میں انھوں نے بیدار و تاباں اور ماہر کے کلام کے انتخاب شائع کیے ہیں۔ اس انتخاب کے مطالعے نے میرے اس خیال کو اور بھی قوی کردیا کہ بیدار اپنے دور کی بہترین یادگاروں میں سے ہیں لیکن جب میں نے "ایوان" جاری کیا تو مجھے پتہ لگا کہ گورکھپور میں ہمارے مکرم دوست جناب شاہد علی صاحب فائق سبزپوش کے پاس دیوانِ بیدار کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے یہ نسخہ کسی پرانے قلمی نسخے کی نقل ہے اور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء تک برابر میرے مطالعے میں رہا ہے۔ اس میں سے کئی غزلیں "ایوان" میں شائع بھی ہو چکیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی غزلو اور متفرق اشعار کی اپنے مذاق کے مطابق میں نے ایک بیاض تیار کرلی تھی۔ افسوس ہے کہ بازار کا رنگ اور دیوان کی اشاعت کی اقتصادی حالت اس کی مقتضی نہیں ورنہ اس دیوان کا شائع ہو کر عوام میں آجانا کوئی دشوار کام نہ تھا۔

"ہندوستانی" بابت جنوری ۱۹۳۲ء میں ہمارے دوست جناب جلیل احمد قدوائی نے بیدار پر ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں بیدار اور کلامِ بیدار سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ جلیل صاحب کو بھی کہیں سے بیدار کے اردو اور فارسی دونوں دیوان

کے قلمی نسخے مل گئے ہیں اور انھوں نے اسی قلمی دیوان کو پیش نظر رکھ کر اپنا مضمون لکھا ہے بیدار کی زندگی کے جتنے حالات میسر آسکے ہیں انھوں نے اس کے اکٹھا کر دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ ہر چند کہ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی تاہم ناظرین کے لیے بیدار کی شخصیت کا بھی مختصر تعارف اس جگہ بے محل نہ ہوگا۔

بیدار کا نام میر محمد علی تھا، عام طور سے میاں محمدی پکارے جاتے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ شعر و سخن کا مذاق نہایت ستھرا اور رچا ہوا تھا۔ اور غزل گوئی کا ملکہ خدا داد تھا۔ میر و سودا کے ہم عصر تھے مگر غالباً اُن کا بڑھاپا ان کی جوانی تھی۔ قائم نے اپنے "مخزن نکات" میں ان کو "خوبان روزگار" میں بھی شمار کیا ہے۔ اور انھیں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں سے تغیر لباس کر کے درویشانہ بج دھج اختیار کر لی تھی اور فقر و استغنا میں بسر کرنے لگے تھے اور یہ مولانا فخرالدین دہلوی کے فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا۔ میر حسن نے ان کو مرتضیٰ قلی بیگ فراق "شاعر فارسی گو" کا شاگرد بتایا ہے۔ اور تذکرہ نویس مثلاً میر، مصحفی، شیفتہ وغیرہ بھی میر حسن کی تائید کرتے ہیں۔ لطف نے ان کو خواجہ میر درد کا شاگرد بتایا ہے مصنف "گل رعنا" نے اس سے یہ صحیح نتیجہ نکالا کہ بیدار فارسی میں مرتضیٰ قلی بیگ سے اصلاح لیتے تھے اور اردو میں درد سے۔ اس لیے کہ میر، میر حسن اور مصحفی نے اُن کو مرزا قلی بیگ کا شاگرد لکھتے وقت اس بات کا بھی خصوصیت کے ساتھ اظہار کیا ہے کہ مرتضیٰ قلی بیگ فارسی کے شاعر تھے۔ پرانے تذکروں میں صرف لطف کا تذکرہ اب تک مجھے ایسا ملا ہے جس میں بیدار کو درد کا شاگرد لکھا ہے۔ جدید تذکروں میں "آب حیات" میں اُن کا کوئی ذکر نہیں۔ رام بابو سکسینہ نے اپنی "تاریخ ادب اردو" میں اُن کا صرف ایک جگہ نام لے لیا ہے اور وہ اس طرح کہ بیدار نے درد کی تاریخ وفات لکھی "شعرالہند" کے مصنف نے بیدار کو درد ہی کے شاگردوں کے ماتحت شمار کیا ہے لیکن مولانا حسرت نے جو انتخاب شائع کیا ہے اس میں بیدار اور تاباں دونوں کو شاگردانِ حاتم میں شمار کیا ہے اس کی اب تک کوئی سند مجھ کو نہیں ملی۔ تاباں کا سلسلہ تو خیر سودا کے توسط سے حاتم تک پہنچتا بھی ہے (اگر یہ مان لیا جائے کہ تاباں نے سودا سے اصلاح لی) لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیدار کو کس بنا پر حاتم کا شاگرد گنا جائے۔ ممکن ہے مولانا حسرت کے پاس ایسا سمجھنے کی

سند اور معقول دلیل بھی ہو۔

مصحفیؔ نے بیدارؔ کو دیکھا تھا اور انھوں نے اپنے "تذکرہ ہندی" میں ان کا حلیہ یہ دیا ہے "جوانیست محمد شاہی قامت حال خود را بہ لباس درویشی آراستہ دارد یعنی پھینٹہ گیروی بر سر تاج می بندد و دیگر لباس او بطور دنیا داران است" اواخر عمر میں بیدارؔ اکبر آباد چلے آئے تھے اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

مجھے جلیل صاحب کی طرح بیدارؔ کے ساتھ اتنا غلو نہیں کہ ان کے کلام کے مقابلے میں یقینؔ کے اشعار "روکھے پھیکے اور کمزور" معلوم ہونے لگیں۔ یہ اپنا اپنا ذوق اور اپنا اپنا احساس ہے۔ میں اپنے مطالعے سے جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یقینؔ کا کلام اور جو کچھ بھی ہو روکھا پھیکا کبھی نہیں ہوتا۔ یقینؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت گرمی اور شوریدگی ہے جو کسی وقت بھی ان سے علیحدہ ہوتی نظر نہیں آتی چوں کہ مقصد یقینؔ سے بحث کرنا نہیں ہے اس لیے صرف اِدھر اُدھر سے چند اشعار مثالاً پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

نہ ہوا ہائے یقینؔ ورنہ دوانہ ہوتا ۔۔۔ آج اس طرح کا دیکھا ہے پری زاد کہ بس

---

خدا دیتا مجھے گر میر سامانی خدائی کی ۔۔۔ تو میں ان بلبلوں کو گلشنوں کی باغبانی دیتا

---

سر پر سلطنت سے آستان یار بہتر تھا ۔۔۔ ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

---

پھر کوئی سلسلہ جنباں ہوا زنداں کے بیچ ۔۔۔ آج زنجیر سے آتی ہے جھنکار کان کے بیچ

---

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے سے گریباں کو ۔۔۔ یقیںؔ کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

---

جفائیں باغبانوں کی یقیںؔ کیا کیا اٹھاتی ہے ۔۔۔ وفا یوں چاہیے شاباش بلبل مرحبا بلبل

---

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ دل کو ۔۔۔ کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

یہ پوچھو تو کہ کیا یہ سرزمیں مجنوں کا مدفن ہے چلی آتی ہیں یاس انگیز یادیں اس بیاباں سے

---

گریباں چاک کرنے سے ہمارے تجھ کو کیا ناصح ہمارے ہاتھ جائیں اور ہمارا پیرہن جانے

---

دل چھوڑ گیا، ہم کو دلبر سے توقع کیا اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہیے

---

یقینؔ کے سارے دیوان میں شاید ایک شعر بھی ایسا نہ ملے جو اس تپش اور شوریدگی سے خالی ہو یہی وجہ ہے کہ جیسا کہ میں ایک مرتبہ اور کہیں اظہار کر چکا ہوں ان کے وہاں ایک قسم کی تھکا دینے والی یکسانی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ شاید اسی احساس کو جلیل صاحب نے پھیکے پن سے تعبیر کیا ہے لیکن جوانی کی شورش ایسی ہی ہوتی ہے۔ یقینؔ اس دورِ شباب کے شاعر ہیں جو صرف خروش عشق کا مرادف ہوتا ہے۔ یقینؔ اور بیدارؔ میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ یقینؔ کے کسی شعر پر کسی اور شاعر کا دھوکا نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے بیدارؔ کے کلام میں اسی دور کے اور شعرا کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ مثلاً حاتمؔ، ہدایتؔ، فراقؔ وغیرہ کی۔ بہ الفاظِ دیگر یقینؔ کا رنگ ایک شدید انفرادیت اپنے اندر رکھتا ہے اور بیدارؔ کا رنگ کافی حد تک تقلیدی ہے اور وہ اپنے معاصرین میں مِل جاتے ہیں۔

لیکن مجھے نیازؔ صاحب کی بات ماننے میں بھی تامّل ہے جو انھوں نے "نگار" بابت جنوری ۱۹۳۶ء میں اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ کرتے ہوئے ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "خواجہ صاحب کے ایک صاحبِ دیوان شاگرد میر محمدی بیدارؔ بھی تھے لیکن کوئی خاص بات ان کے کلام میں نہیں۔" اور پھر انھوں نے بیدارؔ کا ایک شعر بھی مثال میں پیش نہیں کیا ہے حالاں کہ ہدایتؔ اور فراقؔ کے اشعار ایسے ہیں جن سے بیدارؔ بہرحال فائق ہیں۔ بیدارؔ میں وہ تمام امتیازی خصوصیات مجتمع نظر آئیں گی جن کو صرف اس دور سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے دور کی پوری نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر وہ انھیں خصوصیات کے ساتھ کسی دوسرے دور میں بٹھا دیے جائیں تو وہ اس دور کے بدرنگ شاعر سمجھے جائیں گے۔ بیدارؔ کی یہ اہمیت ایسی نہیں کہ

ان کو ان کے دور سے بحث کرتے وقت نظرانداز کیا جاسکے۔

قائم، یقین، اثر، تاباں وغیرہ سے بیدار کا مقابلہ کیا جائے تو ان کے کلام میں وہ ٹھہراؤ محسوس ہوگا جو صرف عمر اور تجربے سے نصیب ہوتا ہے۔ ان کی زبان شستہ اور نکھری ہوئی ہے اور اسلوب نرم اور ملائم ہے۔ ان کے جذبات و واردات میں پختگی اور گداختگی زیادہ ہے اور خواجہ میر درد اور مولانا فخرالدین کے فیضِ صحبت کا اتنا اثر تو ہونا ہی تھا۔ اگرچہ اسی دور میں خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی اور خواجہ ناصر عندلیب کے چھوٹے بیٹے خواجہ میر اثر اس قسم کے فیض سے بالکل بے بہرہ رہ گئے اور ان کے اشعار میں یہ ٹھہراؤ اور توازن نہ پیدا ہوسکا۔

بیدار کے دیوان میں ہر قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ اخلاق و تصوف بھی موجود ہیں جن میں درد کا تتبع کیا گیا ہے۔ چند مثالیں درج ہیں۔

کچھ نہ اِدھر ہے نے اُدھر تو ہے  جس طرف کیجیے نظر تو ہے
وہ تو بیدار ہے عیاں لیکن  اس کے جلوے سے بے خبر تو ہے

اِس ہستیِ موہوم پہ غفلت میں نہ کھو عمر  بیدار ہو آگاہ بھروسہ نہیں دم کا

---

بیدار وہ تو ہر دم سو سو کرے ہے جلوے  اس پر بھی گر نہ دیکھے تو ہے قصور تیرا

---

جو کچھ کہ تھا وظائف و اوراد رہ گیا  تیرا ہی ایک نام فقط یاد رہ گیا

---

شکوہ کیا کیجے اپنی غفلت کا  نام بیدار خواب میں رہنا

---

لیکن ان کا اصلی رنگ وہی تغزل ہے جس کا دائرہ موضوع وارداتِ عشق تک محدود ہے اور جو اس دور کا خمیر ہے۔ اپنے معاصرین کی طرح بیدار نے بھی عشق ہی کا راگ اختیار کیا اور اس میں جس قدر ملائمیت اور لطافت پیدا کرسکتے تھے پیدا کی۔ یہ سچ ہے کہ ان کا رنگ تقلیدی ہے لیکن اِس تقلیدی رنگ کو انھوں نے کمال کے درجے تک پہنچایا اور اس میں نام پیدا کیا۔ جذبات کی لطافت و گداختگی،

معنی کی نزاکت و پاکیزگی، اسلوب کا کیف، زبان کا استحکام، غرض کہ کیا ہے جو بیدار کے یہاں نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو میر اور درد کے تیور کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ اب ہم چند اشعار منتخب کر کے پیش کرتے ہیں:

دیتا نہیں دل لے کے وہ مغرور کسی کا — سچ ہے کہ نہ ظالم سے چلے زور کسی کا
بیدار مجھے یاد اسی کی ہے شب و روز — نے بات کسی کی ہے نہ مذکور کسی کا

---

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجے گا — ایک ملنے کو نہ کم کیجے گا
گر یہی زلف دکھا مکھڑا ہے — غارتِ دیر و حرم کیجے گا

---

ہو گئے دور میں اس چشم کی میخانے خراب — نہ کہیں شیشہ چھٹا اور نہ کہیں جام رہا

---

ایک بھی تار نہیں تا سرِ داماں ثابت — اس طرح چاک گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا

---

بسکہ ہے بیدار وہ ہے آفتِ جان — ہم نے بھی قصہ مختصر دیکھا

---

کس کس کا دل نہ شاد کیا تو نے اے فلک — اک میں ہی غم زدہ ہوں کہ ناشاد رہ گیا
بیدار راہِ عشق کسی سے نہ طے ہوئی — صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا

---

غمِ فراق اگر ایسا میں جانتا بیدار — تو اپنے دل کو کسی سے نہ آشنا کرتا

---

جواب کے چھوڑے مجھے غم تری جدائی کا — تمام عمر نہ لوں نام آشنائی کا

---

آشنائی کی توقع کس سے ہو بیدار پھر — ہو گیا بے گانہ جب ایسا ہی اپنا آشنا

---

فتراک میں باندھ خواہ مت باندھ — اب تیرے شکار ہو گئے ہم

جانیں مشتاقوں کی لب تک آگیاں بس ہے ظالم تیری بے پروائیاں
دیکھتے ہی اس کے شیدا ہو گیا کیا ہوئیں بیدار وہ دانائیاں

---

آہ اے یار کیا کروں تجھ بن نالۂ زار کیا کروں تجھ بن
ایک دم بھی نہیں قرار مجھے اے ستم گار کیا کروں تجھ بن
دل ہے بیتاب چشم ہے بے خواب جانِ بیدار کیا کروں تجھ بن

---

محشر فتنہ ہے اس شوخ کی رفتار کے ساتھ جی چلا جائے ہے پازیب کی جھنکار کے ساتھ

---

بیدار چھپائے سے چھپتے ہیں کہیں تیرے چہرے سے نمایاں ہیں آثار محبت کے

---

ستم شعار، وفا دشمن، آشنا بے زار کہو تو ایسے سے کیوں کر کوئی نباہ کرے

---

اس کے مذکور کے سوا بیدار اور کچھ بات خوش نہیں آتی

---

رمز و ایما و اشارات چلی جاتی ہے چھیڑ کی ہم سے وہی بات چلی جاتی ہے
ایک مجھ سے ہی اگر کہیے تو ہے کج خلقی ورنہ اوروں سے مدارات چلی جاتی ہے
ربط جو چاہیے بیدار سو اس سے معلوم مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

---

شتاب آ کہ نہیں تابِ انتظار مجھے ترا خیال ستاتا ہے بار بار مجھے

---

ہم تو کہتے ہیں تجھ کو اے بیدار کیجو مت اس سے آشنا دل کو

---

طلب میں تیری اک تنہا نہ پائے جستجو ٹوٹا کہ نایابی سے تیری تار تارِ آرزو ٹوٹا
کیا ہنگامۂ گل نے مرا جوشِ جنوں تازہ ادھر آئی بہار ادھر گریباں کا رفو ٹوٹا

صورت اس کی سما گئی دل میں　　　آہ کیا آن بھا گئی دل میں

---

نہ وفا ہے نہ مہر و اُلفت ہے　　　اے ستم گر یہ کیا قیامت ہے

---

کف پا ہیں ترے صحرا کی نشانی بیدار　　　مر گیا تو بھی پھولوں میں رہے خار کئی

---

ہے زمانے سے جُدا روز و شب سوختگاں　　　شام کہتے ہیں جسے ہے سحر پروانہ

---

نہ بُت کدے سے کام نہ مطلب حرم سے تھا　　　محوِ خیالِ یار رہے ہم جہاں رہے

---

تو جو بیدار یوں پھرے ہے خراب　　　پاسِ ناموس و نام کچھ بھی ہے

---

گاہ رُونا ہے گاہ ہنسنا ہے　　　عاشقی کا بھی روز عالم ہے

---

اُٹھ کے لوگوں سے کنارے آئیے　　　کچھ ہمیں کہنا ہے پیارے آئیے
کچھ تو کی تاثیر نالے نے مرے　　　آئے تم مدت میں بارے آئیے

---

ناتوانی سے مرے دیکھیو اے دستِ جنوں　　　رہ گیا ہو نہ کوئی تار گریباں میں چھپا

---

اے صبا گل تو کھل چکے پہ کبھو　　　غنچۂ دِل مرا بھی وا ہوگا

---

آہ جس دِن سے تجھ سے آنکھ لگی　　　دِل پہ ہر روز اک نیا غم ہے

---

کھپ گئی جی میں اس جواں کی ادا　　　بل بے تیکھی نگاہ بانکی ادا
باتوں باتوں میں دل لیا بیدار　　　دیکھی اس میرے دلستاں کی ادا

میر حسنؔ نے اپنے تذکرے میں بیدار کا ایک یہ شعر بھی نقل کیا ہے جس کو مولانا عبدالحیؔ صاحب نے "گلِ رعنا" میں بھی لے لیا ہے۔

چھوڑ کر کوئے بتاں جاتا ہے تو کعبے تو    جلد پھر یو تجھے بیدار خدا کو سونپا

یہ ہے بیدارؔ کی شاعری کا رنگ۔ اب ناظرین خود انصاف کریں کہ اس دورِ "نغمہ و غزل" سے بحث کرتے وقت ان کو نظر انداز کر دینا کہاں تک حق بجانب ہوگا۔ آخر میں میں مُصحفیؔ کی رائے کو دُہرا دینا چاہتا ہوں جو بیدارؔ کے متعلق نہایت جچی تُلی اور جامع رائے ہے اور جس کو مولانا عبدالسّلام ندوی نے شعرالہند میں نقل کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ بیدارؔ زبان دانانِ دلّی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں۔

---

(صفحہ ۲۰ کا بقیہ)

"دروغ اور حافظہ میں واقعی شدید بیر ہے۔"

میں نے کہا "اور اب اگر اس کمبخت سے کہا جائے گا تو برا مان جائے گا۔"

نجمی نے حیرت سے کہا "آخر بات کیا ہوئی۔ کچھ معلوم تو ہو۔"

احسن نے کہا: افسانہ نگار سلمہ بہ اسمائی ساری تمہاری اس ہیروئن کا لباس تھا جو اسٹیشن پر ملی تھی مگر ذرا سا چکمہ دیا گیا اور تم بہک گئے دروغ گو کا حافظہ جواب دے گیا۔" نجمی نے بغیر کچھ کہے سنے چھڑی اٹھائی اور بھنّاتا ہوا نکل گیا۔ اب دیکھیں کب صلح ہو اس سے؟ (بشکریہ ماہِ نو کراچی شمارہ اکتوبر ۱۹۴۹ء)

کلیم احمد آبادی

# غزل

ٹوٹ کر دل مسکرایا تو سہی　　کچھ نہ کچھ آرام پایا تو سہی

کم نہیں یہ بھی کہ سازِ دہر پر　　ہم نے اپنا گیت گایا تو سہی

دل کے نالے بے اثر ٹھہرے تو کیا　　خفتہ بختوں کو جگایا تو سہی

کیا تھے ہم، کیا تھی ہماری زندگی　　مر کے لیکن تجھ کو پایا تو سہی

میں نے اس کے سامنے دل رکھ دیا　　دیکھ کر وہ مسکرایا تو سہی

لہر میں تھا آج دیوانہ ترا　　کچھ مزا باتوں میں آیا تو سہی

آخر آخر خشک آنکھوں پر کلیم
ایک تارہ جگمگایا تو سہی

---

جنوبی ہند کے کہنہ مشق شاعر حضرت کلیم احمد آبادی سے ادب نواز حلقہ بخوبی واقف ہے۔ غزل حضرت کلیم کا خاص موضوع رہا ہے اور انھوں نے اس صنفِ شاعری کو اپنا کر اپنا ایک خاص مقام بنا لیا ہے۔

یہ غزل آپ کے مجموعۂ کلام "متاعِ کلیم" سے لی گئی ہے

قیمت : -/۴

شوکت تھانوی

# افسانہ نگار

مجھے افسانہ نگاری، افسانہ نگاروں اور خود افسانوں سے جو نفرت ہوئی ہے، اس میں سب سے بڑا ہاتھ تو نجمی کا ہے۔ حد یہ ہے کہ ابھی کل ہی ایک صاحب بڑے خلوص سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ میں نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان سے باتیں کرتا رہا۔ ان کو سگریٹ دیکر خود دیا سلائیاں جلاتا رہا۔ ان کے لیے پان منگا کر اگالدان ان کی خدمت میں پیش کرتا رہا۔ ان کے لیے چائے منگا کر چائے کے انتظار میں ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا کہ ناگاہ ان کے منہ سے نکل گیا۔

"آپ نے میرا تازہ افسانہ رسالہ مشرق میں پڑھا ہوگا۔"

میں نے ایک دم چونک کر کہا: "جی کیا فرمایا۔ یعنی آپ افسانہ نگار ہیں۔"

وہ بڑے انکسار سے بولے: "افسانہ نگار تو کیا ہوں۔ افسانہ نگاروں کی خاک پا ہوں لکھے ہیں چند افسانے ضرور۔"

عرض کیا: "اچھا تو ٹھیریے میں ابھی حاضر ہوا۔"

اور اندر جا کر ملازم سے کہدیا کہ ان حضرت کو چائے اچھی طرح پلا دینا۔ میں پچھلے دروازے سے جاتا ہوں۔ مجھ کو پوچھیں تو کہدینا انتقال ہوگیا۔ غریب کا۔" بظاہر یہ بات آدمیت سے بھی گئی گزری ہے اور اس پر جنوں کا بھی شک ہوسکتا ہے مگر یہ شک ان ہی حضرات کو ہوگا جو میرے درد سے واقف نہیں ہیں اور جن کو نہیں معلوم کہ اس کمبخت نجمی نے مجھ کو کیسا کیسا زندگی سے بیزار کیا ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں کو دیکھ کر تو خیر میں خود بھاگتا ہوں مگر نجمی جب سامنے آجاتا ہے تو یہ اختیار بھی مجھ سے چھن جاتا ہے کچھ عجیب فالج کی سی کیفیت مجھ پر طاری ہوجاتی ہے اور اسی کیفیت کے ماتحت میں سوچا کرتا ہوں کہ خودکشی کر کے محض اپنی جان دینا مناسب ہوگا یا اس شخص کو گولی مار کر پھانسی پا نا اچھا رہے گا۔ خودکشی

کرکے محض خود مررہنا ایک قسم کی خودغرضی بلکہ تنہا خوری ہے ۔ اور نجمی کو گولی مارکر
پھانسی پانا گویا ایک قومی خدمت بھی ہے اور چونکہ قوم کے خادموں کا یہی حشر ہوتا ہے
لہٰذا یہ پھانسی بھی مجھ کو زندہ جاوید بنا دیگی ۔ مگر مدتیں گزر چکی ہیں نہ خود مرے میاں نہ اسکو
مارا ہے اور اس کی جان لیوا افسانہ نگاری کا سلسلہ بدستور جاری ہے ۔

ہماری یہ داستان غم اس طرح شروع ہوتی ہے کہ نجمی سے دیرینہ مراسم تھے
اچھا خاصا معقول قسم کا نہ بھی سہی تو بھی نامعقول آدمی نہ تھا ۔ سیدھا سادا نام تھا
نجم الدین ۔ کہ ناگاہ آپ کو افسانے پڑھنے کا شوق ہوگیا ۔ یہاں تک کہ یہ شوق اس قدر بڑھا
کہ جو رسالہ آگیا آپ اس کو پڑھ رہے ہیں عشق صادق اس کو کہتے ہیں کہ اچھے یا برے معیاری
یا غیر معیاری ۔ اعلیٰ یا ادنیٰ کی کوئی قید نہ تھی بس افسانہ درکار تھا ۔ نتیجہ یہ کہ چند ہی دن میں
یہ مجاز حقیقت بن گیا اور نجم الدین نے نجمی بنکر خود لکھنا شروع کردیے افسانے ۔ یہ بھی
کوئی بری بات نہ تھی ۔ اچھا شوق تھا ۔ ان کا ایک آدھ افسانہ دوستی کے جرم میں سننا بھی
پڑا جو بظاہر نہایت پوچ اور افسانہ نگاری کی نچلی نگاری کا آئینہ تھا ۔ مگر امید تھی کہ مشق سے
یہ خامیاں دور ہو جائینگی چنانچہ یہی مشورہ ان حضرت کو دیدیا گیا ۔ اب یہ کیا معلوم تھا کہ یہی
مشورہ جان کا عذاب بن جائے گا ۔ اس بندۂ خدا نے ایسی مشق بہم پہونچائی کہ رفتہ رفتہ خود
افسانہ بن کر رہ گیا اور اب تو یہ حال ہے کہ کوئی معمولی سا سوال کرلیجیے جواب میں انشاءاللہ
ایک پورا افسانہ سننا پڑے گا ۔ مثلاً ابھی تین چار دن ہوئے تقریباً ایک ہفتہ تک غائب
رہنے کے بعد نجمی نظر آگئے ۔ ان سے نہایت محفوظ قسم کا سوال کیا گیا ۔

"ارے بھئی کہاں غائب تھے نجمی ۔"

کہنے لگے ۔ "ذرا اسٹیشن چلا گیا تھا ۔"

ظاہر ہے کہ تعجب ہوگا کہ ایک ہفتہ کے لیے اسٹیشن جانے سے کیا مطلب ہو سکتا
ہے بشرطیکہ وہ پولیس اسٹیشن نہ ہو ۔ پھر یہ کہ ذرا اسٹیشن چلا گیا تھا ۔ ایک ہفتہ کی مدت اور
اور اس کے لیے لفظ ذرا کا استعمال ۔ لہٰذا پوچھنا ہی پڑا ۔ "یعنی ایک ہفتہ تک آپ ذرا اسٹیشن چلے گئے تھے ۔"

کہنے لگے ۔ "یہ گھڑی دیکھو میری کلائی پر ۔"

لیجیے معمہ اور الجھ گیا ۔ کیا تعلق ہو سکتا ہے اس جواب کا اس سوال سے جو ان
حضرت سے کیا گیا تھا ۔ معلوم نہیں اسٹیشن گئے تھے یہ حضرت گھڑی ملانے اور ...

چوروں کی گھڑی سمجھ کر دھر لیے گئے ایک ہفتے کے لیے ۔ یا یہ گھڑی ایک ہفتہ کا ایک منٹ بتاتی ہے تاکہ ایک ہفتہ کے لیے لفظ "ذرا" کا استعمال جائز کہا جا سکے بہر حال کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ گھڑی کیوں دکھائی گئی ہے مجبوراً پھر پوچھنا پڑا ۔" گھڑی تو دیکھی مگر بات کیا ہے آخر ۔"

ایک آہ سرد بھر کر بولے ۔" ارے بھئی ریلوے بک اسٹال پر نئے رسالے دیکھنے اکثر جایا کرتا ہوں ۔اس روز جو میں گیا تو سندھ اکسپرس میرے سامنے ہی آہنی پٹریوں پر تیرتی ہوئی پلیٹ فارم سے آلگی اور میرے عین مقابل زنانہ سیکنڈ کلاس .یکایک اسکا دروازہ کھلا ۔ایک سرو قد بجلی سی کوندی اور جب میری نگاہیں ٹھریں تو میں نے دیکھا کہ آسمانی رنگ کی ساری میں لپٹی ہوئی ایک حسینہ آسمانی آویزے کانوں میں پہنے اپنا آسمانی رنگ کا پرس لے میری طرف نگراں ہے ۔متحیر اور متبسم ۔"

عرض کیا :" ظاہر ہے کہ آپ بھی متردد اور متفکر ہوئے ہونگے ۔"

کہنے لگے ۔" مجھ کو معلوم نہیں کہ کیوں کر مگر میرے قدم اسی طرف بڑھنے لگے اور وہ میری طرف بڑھنے لگی قریب آکر اس نے میرے کانوں میں زمزمے انڈیل دیے "تکلیف نہ ہو تو ریفریشمنٹ روم تک رہنمائی کر دیجیے ۔"

"میں اس کے ساتھ نہ صرف ریفریشمنٹ روم تک گیا بلکہ ہم دونوں چار کی پیالی پر ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے بعد چند ہی منٹ میں ایسے گھل مل گئے کہ گویا برسوں کے شناسا ہیں اور آخر اس نے منظور کر لیا کہ لاہور دیکھنے کے لیے وہ گاڑی چھوڑ دے گی ۔"

عرض کیا ۔" چنانچہ چھوڑی اس نے گاڑی ۔"

سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بجی نے کہا ۔" میں نے تو سیہ کو ایک ہوٹل میں ٹھرایا ۔"

عرض کیا ۔گویا اسم مبارک تو سیہ تھا ۔بڑا رنگین نام ہے ۔"

کہنے لگے ۔" نام سے زیادہ رنگین وہ خود تھی اور اپنی رنگینی سے بے خبر اور دوسرے کو دنیا ومافیہا سے بے خبر بنا دینے والی ۔ مجھ کو پتہ بھی نہ چلا کہ ہوٹل میں ایک ہفتہ کس غیر محسوس رفتار سے گزر گیا ۔آج صبح اس کو رخصت ہونا تھا ۔آسمان پر ہلکا ابر چھایا ہوا تھا اور صبح کا ناشتہ شالامار باغ کے اس تخت مرمریں پر میں نے کیا تھا جہاں نگاہ تصور

ہر وقت نور جہاں اور سلیم کو پہلو بہ پہلو دیکھا کرتی ہے۔ فوارے بھی آج بوندوں کا رقص پیش کر رہے تھے اور تالاب میں موجوں کے باریک جال آب رواں بننے میں معروف تھے۔ تو سیہ نے میرا ہاتھ ریشمی ہاتھ میں لیکر کہا۔

"میری کتاب زندگی کا یہ باب ہمیشہ روشن رہے گا۔"

میں نے کہا۔ "مجھ کو یہ روشنی ابدی تاریکیوں کے سپرد کرکے جارہی ہے۔"

اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور میں سمجھ گیا کہ حسین عورتیں اپنے آنسو ہمیشہ اسی طرح چھپاتی ہیں تاکہ حسن کو اعتراف شکست کی توہین کے بچانے میں کامیاب ہوسکیں تھوڑی دیر تک ہم دونوں سناٹے کی زبان میں ایک دوسرے سے بے لفظ و بے آواز گفتگو کرتے رہے۔ آخر اس نے اپنی کلائی سے کھول کر یہ گھڑی کلائی پر باندھ دی میرے ہاتھ میں اس کی گھڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے دو آنسو۔ سرو کے سب سے اونچے درخت پر دو چڑیاں آپس میں سرگوشیاں کررہی تھیں اور کوئی راہگیر گاتا ہوا جارہا تھا ؎

دل لے کے چلے تو نہیں جاؤ گے

میں نے اب مجبور ہوکر فریاد کے انداز میں کہا۔ "نجمی للہ بس کرو۔ اب نہیں سنا جاتا اپنے بچوں کا صدقہ اب بخشدو تم سے ایک نہایت معصوم سی بات پوچھی تم نے پورا افسانہ سنا ڈالا آئندہ کے لیے بات پوچھنے کی بھی توبہ کی۔"

نجمی نے نہایت برا مان کر انتہائی تلخی سے کہا۔ "مصیبت تو یہ ہے کہ افسانہ نگار کا ہر واقعہ افسانہ سمجھا جاتا ہے۔ صحبت نا جنس کی اس سے بڑھ کر ٹریجڈی اور کیا ہوگی۔"

اور واقعی نجمی خفا ہوکر چلے گئے۔ مگر ان کی اس خفگی کی عمر کا بھی ان کے نیاز مندوں کو اتنا ہی اندازہ ہے جتنا اپنی توبہ کی مدت کا۔ جب پھر سامنا ہوجائے گا اسی قسم کا کوئی تازہ افسانہ سننا پڑے گا جس کے بعد پھر یہی بیزاری اور پھر نجمی کی خفگی اور ان سے کترانے یا ان کو مخاطب نہ کرنے کا بھی تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اشرف کوئٹہ سے واپس آیا تھا۔ اس سے کوئٹہ کے متعلق باتیں ہورہی تھیں کہ آپ پھٹ پڑے نجمی میں۔

کوئٹہ کا حال مجھ سے پوچھیے۔ وہ گلیاں یاد آتی ہیں جہاں جن میں کھوئی ہے۔

ہم لوگوں نے تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگنے کا ارادہ کیا کہ اب حرف ہاتھ آتا ہے

کوئی افسانہ مگر اشرف اس قدر خودکار واقع ہوا ہے کہ اس کو بھی ان افسانوں نے
ہماری ہی طرح عاجز کر رکھا تھا مگر وہ جان بوجھ کر اور عاجز ہونا چاہتا تھا اور بڑے
غور سے یہ افسانے سنتا تھا. بڑے اشتیاق سے گویا ہمہ تن گوش بن کر کہنے لگا۔

"آپ کی جوانی کوئٹہ کی گلیوں میں کھوئی ہے ؟ وہ کیسے ۔"

نجمی نے اپنے مخصوص انداز سے سگریٹ کا دھواں آسماں کی طرف روانہ کرتے
ہوئے کہا ۔" میں تو کافی رہ چکا ہوں کوئٹہ میں اور یہ واقعہ ہے کہ جیسی صحت وہاں بن گئی تھی
پھر نہ بن سکی کبھی ۔ ایک تو یہ ذکر بھی اس وقت کا ہے جب شباب اپنے پورے
شباب پر تھا. سیب برستے تھے رخساروں سے ۔ تولیدِ خون کا یہ عالم کہ لال بھبوکا ہو رہا تھا
اسپر کوئٹہ کی آب و ہوا. قیامت بالائے قیامت۔

اشرف نے بے صبری سے کہا :" وہ تو آثار بتاتے ہیں کہ جس کے یہ کھنڈر ہیں یہ
عمارت قابل دید ہوگی کبھی. مگر وہ جوانی کھونے کا قصہ ۔"

نجمی نے اس دخل در معقولات کو بزرگانہ شفقت سے گویا ٹال کر اپنا سلسلہ جاری
رکھا ." میرا طریقہ تھا کہ دسمبر اور جنوری کے مہینے میں بھی جبکہ کوئٹہ کرۂ زمہریر بن جاتا ہے
نور کے تڑکے گھر سے نکل کر برف سے ڈھکی ہوئی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا چشمے تک جاتا تھا
اور چشمے کی سطح پر جمی ہوئی برف توڑ کر چشمہ کی تہ سے پانی نکالکر نہاتا تھا ۔ یہی وہ غسل تھا
جس نے مجھ کو قندھاری انار کی طرح سرخ کر رکھا تھا. ایک دن جبکہ ساری سطح ارض
برف کی چادر اوڑھے سو رہی تھی ۔ درختوں پر اکا دکا چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور ساری
فضا برف میں ملفوف سفید ہی سفید نظر آ رہی تھی میں اس مرمریں عالم میں گھومتا
پھرتا چشمہ کے کنارے پہونچا ۔ برف کو توڑا اور کپڑے اتار کر اپنے گھنے سنہری بالوں کو
منتشر کر کے پانی میں اتر کر نہانے لگا ۔ یخ بستہ پانی میں دیر تک ہلچل پیدا کرنے کے بعد
میں چشمے سے باہر نکلا. تولیے سے جسم خشک کیا اور کپڑے پہن کر گھنیرے بالوں کو خشک کر
رہا تھا کہ ایک نغمہ میری سماعت میں تیر گیا ۔" اتنے ٹھنڈے پانی سے آپ نہائے ۔"

اشرف نے نعرہ بلند کیا ۔" ناممکن ۔"

نجمی نے تلخی سے اس کو جھڑکا ۔" بات سنو آدمیوں کی طرح. اس نے کہا" اتنے ٹھنڈے
پانی سے آپ نہائے ۔" اور اب جو میں نے گھوم کر دیکھا تو ایک دوشیزہ کہسار کھڑی ہوئی

مسکرا رہی تھی۔ بنفشہ کا کھلا ہوا پھول، یا برف کے دربار میں سورج کی سفارت کرنے والی پہلی کرن آنکھوں میں ایک پیام۔ لبوں پر ایک تبسم اور بحیثیت مجموعی ایک ایسا نغمہ جو ابھی پردۂ ساز میں محفوظ ہو۔ میں دیر تک اس کو دیکھتا رہا کہ اس نے پھر اسی الہڑ معصومیت سے کہا۔ "آپ کو سردی نہیں لگتی برف کے پانی سے اس وقت نہاکر؟"

میں نے جواب دیا۔" روز نہاتا ہوں عادت پڑ گئی ہے۔"

اس نے اپنے دوپٹے سے کھیلتے ہوئے کہا۔" میں بھی تو روز آپ کو دیکھتی ہوں آج پوچھا ہے۔"

میں نے حیرت سے کہا۔" آپ روز دیکھتی ہیں۔ کیوں؟"

اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔" نہ جانے کیوں۔ مگر دیکھتی ہوں۔ ایک مرتبہ بکریاں چراتی اس وقت اسی طرف نکل آئی تھی آپ نہا رہے تھے آپ کو دیکھا تو روز دیکھنے لگی۔"

میں نے دیکھا کہ اس روز کی دیکھنے والی کی نظروں میں اب تک پیاس تھی میں نے شرارت سے کہا۔" مگر تم کو معلوم ہے کہ یہ چوری ہے۔ تو کیا تم چور ہو۔"

اس نے کہا۔" میں چور نہیں ہوں صاحب۔ پر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اگر آپ برا مان گئے ہیں تو کل سے ادھر نہ آؤں گی۔"

میں نے اس کے قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" ابھی تو برا نہیں مانا، لیکن اگر تم کل سے ادھر نہ آئیں تو بیشک برا مان جاؤں گا۔"

اب میرا یہ معمول ہو گیا کہ صبح اٹھ کر چشمے پر جاتا۔ برف توڑ کر نہاتا۔

بہر حال تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میرا معمول ہو گیا کہ صبح اٹھ کر چشمے پر جاتا اور برف توڑ کر نہاتا وہ سادہ سادہ معصوم باتیں کرتی میٹھے میٹھے گیت سناتی۔ میرے بالوں سے کھیلتی۔ اپنے زانو پر میرا سر رکھ کر اپنی مرمریں انگلیاں بالوں میں کبھی الجھاتی اور کبھی سلجھاتی اور اکثر کہا کرتی کہ۔" صاحب تم ایک دن زندگی بھر کا روگ دیکر چلے جاؤ گے یہ چشمہ سونا ہو جائے گا۔ یہ برف گھل جائے گی۔ یہ چہکنے والی چڑیاں اڑ جائیں گی۔ ہائے میں کیا کروں گی۔" اور یہ کہہ کر وہ کھوسی جاتی میرے بالوں میں تیرنے والی انگلیاں ڈوب سی جاتیں اور آخر میں اس کے تمتماتے ہوئے رخساروں پر ایک چھپکی دیکھ کر کہتا: "پگلی نہیں تو

میں کہاں جا رہا ہوں بھلا اور اگر گیا کہیں تو تجھ کو بھی چلنا پڑے گا۔"

وہ ایک دم خوش ہو کر کہتی لے چلو گے مجھے۔ چلو آج ہی لے چلو۔"

مگر جب مجھ کو رخصت ہونا تھا تو مجھے اس معصوم سے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں دو روز کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ اس نے مجھے اس طرح رخصت کیا کہ میری خاطر لبوں پر مسکراہٹ بھی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھی۔ اس کی بکریاں آنکھیں پھاڑ کر مجھ کو دیکھ رہی تھیں۔ فضا منجمد تھی اور میرا دل پتھر ہو چکا تھا۔

میں نے ایک دم سر جھٹک کر کہا۔ " شکر ہے ختم تو ہوا افسانہ"

نجمی نے ایک دم اپنے افسانے کی دنیا کے واقعات کے عالم میں چونک کر کہا۔ " تو گویا یہ بھی افسانہ تھا۔ بہتر ہے۔ لعنت ہے اب مجھ پر جو کبھی اس بزم میں لب کشائی بھی کروں۔"

اشرف نے روکا۔ احسن نے اصرار کیا۔ اقبال نے دامن پکڑا یہاں تک کہ میں نے بھی معذرت چاہی کہ افسانہ کو افسانہ کیوں کہہ دیا تھا مگر توبہ کیجیے تیر کمان سے نکل چکا تھا اور نجمی غریب خانے سے جا چکے تھے۔ نجمی کے جانے کے بعد اشرف نے کہا:

" سوال یہ ہے کہ اگر وہ افسانہ گوئی سے باز نہیں آتا تو ہمارا کیا لیتا ہے۔"

میں نے کہا " کیا خوب ہمارا سب سے بڑا نقصان یہی کرتا ہے کہ ہمارے ذوقِ سلیم کو زندہ درگور کر جاتا ہے۔ ہم کو اتنا بے وقوف سمجھتا ہے جتنا وہ خود ہے ہم کو ہر قسم کے بازاری افسانے سناتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم سچ مچ ان کو جیتے جاگتے واقعات سمجھ لیں۔ ایک دوست کے لیے اتنی قربانیاں تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔"

احسن نے کہا " بھئی مفت کے قصے سننے کو ملتے ہیں۔"

میں نے کہا " بھائی جان۔ ان قصوں کو سنکر بد مذاقی اور سستے پن کا جو زہر پھیل رہا ہے اس کا کیا علاج ہو۔"

اشرف نے جو ابتک کچھ سوچ رہے تھے ایک دم اچھل کر کہا " بھئی میں اس کو مناؤں گا اور اس کے سنائے ہوئے افسانوں پر تنقید کرونگا جتنا ٹیکس افسانے سنا کر اس نے وصول کیا ہے اتنا ہی ہم کو بھی تنقید کر کے اس سے وصول کرنا ہے۔"

چنانچہ شام کو اشرف کے یہاں ہم سب موجود تھے۔ نجمی بھی اس طرح گھلے ملے بیٹھے تھے

گویا صبح کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ چائے کا دور چل رہا تھا کہ ایک دم اشرف نے کہا: "بھئی نجمی تمہاری اس جنت برفستان دوشیزہ کہسار کے متعلق یہ نہ معلوم ہوا کہ وہ صاحبزادی رہنے والی کہاں کی تھیں۔"

نجمی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "اسی اطراف کی تھی۔"

اشرف نے کہا۔ "مگر زبان تو بڑی ٹکسالی بولتی تھی کہ صاحب تم زندگی بھر کا روگ دیکر چلے جاؤگے۔ یہ چشمہ سونا ہوجائے گا۔ یہ برف پگھل جائے گی۔ یہ چہکنے والی چڑیاں اڑجائیں گی۔ ہائے میں کیا کروں گی۔"

احسن نے کہا: "زبان کے علاوہ تخیل بھی بڑا ادیبانہ ہے۔ یہ چشمہ سونا ہوجائے گا یہ برف پگھل جائے گی وغیرہ۔"

میں نے گویا نجمی کی طرفداری کی۔ "بھئی اس کے مفہوم کو اپنی زبان میں انہوں نے بیان کیا ہے۔"

نجمی نے خوش ہوکر کہا۔ "ظاہر ہے ارے بھئی یہ تو ظاہر ہی ہے کہ میں اس کی طرح کچی زبان تو بول نہیں سکتا وہ تو اردو اور پہاڑی زبان ملاکر کچھ عجیب باتیں کرتی تھی۔"

اشرف نے کہا "گویا الفاظ آپ کے ہیں اور مفہوم اس کا۔"

احسن نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ مفہوم بھی ان ہی کا ہو۔"

نجمی نے چونک کر کہا: "جی؟ کیا مطلب؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مفہوم بھی میرا ہی ہو"

میں نے ایک اور جھکائی دی۔ "خیر چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ کہ وہ عموماً آسمانی ساری پر آسمانی آویزے کانوں میں پہنے رہتی تھی یہ گویا اس کا پسندیدہ لباس تھا۔"

نجمی نے کہا۔ "خیر لباس بدلنے میں تو اسکو بڑا سلیقہ تھا۔ مگر زیادہ تر آسمانی ساری میں نظر آئی مجھ کو۔"

اشرف اس وقت پانی پی رہا تھا اس کو شدید قسم کا اچھو ہوگیا۔ احسن اپنے قہقہے کی آواز کا توازن درست نہ رکھ سکا نجمی حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا آخر اشرف نے اپنے کو قابو میں لاکر کہا۔

(باقی ص ۱۱ پر)

## شراب کہنہ

# انیس

۱۸۰۱ء ـــــــــــــــ ۱۸۷۴ء

میر ببر علی انیس، شاعری اور مرثیہ گوئی ان کو ورثے میں ملی تھی، ان کے دادا میر ضاحک (جو دہلی کی تباہی کے بعد فیض آباد چلے آئے تھے اور پھر اس خاندان کے دوسرے بزرگوں نے لکھنؤ جا کر بود و باش اختیار کر لی تھی) نہایت زندہ دل اور ظریف طبع لوگوں میں سے تھے۔ دادا، میر غلام حسن حسن اپنی مشہور و معروف مثنوی "سحر البیان" کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ والد، میر مستحسن خلیق اپنے دور کے ایک مشاق غزل گو اور مشہور مرثیہ نویس تھے۔

میر انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے اس کے بعد لکھنؤ چلے آئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم فیض آباد میں میر نجف علی سے اور لکھنؤ میں مولوی حیدر علی سے حاصل کی۔ تربیت میں ان کی والدہ ماجدہ کا دخل رہا۔ جو ایک نہایت ہی لائق اور دین دار خاتون تھیں۔ شاعری کے سلسلے میں والد ماجد نے رہ نمائی کی ہوگی۔ روایت ہے کہ میر انیس کا ابتدائی رجحان غزل کی طرف تھا مگر پدر بزرگوار نے مرثیہ گوئی کو توشۂ آخرت خیال کر کے ان کی طرف متوجہ کیا اور پھر سعادت شعار فرزند نے جو اس میدان میں قدم رکھا تو واقعہ یہ ہے کہ اس صنف کو معراج تک پہنچا دیا۔

اردو میں رزمیہ شاعری کی جو کمی تھی وہ میر انیس کی بدولت حسن و خوبی کے ساتھ پوری ہوئی۔ باوجود ان کے کہ مرثیے کا موضوع محدود اور اس کا مسالا ایک مخصوص فرقے کے معتقدات پر مبنی ہے لیکن میر انیس نے اسی محدود اور مخصوص ضمن اور صنف میں، منظر کشی، جذبات نگاری، سیرت و کردار کی تصویری، سلاست بیان، روانی و شگفتگی، فصاحت، صنائع و بدائع کا حسین ترین استعمال اور بلاغت کے اصل معیار اور اس کی صحیح تعریف کا جو استادانہ لحاظ و اہتمام کیا ہے ان میں ان کا مد مقابل مشکل ہی سے نکل سکے گا۔

الفاظ کا جو زبردست خزانہ میر انیس کے قبضے میں تھا اور ان کو جس اعتماد اور سلیقے سے وہ کام میں لائے ہیں کہیں اور اس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ اردو زبان پر تو وہ مستند طور پر قادر تھے ہی اسی کے ساتھ فارسی، عربی۔ فنون سپہ گری اور علم نفسیات کے بھی وہ بڑے ماہر اور مبصر تھے۔

پرہیزگاری، خودداری، وضع داری اور پابندیٔ اوقات بھی ان کے اوصاف اور کردار کی نمایاں خصوصیتیں رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ میر صاحب مغفور نے تقریباً دو لاکھ شعر کہے نول کشور پریس لکھنؤ اور نظامی پریس بدایوں سے ان کے مرثیوں کی کئی کئی جلدیں شائع ہو چکی ہیں پھر بھی ابھی بہت سا کلام ان کا غیر مطبوعہ ہے۔

مرثیوں کے علاوہ انھوں نے 'سلام' اور 'رباعیاں' بھی بہت سی کہی ہیں اور ان دونوں اصناف میں بھی ان کی قدرت زبان، پاکیزگیٔ تخیل اور جملہ شاعرانہ اوصاف و کمالات کا پورا پورا ثبوت موجود ہے۔

## انتخاب

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے  
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے

---

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں  
قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں  
ذرے کی چمک مہر منور سے ملا دوں  
خاروں کو نزاکت میں گل تر سے ملا دوں  
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں  
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

---

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے  
تیرگی بد ہے، مگر نیک ہے گیسو کے لیے  
سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لیے  
زیب ہے خال سیہ چہرۂ گل رو کے لیے  
داند آں کس کہ فصاحت بکلامے دارد  
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

---

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا  
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

---

خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے　　شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے

---

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر　　بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

---

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں　　پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

---

پانی تھا آگ، گرمیٔ روزِ حساب تھی　　ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

---

تھا فرطِ غش سے ننھا سا منکا ڈھلا ہوا　　باندھے ہوئے تھا مٹھیاں اور منہ کھلا ہوا

---

چھاتی میں دم بدم جو دم اس کا اٹکتا تھا　　گھبرا کے ننھے ہاتھوں کو دے دے پٹکتا تھا

---

بجلی کبھی بنا، کبھی رہوار بن گیا　　آیا عرق تو ابرِ گہر بار بن گیا
گہ قطب، گاہ گنبدِ دوّار بن گیا　　نقطہ بنا کبھی کبھی پرکار بن گیا

---

حیراں تھے اس کے گشت پہ لوگ اس ہجوم کے　　تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

---

رخش ایسا روم و رے میں نہیں شام میں نہیں　　یہ شوخیاں تو ابلقِ ایام میں نہیں

---

چمکی، گری، اٹھی، ادھر آئی، ادھر گئی　　خالی کئے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم، کبھی بالائے سر گئی　　ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی

---

دل میں بدی، طبیعتِ بد میں بگاڑ تھا　　گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

---

فرا سکے نہ یہ کہ شہ مشرقین ہوں — مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

---

## سلام

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو — ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو
لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار — خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
غلط یہ لفظ، وہ بندش بری یہ مضمون سست — ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو
خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم — انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

---

انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ — چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

---

## رباعی

نا فہم سے کب داد سخن لیتا ہوں — دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں
چھپتی نہیں بوئے دوستان یک رنگ — کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

---

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

---

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں — یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے — حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

# نئی مطبوعات

جگن ناتھ آزاد اور ان کی شاعری (ادب) حمید سلطان قیمت ۴/۵۰ ناشر مکتبہ شاہراہ، دہلی ۶

اکبر الہ آبادی اور ان کا کلام ( " ) نور الرحمٰن ۲/- " " " " "

پانی پت اور بزرگان پانی پت (تاریخ) مولانا محمد میاں ۵/۵۰ رشیدیہ کتب خانہ، دہلی ۶

ریشمہ (ناول) زبیدہ خاتون ۴/۲۵ " سہیل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

زرکا فرزند غازی ( " ) عشرت رحمانی ۴/۲۵ " " " " " "

ستلج سے برہم پتر تک (ناول) دت بھارتی ۵/- " بھارتی بک کلب، نئی دہلی

منزل سے دور (ناول) خورشید نکہت ۴/- " ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

آزاد کے افسانے (افسانے) مرتبہ محمود قاسم صدیقی ۱/۵۰ " " " " " "

بدگمان (ناول) عارف مارہروی ۳/۵۰ " ہائی وے پبلیکیشنز، جموں

رخسار سحر (مجموعہ کلام) خورشید احمد جامی " انجمن ترقی اردو، حیدرآباد

پاکستانی کلچر (کلچر) جمیل جالبی ۸/- " مشتاق بکڈپو، کراچی ۱

تنقیدی نقوش (تنقید) ڈاکٹر عبد القیوم ۳/۷۵ " " " " "

نقوشِ خیال (مضامین) عبد الرزاق فاضلی ۳/- " " " " "

حیات حافظ رحمت خاں (سوانح) سید الطاف علی بریلوی ۱۰/- ملنے کا پتہ " " "

تحقیق و تنقید (تنقید) فرمان فتح پوری ۴/- " " " " "

رقصِ طاؤس (مجموعہ کلام) ڈاکٹر مسعود حسین ۴/- " " " " "

# زیر طبع کتابیں

باغ و بہار (داستان) میر امن ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵

خنداں (مضامین) رشید احمد صدیقی " " " " "

تنقید کیا ہے (تنقید) آل احمد سرور " " " " "

نقد اقبال ( " ) میکش اکبرآبادی " " " " "

خواجہ میر درد (ادب) عبد القدیر ایم اے قیمت ۶/- ناشر مکتبہ شاہراہ، دہلی ۶

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## موت پر فتح

از: جیالال ساز
صفحات: ۵۲ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
(سن اشاعت: جولائی ۱۹۶۳ء)

برنارڈ شا نے کہا تھا کہ جب آدمی کے جینے کے دن آتے ہیں تو وہ مرجاتا ہے، یہ بات ہے بڑے پتے کی، جیالال صاحب کے کرداروں کی عمریں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے انسان ابھی مایوس نہیں ہوا ہے، نہ صرف زندگی سے پیار ہے بلکہ وہ اس کو سنوارنے اور سدھارنے کی سعی پیہم کا قائل بھی ہے۔

ساز صاحب نے اپنے ڈرامے کا موضوع وہ منتخب کیا ہے جس کی ہمارے ادب کو ضرورت تھی یہ ایٹم کا زمانہ ہے اور ہائیڈروجن بم کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہوئے آدمی موت کے تصور سے بے نیاز ہو کر چاند اور ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہو تو پھر ادب سے سائنس کو الگ رکھنا جرم ہو جاتا ہے۔

جیالال صاحب ساز کی کوشش دلچسپ اور بعض حیثیتوں سے کامیاب ہے۔ زبان صاف ستھری ہے اور جس طرح غالب کی بحر میں شاعری کرنے والے خطرہ مول لیتے ہیں ویسے ہی ڈرامے میں شیکسپیئر کے میدان میں قدم رکھنا بھی کبھی کبھی جان لیوا ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہیلٹ کے بعد لوگوں کو اتنے بڑے بڑے ڈائلاگ سے احتراز کرنا چاہیئے۔

کتابت وطباعت کے معاملے میں حسن وسلیقے کا جو اہتمام رکھا گیا ہے اس کے لیے مکتبہ جامعہ تعریف کا مستحق ہے۔

## رُباعیاتِ دبیر

مرتبہ : سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی
صفحات : ۷۷ ، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت : ایک روپیہ
ناشر : نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

(سن اشاعت : جون ۱۹۶۲ء)

مرزا سلامت علی دبیر نے فن مرثیہ گوئی کو تو بام عروج پر پہنچایا ہی ہے، اس کے علاوہ رباعی کی طرف بھی ان کی توجہ کم نہیں رہی ہے، مذہبیت، عقیدت اور اخلاق کے بڑے بڑے نکتے اور طرح طرح کے پہلو انھوں نے رباعیوں میں قلم بند فرما دیئے ہیں۔ جن کو پڑھنے کے بعد ان کے کمالات اور اعجاز سخن کا اور بھی معترف ہونا پڑتا ہے۔ مرزا صاحب نے ہزاروں رباعیاں کہیں ہیں ان کے ایک لائق قدردان جناب خبیر لکھنوی نے نہایت معقول اور مستحسن خدمت یہ انجام دی کہ اُن ہزارہا رباعیات میں سے نہایت خلوص اور حسن نظر کے ساتھ ۱۹۷ رباعیاں انتخاب کر کے ایک چھوٹی سی کتاب میں محفوظ کر دی ہیں۔

فاضل مرتب نے شروع میں نہایت اختصار کے ساتھ رباعی کی تاریخ بیان کر دی ہے ان کے اوزان لکھ دیئے ہیں، اور اس غلط فہمی کو واضح کر دیا ہے جو رباعی اور قطعہ کے سلسلے میں نہایت عام ہے۔ پھر مرزا دبیر کی زندگی، مشاغل اور مرثیہ گوئی کے بارے میں ضروری معلومات درج کر دی ہیں۔ اس کے بعد بہت سے عنوانات قائم کر کے ان کے تحت جو رباعیاں آتی ہیں وہ لکھتے چلے گئے ہیں۔

اس کاوش اور کاریگری کی داد اہل سخن اور اہل نظر دونوں پر واجب ہے۔

رشید نعمانی



## سُمن

مصنفہ : رضیہ سجاد ظہیر
صفحات : ۳۳۶ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت : پانچ روپے
ناشر : نئی روشنی پرکاشن۔ گوردوارہ روڈ۔ قرول باغ، نئی دہلی

(سن اشاعت : اکتوبر ۱۹۶۳ء)

سمن کی ماں جسم فروش تھی اور اپنی بیٹی کو بھی اسی راہ پر لگانا چاہتی تھی لیکن سمن کے دل میں

اچھا استاد ماسٹر رام دین کی بات بیٹھ چکی تھی کہ شرافت انسان کی طبیعت میں ہوتی ہے، اس کی وراثت میں نہیں" سمن نے گھر کا عیش و آرام چھوڑا، ماں سے منہ موڑا اور تن تنہا شرافت کی راہ پر چل پڑی۔ زمانے نے اسے ستایا بہت، مگر وہ ثابت قدم رہی۔ اس کے راستے میں اچھے بُرے سب ہی لوگ آئے۔ کس کس طرح؟ یہ رضیہ سجاد ظہیر کے ناول "سمن" کا موضوع ہے۔ انھوں نے ایک نہایت ہی اہم سماجی مسئلے کے پیچ و خم بڑی صناعی کے ساتھ ظاہر کر دیئے ہیں۔

اس ناول کا کینوس مختصر سا ہے۔ لکھنؤ کا ایک نوابی خاندان موسم گرما کے آغاز پر نینی تال روانہ ہوتا ہے اور برسات آتے آتے واپس آجاتا ہے۔ بس ان ہی دو تین مہینوں کی سرگزشت سے ساری داستان مرتب ہوجاتی ہے۔ نینی تال اور لکھنؤ کی زندگی کے مرقعے بڑے اچھے اور سچے ہیں بیگم سخاوت حسین کا کردار نہایت جاندار اور حقیقی ہے۔ ان کی طبیعت کے اوچھے پن کو بڑی خوب صورتی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ سلمان اور یوسف دو مختلف المزاج نوجوان ہیں مگر دونوں ہمارے نوجوانوں کے لیئے اپنے اپنے انداز میں شرافت و فراست کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ماسٹر رام دین اور پروفیسر رفیق اپنے پیشے کی آبرو ہیں۔ اور بیگم سخاوت حسین کے منشی جی تو خوب ہی ہیں۔

رضیہ سجاد ظہیر کا مشاہدہ دقیق اور قلم رواں۔ سارے ناول میں وعظ و نصیحت کی ذرا سی بو باس تک نہیں لیکن تاثر کے اعتبار سے عمل صالح کی دعوت اور اقدار کی تلقین سب کچھ اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ "سمن" میں آج کل کے سماج پر جابجا اچھے خاصے "چھینٹے" موجود ہیں تاہم ایسا لگتا ہے کہ معاشرے کی ایک کمزوری کو اچھی طرح محسوس کرانے کے لیئے دوسری خامیوں کو ابھرنے نہیں دیا ہے۔ آخری باب میں کسی قدر عجلت کے ساتھ تمت بالخیر ہوتا ہے اور سب رشتے جوڑ دیئے جاتے ہیں۔

"سمن" میں حقیقت نگاری کی کشش بھی موجود ہے اور لطف زبان کا جادو بھی۔ اس لیئے خواہش پیدا ہوتی ہے کہ پورا ناول ایک ساتھ ہی ختم کرلیا جائے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

## تاریخی کہانیاں

مرتبہ : مولانا نسیم بستوی
صفحات : ۱۸۰ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت : دو روپے
ناشر : مکتبہ لطیفیہ - براون شریف ضلع بستی یوپی

کسی بھی زبان کے ادب میں کہانیاں دلکشی کا موجب ہوتی ہیں - ان سے دل خوش ہوتا ہے اور بعض اخلاقی اور تمدنی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں - تاریخی کہانیاں تو اس اعتبار سے اور بھی زیادہ قابل توجہ ہیں کہ ان میں ایسے اصحاب کے واقعات کا بیان ہوتا ہے جو ہماری ہی طرح گزرے ہیں اور جن کی زندگی اور تجربوں سے باوجود ایک زمانہ گزر جانے کے ہم اب بھی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں -

مولانا نسیم نے ایسی ہی کہانیاں مذکورہ نام سے مرتب فرمائی ہیں - ان میں سے بیشتر کہانیوں کی بنیاد اسلامی تاریخ، قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی سیرت، اور اسلامی روایات پر ہے - انھیں زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے موصوف نے کہیں کہیں ان کے خاکے میں افسانوی رنگ بھر دیا ہے - اس سے غرض یہ ہے کہ قاری انھیں شوق سے پڑھے اور اس کے دل پر گہرے نقش ثبت ہوں -

ان کہانیوں سے نیک مسلمانوں کی سیرت اور زندگی سے وقوف حاصل ہوتا ہے اور یہ وقوف قاری میں صداقت اور نیکی، شجاعت اور بے خوفی، علم اور عمل صالح، ایثار و قربانی اور بندگانِ خدا کی بے لوث خدمت کی زندگی بسر کرنے کی صفات پیدا کرتا -

محمد شفیع الدین نیر ایم اے



## زمین کی کہانی

(سن اشاعت جون سنہ ۱۹۶۳ء)

از : انصار اعظمی
صفحات : ۳۲ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت : ۷۵ نئے پیسے
ناشر : احباب پبلشرز، گولہ گنج، لکھنؤ

اردو زبان میں دلچسپی لینے والے حضرات اب اگر سائنٹفک لٹریچر کی کمی کو پورا کرنے کی

کوشش کر رہے ہیں تو یقیناً یہ قابل ستائش ہے۔ اس کتاب کی زبان سادہ اور انداز بچوں کے لیے موزوں ہے مصنف نے نئے اور بدلتے ہوئے حالات کو سامنے رکھ کر اپنے خیالات قلم بند کیے ہیں جیسے کہ زمین کی گولائی کا ثبوت، سورج اور چاند کے متعلق اعداد و شمار وغیرہ۔ اس کے علاوہ چند سائنس دانوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن اگر مصنف نے اس کتاب کو ترتیب دینے میں ذرا اور کاوش کی ہوتی تو اس کی کئی خامیاں دور ہو گئی ہوتیں۔

مثلاً دنیا کی آبادی ۲½ ارب بتائی گئی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے اور اب آبادی ۵ ارب سے زیادہ ہو چکی ہے۔ ایک جگہ زمین کا ذکر آتے آتے ایک دم تاروں کا ذکر آجاتا ہے۔ قاعدے سے زمین کے بعد زہرہ، مریخ، مشتری وغیرہ جیسے سیاروں کا ذکر آتا، اس کے بعد کہکشاں اور پھر تاروں کا سرسری جائزہ لینا چاہیے تھا۔ بعض شکلوں کا رنگ پیلا ہے۔ اس سے وہ واضح نہیں ہوتیں اور اچھا نقشہ بنانے یا پیش کرنے کا جو مقصد ہے وہ فوت ہو جاتا ہے۔ البتہ ایک شکل جو ہرے رنگ کی ہے وہ اچھی اور بہت خوب ہے لیکن اس میں سیاروں کے نام انگریزی میں لکھے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ یہ نام اردو میں ہوتے۔

ایک جگہ یہ جملہ لکھا ہوا ہے: "زمین کے چاروں طرف ہوا ہے۔ زمین کی کشش ہی کی بدولت ہوا بھی زمین کے قابو میں رہتی ہے"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک حقیقت ہے لیکن بیان تشنہ ہے اور اس کی تشریح کی ضرورت تھی ورنہ اتنے مختصر بیان سے بچوں اور طلبا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی اور نہ وہ ہوا یا کرۂ ہوائی کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔

ایک دوسری جگہ درج ہے: "کون جانے کس وقت زمین کے کس حصے میں آتش فشاں پھوٹ پڑے"۔ یہ بیان روائتی قسم کا ہے۔ ایسی کتاب لکھنے سے غلط روایت کو جو ختم کرنا مقصود تھا وہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ مبہم سا جملہ لکھ کر اس کی افادیت اور مستحکم ہو جاتی ہے۔ ہمارے سائنس داں اور زمین کے ماہرین جانتے ہیں کہ زمین میں ہر جگہ من مانے آتش فشاں نہیں پھوٹ سکتے۔

امید ہے کہ دوسرے اڈیشن میں ان خامیوں کو دور کرنے کی طرف توجہ دی جائے گی۔

محمد امین

# ادبی خبریں

مرتبہ: ظلِ عباس عباسی

## قومی یک جہتی اور شاعری

دلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ۷ مارچ ۱۹۶۴ء کی شام کو چھ بجے ڈاکٹر ہردیے ناتھ کنزرو صدر آل انڈیا انجمن ترقی اردو ہند کی صدارت میں انجمن تحقیقات اردو دلی یونیورسٹی" کا ایک جلسہ ہوا جس میں جناب مغیث الدین فریدی صاحب استاد شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی نے اپنا مقالہ "قومی یک جہتی اور اردو" پڑھا۔ مقالے کی ابتدا سے قبل مملکت روس کے دو عظیم ادیبوں کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا۔ جس میں معزز مہمانوں نے روسی ادب کے متعلق مفید معلومات فراہم کیں اور شعبہ اردو کے لیے اپنی تصانیف تحفۃً پیش کیں۔

## اردو مجلس حیدرآباد

اردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی اجلاس اتوار ۲۹ مارچ کو شام کے ۶ بجے اردو ہال واقع حمایت نگر میں صدر اردو مجلس رائے جانکی پرشاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب اختر حسن سابق مدیر "پیام" نے "قطب شاہی دور کا فارسی ادب" کے زیر عنوان تقریر کی۔

مسٹر شری نواس لاہوتی نے ہندی کے شاعر سوریا کانت ترپاٹھی نرالا کی شخصیت اور شاعری پر مضمون سنایا۔

محفلِ شعر و سخن میں حمید۔ شاد۔ خواجہ یوسف الدین آسد انصاری۔ احساس ناظمی۔ راجیشور رعنا۔ فیض الحسن خیال۔ ناز حیدر۔ صلاح الدین نیر۔ رحمٰن جامی، برق یوسفی۔ شور مینائی۔ تاج مہجور۔ اور مسافر نلگنڈوی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ جناب محمد منظور احمد معتمد انجمن کے شکریے پر ساڑھے آٹھ بجے ادبی اجلاس اختتام کو پہنچا۔

(د۔ خ۔ ش)

## بہترین مضامین پر انعام

حاجی وارث علی شاہ مسولیم ٹرسٹ، دیوہ شریف (بارہ بنکی) نے تحریری مقالات پہ ڈھائی، ڈھائی سو

روپے کے دو انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ مقالات "حضرت حاجی سید وارث علی شاہ صاحب کی حیات پاک، تعلیمات وارشادات" اور دیوہ شریف کی روحانی اور علمی تاریخ" پر لکھے جائیں گے۔ شرائط براہ راست ٹرسٹ سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

## پنجاب کی لسانی پالیسی

انڈین ایکسپرس میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ پنجاب کے وزیر تعلیم جناب موہن لال نے فرمایا ہے کہ ریاست کے تعلیمی اداروں میں اردو کو لازمی نہیں قرار دیا جائے گا۔ سرکاری لسانی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ لیکن مالیر کوٹلہ اور میوات کے علاقوں میں اردو کی حوصلہ افزائی ضرور کی جائے گی۔

## نخلستان

راجستھان ساہتیہ اکیڈمی نے مئی ۱۹۶۴ء سے ایک اردو کا ماہی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس رسالے کا نام "نخلستان" تجویز ہوا ہے اور ادارت کے فرائض جناب پریم شنکر سریواستو انجام دے رہے ہیں۔

## سرتاج

وادیٔ کشمیر سے بھی ایک علمی ادبی ماہنامہ "سرتاج" بہت جلد منظر عام پر آ رہا ہے۔ پتہ اس طرح ہے:-

تیشپ نواس۔ تحصیل روڈ۔ بارہ مولا۔ (کشمیر)

## پیکر

ماہنامہ پیکر مئی ۱۹۶۴ء کے وسط میں اپنا مختصر کہانی نمبر پیش کر رہا ہے۔ اس نمبر کی تیاری زور شور سے جاری ہے۔ یہ نمبر ۸۰ صفحات پر مشتمل ہوگا اور قیمت ۴۰ نئے پیسے ہوگی۔ تخلیقات اس پتے پر بھیجی جا سکتی ہیں۔

ماہنامہ پیکر۔ پوسٹ بکس ۲۳۳۔ حیدرآباد


# کتاب نما

| سالانہ چندہ ایک روپیہ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ | فی پرچہ دس نئے پیسے |
|---|---|---|

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر دہلی سے



افسردگی میں ڈوب سی جاتی ہے کائنات
تاباںؔ وہ حادثہ ہے کسی دیدہ ور کی موت

پیدائش ۱۴؍نومبر ۱۸۸۹ء　　　　وفات ۲۷؍مئی ۱۹۶۴ء

مجلسی ایڈیٹر
غلام ربانی تاباں

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۵ | جون ۱۹۶۴ء | شمارہ نمبر ۶

پنڈت جی نے "گیان سرو ور" کو ادھر اُدھر سے دیکھا، بعض مضامین پر نظر ڈالی۔ حامد علی خاں بتاتے رہے کہ کتاب تیار کرنے کا مقصد کیا تھا، اس کے مضامین کا انتخاب کیسے کیا گیا، وہ کیسے لکھوائے گئے۔ کتاب دیدہ زیب تھی۔ تصویریں اور چھپائی اچھی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ پنڈت جی کو پسند آئی ہے۔

"کتاب بیچ بھی لوگے؟"

"جی ہاں، کیوں نہیں۔"

"نہیں، تم لوگوں کو کتابیں بیچنا نہیں آتا۔ تم نے یہ معلوم کیا ہے کہ بھارتیہ ودیا بھون کی کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن کیوں نکل جاتے ہیں؟ کتاب بکتی نہیں ہے تو اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کتاب خود اس قابل نہ ہو کہ زیادہ لوگ پڑھیں، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے نام میں کوئی کشش نہ ہو، یا اس کے ٹائیٹل پیج کو دیکھ کر لوگ اسے خریدنے کی طرف مائل نہ ہوں۔ امریکہ میں ایک کتابوں کا ہسپتال ہے جہاں پبلشر ایسی کتابیں بھیجتے ہیں جن کے نہ بکنے کی وجہ معلوم کرنا ہوتا ہے۔ ہسپتال میں اس معاملے پر غور کیا جاتا ہے اور پھر پبلشر کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ کتاب کی بکری بڑھانے کی کیا تدبیریں کی جائیں......"

حامد علی خاں نے جوش میں آکر کہا، "پنڈت جی، آپ کو [illegible] کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھ مہینے میں نکل جائے گا۔"

یوں ہی کوئی پینتالیس منٹ تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ہم ایک الوداعی تبسم سے سرفراز ہو کر رخصت ہوئے۔

پنڈت جی سے جب کبھی جامعہ یا مکتبہ کے بارے میں گفتگو ہوتی تو یہ محسوس ہوتا کہ ہم جو کچھ انھیں بتانا چاہتے ہیں وہ انھیں پہلے سے معلوم ہے۔ گویا وہ ہمارے معاملات پر غور کرتے رہے ہیں اور ہماری درخواست سننے سے پہلے طے کر چکے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے اور کیوں۔ مکتبہ سے ان کا تعلق اس وقت سے شروع ہوا جب مکتبہ نے ان کی خواہش اور اشارے پر ان کی سوانح عمری کا ترجمہ کرنے کی ذمہ داری لی۔ مجھے فروخت کا حساب یاد نہیں، البتہ یہ یاد ہے کہ وہ فروخت کا حساب اصرار کر کے منگواتے اور جب مل جاتا تو رائلٹی کی رقم جامعہ کو ہدیہ کے طور پر عنایت کر دیتے تھے۔ شاید اسی زمانہ سے ان کو یقین ہو گیا کہ اچھی عام فہم قومی زبان صرف جامعہ میں لکھی اور بولی جاتی ہے اور جب کبھی ان کی اپنی تقریر یا ایڈریس کے ترجمے کا سوال ان کے سامنے اٹھایا گیا تو انھوں نے اس کام کو جامعہ والوں کے سپرد کرنا تجویز کیا۔ ان کے ۱۹۳۰ء کے اعلان آزادی کا اور ان کے کانگریس کے صدارتی خطبوں میں سے ایک کا ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے کیا۔ ایک کا ضیاء الحسن فاروقی صاحب اور میں نے مل کر۔ پنڈت جی کو اصرار تھا کہ جامعہ کے تیار کیے ہوئے ترجمے کو ہندی کا انوواد بھی سمجھا جائے، یعنی ایک ترجمہ دونوں رسم خط میں شائع ہو، مگر غالباً اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔

ہر کام کے کرنے والے کو قدرداں کی تلاش رہتی ہے اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی قوم پر جو احسانات کیے ان میں سے ایک نمایاں احسان یہ ہے کہ انھوں نے اپنی قدرشناسی کی بدولت ہزاروں لاکھوں کی ہمت بڑھائی اور ملک میں اس یقین کو عام کر دیا کہ اس کا جوہر شناس رہنما ہر کمال کی پوری اور سچی قدر کر سکتا ہے۔ اس سے کیا کیا شوق اور ولولے پیدا ہوئے یہ ان گمنام یا غیر معروف لوگوں سے پوچھیے جن کے حوصلوں کو جواہر لال کے حیات آفریں تبسم نے نئی نئی زندگی عطا کی۔

چرنی کوواسونیا

# مستقبل کے صیغے

(روسی اسکالر محترمہ چرنی کوواسونیا نے تاشقند یونی ورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کیا ہے اور اب ہندوستان میں اُردو گرامر پر پی۔ایچ۔ڈی کے لیے ریسرچ کر رہی ہیں۔ ہمیں اُمید ہے قارئین کتاب نما روسی طالبہ کا یہ تحقیقی مضمون جو اُنھوں نے بطورِ خاص کتاب نما کے لیے دیا ہے، پسند فرمائیں گے اور ان کی زبان اور ان کے اندازِ بیان کو سراہیں گے۔ ایڈیٹر)

زمانۂ مستقبل میں افعال کے وہ صیغے آتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ کام بولنے کے وقت کے بعد ہوگا۔ کام بولنے کے وقت سے کچھ دیر بعد بھی ہو سکتا ہے اور بہت دیر بعد بھی۔ لیکن خود صیغہ کے ذریعے اس بات کا اظہار نہیں ہوتا کہ کام بولنے کے وقت سے کتنی دیر بعد ہوگا۔

اردو اور ہندی میں مستقبل کے اظہار کے لیے صیغے ہیں۔ ان میں سے ۶ صیغے ایسے ہیں جو ساخت اور معنویت دونوں اعتبار سے مستقبل کے صیغے کہے جا سکتے ہیں:۔

۱۔ مستقبل مطلق (کرے گا)

۲۔ ترقی پذیر صورت (کرتا جائے گا)

۳۔ وقفہ پذیر صورت (کیا کرے گا)

۴۔ طویل صورت (کرتا رہے گا)

اتنے صیغوں کے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مستقبل مطلق کو چھوڑ کر سب میں زمانے کے علاوہ کچھ مخصوص مفہوم بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ مفہوم صیغے سے کیے ہوئے کام کی "صورت" متعین کرتے ہیں۔

ترقی پذیر صورت، وقفہ پذیر صورت اور طویل صورت کے صیغے زمانۂ مستقبل کے ساتھ ساتھ کام کے جاری رہنے کے طریقے دکھاتے ہیں مثلاً ترقی پذیر صورت یہ ظاہر کرتی ہے کہ

کام کے وقوع میں زیادتی ہوتی جائے گی۔ وقفہ پذیر صورت کی خصوصیت یہ ہے کہ کام وقفے کے ساتھ ہوتا ہے۔ طویل صورت کام کو تسلسل کے ساتھ ہوتے ہوئے دکھاتی ہے۔

خاص مستقبل کے صیغوں کے علاوہ تین دوسرے صیغے بھی مستقبل کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں یعنی اگرچہ ساخت کے لحاظ سے وہ مستقبل کا صیغہ نہیں ہوتے لیکن محلِ استعمال سے وہ مستقبل کے معنی دیتے ہیں۔ اس خصوصیت کے ساتھ یہ تین صیغے استعمال ہوتے ہیں: ماضی تمام، حال مطلق اور حال کی استمراری صورت۔ ان صیغوں کے استعمال سے بولنے والا تخیل میں اپنے آپ کو گویا مستقبل میں لے جاتا ہے۔ ہونے والا کام عمل میں آگیا یا آتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ کام ایسا دکھایا جاتا ہے گویا یہ عمل میں آگیا یا اسی وقت ہو رہا اس طرح کام کا مستقبل قریب میں یقینی طور پر یا عجلت کے ساتھ ہونا ظاہر کیا جاتا ہے۔

## مستقبل مطلق کا صیغہ

صیغے کی ساخت :۔

مستقبل مطلق اس طرح بنتا ہے کہ مادۂ فعل کے آخر میں مندرجہ ذیل شخصی علامتیں بڑھائی جاتی ہیں۔ جیسے :۔

| | واحد<br>مذکر (مونث) | جمع<br>مذکر (مونث) |
|---|---|---|
| متکلم | و (وَ) نگا (نگی) | (یَں) ینگے (ینگی) |
| مخاطب | (یَ ـ) یگا (یگی) | (وَ ـ) وگے (وگی) |
| غائب | (یَ ـ) یگا (یگی) | (یَ ـ) ینگے (ینگی) |

افعال "لینا" اور "دینا" اس قاعدے کے تحت نہیں آتے۔ یہاں شخصی علامت مادۂ فعل کے آخر میں نہیں بلکہ آخر کی "ـے" حذف کرکے پہلے حرف صحیح کے بعد بڑھائی جاتی ہے۔ جیسے لونگا، لیگا، لوگے، لینگے۔

اگر مادۂ فعل کے آخر میں حروف علت "ا"، "و" ہوں تو ان کے اور شخصی علامت کے درمیان "ء" کی آواز بڑھائی جاتی ہے۔ جیسے: جاؤنگا، جاؤگے، جائینگے۔

مستقبل مطلق کا صیغہ آئندہ زمانے میں ہونے والے کام کی ایسی نوعیت کو بتاتا ہے کہ

جس میں کوئی تخصیص نہ پائی جائے بلکہ صرف اتنا معلوم ہو کہ کام آئندہ زمانے میں ہوگا۔
مستقبل مطلق کا صیغہ نحوی طور پر مختلف معنی میں استعمال ہو سکتا ہے جس کی
تفصیل مندرجہ ذیل ہے

۱۔ آئندہ زمانے میں صرف ایک بار ہونے والے کام کو دکھانے کے لیے، جیسے :۔
...... اگر آپ نہ دیں گے تو وہ مجھ سے خفا ہوں گے ......
(سرشار : سیر کہسار، جلد دوم، ۳۰۶)
تم سے نہ کھنچے گا، تم جا کر کھاٹ پر بیٹھو ...... (پریم چند، گئودان، ۱۳۶)
...... اس کا نتیجہ تم عنقریب دیکھ لوگی۔ (راشد الخیری، نئی دلہن، ۹۳)
کام کے ایک بار ہونے کا مقصد محض یہ نہیں کہ کام ایک لمحے میں ختم ہو گیا بلکہ اس کا
تسلسل کسی بڑے عرصہ پر بھی پھیلا ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ کام ایک اکائی کے طور
پر پیش کیا جاتا ہے۔ جیسے :
" اور اس گھڑی کو دلی خوشی سے بلا رہا ہوں جب میں جہاز پر سوار ہوں گا اور ہماری
فوج کے لوگ بڑی خوشی سے نعرے بلند کریں گے " (سرشار، کامنی، ۲۴۹)
" مگر مینہ کہتا تھا کہ میں برسوں گا تو آج ہی برسونگا "
(سرشار، سیر کہسار، جلد دوم، ۸۲)
"...... تم میرے ساتھ گھر چلو وہاں اطمینان سے بیٹھ کے تمہاری سرگزشت
سنوں گا " (شرر، قیس و لبنیٰ، ۷۴)

۲۔ ایسے کام کو ظاہر کرنے کے لیے جو آئندہ زمانے میں بار بار ہوتا رہے۔ اس صورت
میں جملے میں ایسے مناسب الفاظ کی موجودگی ضروری ہوگی جو کام کا بار بار یا ہمیشہ ہونا ظاہر
کریں۔ جیسے :
" چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کرے گی "
(ابوالکلام آزاد : غبار خاطر، ۹۳)
"...... تم جو کہو ہم اب ہر نوچندی کو آئیں گے ......" (سرشار : کامنی، ۲۳۸)
"...... میرے لیے سب سے بڑی تسلی و آرام کی بات یہ ہوگی کہ روز شام کو تم
سے ملوں گا ......" (شرر، قیس و لبنیٰ، ۱۱۳)

"...... ہفتہ وار لکھوں گا" (پریم چند: سہاگ کا جنازہ ، ۲۷۱ )

۳۔ اس کام کے اظہار کے لیے جو کسی (معین یا غیر معین) عرصے میں محدود ہو کر ہوتا ہو۔ جملے میں مناسب الفاظ کی مدد سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ جیسے :۔

"کئی دن گردن دکھے گی مالک" (پریم چند، گئو دان ، ۱۶۰ )

"...... اسی کے کارن تو آج وہ بہو گی کی مصیبتیں جھیل رہی ہے ۔ اور ساری عمر جھیلے گی ......" (پریم چند: انتقام، ۱۴۷)

اس عرصے کے اندر ہونے والے کام کی اندرونی کیفیت مستقبل مطلق کے صیغے سے ظاہر نہیں ہوتی ۔ اس کے لیے جملے میں یا تو مناسب الفاظ ( دن بہ دن، برابر، اکثر) ہوتے ہیں یا ترقی پذیر، وقفہ پذیر یا طویل صورت کے صیغے استعمال ہوتے ہیں ۔

عبارت کے سیاق وسباق سے بھی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہونے والا کام کسی بہت بڑے عرصے پر پھیلا ہوا ہو گا۔ مگر یہاں بھی سننے والوں سے کام کی اندرونی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ جیسے :۔

"بیگم میں کہتی ہوں اور سچ کہتی ہوں کہ اگر ساس کی اطاعت میں غفلت نہ کی تو سسرال میں بیٹھی حکومت کرو گی " (راشد الخیری، صبح زندگی ، ۱۷۵ )

"میں نے بچوں کی پرورش سے زیادہ تمہاری آسائش کو مقدم سمجھا آئندہ اور زیادہ احتیاط کروں گی ......" (راشد الخیری، نئی دلہن ، ۹۳)

"ہائے وہ زمین جسے ہم نے بیس برس جوتا جسے کھاد سے پاٹا ۔ جس کی مینڈیں بنائیں ۔ ان کا مزا اب دوسرا اٹھائے گا" (پریم چند: قربانی ، ۲۳۱ )

۴۔ ایسے کام کے اظہار کے لیے جو عمل میں آتے آتے کسی کی عادت کا جزو بن جائے یا اس کے معمول کو ظاہر کرے ۔ جیسے :۔

"مرزا۔ بعض حضرات کا یہ قاعدہ ہے کہ جب ذکر کریں گے اپنے باپ کو ہمایوں بادشاہ کا وزیر ہی بتائیں گے شاہجہاں سے شجرہ ملائیں گے " (سرشار: سیر کہسار، جلد اول ۶۸)

"وہ تو کہتی ہے کہ جو ایک دفعہ پہاڑ جائے گا پھر ہر سال جانے کی خواہش کرے گا ایسی جگہ پہاڑ ہے " (سرشار: سیر کہسار، جلد دوم ، ۸۷ )

## مستقبل کی ترقی پذیر صورت کا صیغہ :

مستقبل کی ترقی پذیر صورت کا صیغہ اصل فعل کے حالیہ ناتمام اور فعل "جانا" کے مستقبل

مطلق سے بنتا ہے۔ جیسے کرتا جائے گا۔

مستقبل کی ترقی پذیر صورت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کام کے وقوع میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ہونے والے کام کا عرصہ کم وقت کا بھی ہو سکتا ہے اور بہت وقت پر بھی پھیل سکتا ہے۔ جیسے

" اور جیسے جیسے پورے چاند کی رات ڈھلتی جائے گی ۔ ان دونوں کی لازوال محبت جوان ہوتی جائے گی" (عباس: کہتے ہیں جس کو عشق ، ۱۵)

" آغا ۔ تمہیں بس اسی طرح نینی تال تک چڑھائی ملتی جائے گی۔ . . "

(سرشار: سیر کہسار، جلد دوم ۴۴۰)

" مرزا۔ یا الٰہی کچھ ہو گے بھی کہ بکتے ہی جاؤ گے " (سرشار: سیر کہسار، جلد اول، ۴۷)

"۔۔۔۔۔۔ رفتہ رفتہ سمندر کا وہ ٹکڑا جو ان دونوں براعظم کے درمیان میں حائل ہے چوڑا ہوتا جائے گا۔۔۔۔۔" (سرشار: فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۸۶)

کسی خاص حالت کے تابع ہو کر کام میں عمومیت کا احساس پیدا ہو سکتا ہے۔ جیسے

" کوئی کتنا ہی کیوں نہ کہے۔ وہ اپنی ہی رٹ لگاتے جائیں گے کسی کی سنیں گے نہیں"

(پریم چند: منتر، ۲۰)

باتیں کرے گی تو لفظ ایک دوسرے پر چڑھتے جائیں گے۔" (ننھو: عصمت چغتائی، ۱۶)

## مستقبل کی وقفہ پذیر صورت کا صیغہ

مستقبل کی وقفہ پذیر صورت کا صیغہ، حالیہ فعل کے حالیہ تمام اور فعل "کر" کے مستقبل مطلق کو ملا کر بنایا جاتا ہے۔ جیسے کیا کرے گا۔

مستقبل کی وقفہ پذیر صورت یہ ظاہر کرتی ہے کہ کام وقفے کے ساتھ ہوتا رہے گا۔ جیسے

"۔۔۔۔۔ دو گھڑی بات چیت کر لیا کریں گے ۔۔۔۔۔" (سرشار: فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۱۷۶)

" قمرن ۔ اچھا ۔ نہ چلیں ۔ اس میں اصرار کیوں کرتی ہو یہیں بیٹھے مکھیاں مارا کریں گے۔۔۔۔۔" (سرشار: سیر کہسار، جلد دوم، ۲۱۵)

" محمودہ ۔ بہت خوب میں آپ کو کوٹھے پر سے جا کر اس طرح چپکے سے پڑھا دیا کروں گی کہ کسی کو خبر بھی نہ ہو۔" (نذیر احمد۔ بنات النعش ، ۴۷)

کام کی کثرت یا کمی دکھانے کے لیے جملے میں مناسب الفاظ موجود ہو سکتے ہیں جیسے

"۔۔۔۔ یہ کبھی یہاں آیا کریں گے مگر جو آپ کا ہرج نہ ہو" (سرشار: کامنی، ۹۴۰)

"۔۔۔۔ ہم لوگ اکثر کیا معنی روز آیا کریں گے۔۔۔۔" (سرشار: کامنی، ۴۴۸)

"۔۔۔۔ اور دونوں نے متفق ہو کر کہا تھا کہ ہر مہینے میں نوچندی جمعرات کا میلا دیکھا کریں گے۔" (سرشار: کامنی، ۴۲۵)

## مستقبل کی طویل صورت کا صیغہ

مستقبل کی صورت کا صیغہ اصل فعل کے حالیہ ناتمام اور فعل "رہنا" کے مستقبل مطلق کا مرکب ہے۔ جیسے کرتا رہے گا۔

مستقبل کی طویل صورت یہ دکھاتی ہے کہ کام آئندہ زمانے میں تسلسل کے ساتھ ہوتا رہے گا جیسے

"آتا کیوں نہیں گو برا کیا کام ہی کرتا رہے گا؟ ۔۔۔" (پریم چند: گئو دان، ۴۴)

"۔۔۔۔ اور میں تو جب تک جیوں گا۔ تمھارے گن گاتا رہوں گا۔" (پریم چند: بیٹی کا دھن، ۱۲۶)

"۔۔۔۔ پر قاتل کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کرشنا کی موت سے اس کا کوئی بھلا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا بھیانک جرم بھوت بن کر اس کے من میں ہمیشہ منڈلاتا رہے گا۔۔۔۔" (عباس: دیا جلے ساری رات، ۳۷)

"۔۔۔۔ تم ایسے گاہک ہو جو عورت حاصل کرنے کے لیے ساری عمر سرمایہ جمع کرتے رہو گے مگر اسے ناکافی سمجھو گے۔۔۔۔" (منٹو عصمت چغتائی، ۱۰)

## ماضی تمام کا صیغہ

ماضی تمام کا صیغہ بعض صورتوں میں مستقبل کے معنی دیتا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل استعمال ہیں:

۱۔ قریب ترین مستقبل کے معنی میں

جب مستقبل کے معنی ظاہر کرنے کے لیے ماضی تمام کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ تو کام کے جلدی عمل میں آنے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ کام جو آنے والے زمانے میں ہوگا اس کو ایسا دکھایا جاتا ہے کہ گویا وہ عمل میں آچکا۔ اس سے کام کے ہونے کی یقین دہانی ظاہر ہوتی ہے جیسے:

"پہلے تو بات نہیں کی جاتی تھی مجھتی کفتی کر بیں اب مری اور اب مری۔ اب

دم نکلا اور اب دم نکلا.....“ (سرشار: سیر کہسار، جلد دوم، ۶۹۰)
دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ آج ہڈی پسلی ٹوٹی۔ یہ تو کچا ہی کھا جائے گا۔“
(سرشار: فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۲۸۳)
کہنے اور کام کرنے کے درمیان اکثر کم وقفہ دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے:
”میں ابھی آئی ـــــ زرا لکشمی بائی سے تھوڑے سے پاپڑ لے آؤں“۔
(عصمت چغتائی: معصومہ، ۲۸)
”ابھی چلی“ یہ کہہ کے اس نے کنگھی کر کے کپڑے بدلے“ (شرر: قیس ولبنیٰ، ۱۵۶)
”.....اچھا میں چلی، خالدہ نے چادر اوڑھتے ہوئے کہا۔“
(صالحہ عابد حسین: راہ عمل، ۴۶۶)
”اگر اپنے باپ کا ہے تو ٹھہر جا میں آیا۔“ (سرشار: کامنی، ۳۹۴)
”میں تو یہ کہہ رہا ہوں ساجو رانی کہ آج زرا سی چائے تو پلا دو۔“
”اچھا اچھا۔ ابھی لائی۔“ (صالحہ عابد حسین: راہ عمل، ۲۷۱-۲۷۰)
۲۔ کسی تصور کی نفی کرنے کے لیے۔ کہنے والے کام کے کبھی عمل میں نہ آنے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ جیسے:
”ہم اسے اپنے گھر میں رکھ لیں گے۔“
”جی ہاں بہت رکھا اپنے گھر میں، خالہ اماں گولی مار دیں گی۔“
(عصمت چغتائی: تین اناڑی، ۴۹)
”بھلا مہاجن یوں کیوں دینے لگا۔“ (مرزا رسوا: امراؤ جان ادا، ۷۷)
”واہ میں اس نیک کام میں کیوں خلل ڈالنے لگی، میں اسی ہفتہ میں آپ کے کپڑے دے دوں گی.....“ (پریم چند: سہاگ کا جنازہ، ۲۷۹)
۳۔ مفرد اور مرکب جملوں میں جہاں ایک دوسرے سے لازمی تعلق رکھنے والے دو فعل استعمال ہوتے ہیں
ایک کام کا عمل میں آنا دوسرے کام کے عمل میں آنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ ایسے جملوں میں ”جیسے ہی“، ”جس وقت“ کی قسم کے لفظ استعمال ہوتے ہیں جیسے
”اب تو ان کی لاج اسی طرح بچ گئی کہ اس لونڈے کی خوشامد کرتے ہیں۔ وہ

زرا بھی خلل انداز ہوئے اور عزت خاک میں مل گئی۔" (پریم چند، گئودان، ۵۲۴)
"اوہ نوابھی عرصہ ہے۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا اور چلا۔"
(سرشار: فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۱۲)
"..... اور یہ تو مجھ کو پورا پورا یقین ہے کہ ادھر مجمع دیکھا اور ادھر ریجھ گئی۔"
(سرشار: کامنی، ۳۲۹)
"..... جس دن یہ کنجی ہاتھ آگئی بس فتح ہے۔" (پریم چند، گئودان، ۱۴۵)

۴۔ زیادہ تر شرطیہ جملوں میں

ایسے شرطیہ جملوں میں شرطیہ فقرے میں ماضی تمام اور جزا میں مستقبل مطلق کا فعل ہوتا ہے۔ اس سے یہ دکھایا جاتا ہے کہ ایک کام کے عمل میں آنے کے فوراً بعد دوسرے کام کے عمل میں آنے کا امکان یا خدشہ ہوتا ہے جیسے:

"..... اگر اس کو راضی نہ کیا تو برباد ہو جائے گی......."
(راشد الخیری، صبح زندگی، ۳۵)
"اگر کوٹھی بک گئی تو برا ہوگا۔" (عصمت چغتائی: تین اناڑی، ۴۷)
"آپا جی، خدا گواہ ہے میری جان سن سے نکل جائے گی۔ جو آپ پہلو سے چلی گئیں۔" (سرشار، سیر کہسار، جلد دوم، ۵۰۳)

اس قسم کے بہت سے جملوں میں دھمکی آمیز احساس شامل ہوتا ہے۔ جیسے:

"دھنیا نے سب کو سنا سنا کر کہہ دیا کہ کسی نے اسے پانی بھرنے سے روکا تو اس کا اور اپنا خون ایک کر دوں گی۔" گئودان، ۲۰۲)
"اب جب سے میرے دیور نے للکارا کہ خبردار یہاں آئی دہلیز کے اندر قدم رکھا تو ٹانگیں کاٹ ڈالوں گا تب سے نہیں آئی۔" (سرشار: کامنی، ۲۸۲)
ایک لفظ بھی اگر تمہاری زبان سے اب نکلا تو میں اٹھ کے چلا جاؤں گا بس۔"
(سرشار: سیر کہسار، جلد دوم، ۶۹۳)

## حال مطلق کا صیغہ

مستقبل کے معنی میں حال مطلق کا صیغہ استعمال کرنے سے یہ احساس پیدا کرنے پر زور دیا جاتا ہے کہ مستقبل اور حال کا درمیانی وقفہ کم سے کم یا کالعدم ہے اور

وہ کام جو دراصل شروع بھی نہیں ہوا، ہوتا دکھایا جاتا ہے۔ اس سے فاعل کے کام کرنے کے ارادے کی پختگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور کام کا عمل میں آنا یقینی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس استعمال میں یہ بات بھی محسوس کی جا سکتی ہے کہ کام کرنے میں فاعل کی اپنی مرضی کو بھی دخل ہے۔ جیسے:

"... اگر آپ سب کو ہم سے واقعی نفرت ہے تو ہم رخصت ہوتے ہیں۔ ..."

(سرشار: سیر کہسار، جلد دوم، ۲۱۵)

"... دیکھ اب تجھے تیری گستاخی کی سزا دیتا ہوں" یہ کہتے ہی کہتے نواب صاحب نے دولائی کے اندر سے ہاتھ نکالا۔" (مرزا رسوا: امراؤ جان ادا، ۶۸)

"لڑکا قریب آیا تو پوچھا کہ ان سے دو چوٹیں ہوتی ہیں"

(سرشار: فسانۂ آزاد، جلد اول، ۱۱۶)

"سلطان نے کہا مجھ کو آج تک اطلاع نہیں ہوئی دیکھو میں ابھی آدمی بھیجتی ہوں"

(نذیر احمد: بنات النعش، ۵)

"بھئی اگر بتا دو تو پچاس روپیہ دیتا ہوں"۔۔۔۔۔

(سرشار: سیر کہسار، جلد دوم، ۴۳۳)

حال مطلق کے صیغے سے ظاہر کیے ہوئے کام سے یہ بھی معلوم ہے کہ کہنے والے کو (چاہے وہ خود متکلم ہی نہ ہو) کام کے ہونے یا نہ ہونے کی پوری امید ہے۔ جیسے:

"اچھا حضور عرض میں کچھ سوال و جواب ہوں۔ دیکھیے ان سب کا قافیہ تنگ کر دیتا ہوں یا نہیں"۔ (سرشار، فسانۂ آزاد جلد اول، ۱۰۵)

"... دیکھوں تو سہی کون روکتا ہے" (راشد الخیری، صبح زندگی، ۱۶)

اسٹیشن پر کوئی کام بتا دیجیے۔ دیکھیے کون حسن لیاقت سے انجام دیتا ہے"

(سرشار، فسانۂ آزاد، جلد اول، ۱۰۵)

تو میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔ دیکھوں گا کہ تمھارے بال بچے کیسے خوش ہوتے ہیں؟" (پریم چند: گئودان، ۱۵۶)

"میں خود اس رائے سے متفق نہیں ہوں، مگر ابا جان اور اماں جان دونوں اس پر اڑے ہیں کہ خاندان میرے بعد ختم ہوتا ہے" (راشد الخیری: نئی دلہن، ۹۴)

حال مطلق کا صیغہ شرطیہ جملوں میں اکثر شرط کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

یہ استعمال ماضی تمام کے صیغے سے اس طرح پر مختلف ہوتا ہے کہ آخرالذکر کے استعمال سے شرط کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے۔ جزا کے عمل آنے میں صرف شرط کے پورا ہونے کی کسر باقی رہتی ہے۔

ماضی کے تمام مستقبل کے معنی میں استعمال سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شرط پوری ہونے کے فوراً بعد ہی جزا کا عمل میں آنا ضروری ہے۔ حال مطلق کے استعمال میں بھی اگرچہ شرط کے بعد جزا عمل میں آتی ہے مگر اس میں جلد یا دیر کا مفہوم شامل نہیں ہوتا۔ جیسے:

"اب دل میں یہ سوچا کہ اگر کسی کو خبر کرتا ہوں تو جھگڑوں میں پھنس جاؤں گا۔"
(مرزا رسوا، امراؤ جان ادا، ۸۳)

"... آج گھر میں آتے ہیں تو پوچھتی ہوں ....." (پریم چند، قزاقی، ۲۴۵)

"..... اگر انکار کرتے ہیں تو سنہرا موقع ہاتھ سے جاتا ہے ...."
(پریم چند، گئودان، ۱۶۱)

"لیکن خوب جانتی تھی کہ اگر اس وقت اس کو چمکارتی ہوں تو یہ ناز برداری میرے واسطے نہیں اسی کے واسطے اندھیر ہو گی۔" (راشد الخیری، صبح زندگی، ۴۵)

## حال کی استمراری صورت کا صیغہ

ماضی تمام اور حال مطلق کے صیغے کی بہ نسبت اس صیغے سے ظاہر کیا ہوا کام کچھ دور کے مستقبل میں عمل میں آئے گا۔ کام کا عمل میں آنا طے کیا ہوا یا الیقین کی حدوں کو چھوتا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ جیسے

".... سلیم کی دلہن رات کو ہرات جا رہی ہیں۔ ان سے ملنے گئی تھی ..."
(راشد الخیری، صبح زندگی، ۵۲)

"میں بھی کیوں نہ تار دے دوں کہ بس ایک مہینے کے لیے میکے جا رہی ہوں۔"
(پریم چند، انتقام، ۱۳۸)

اول تو سارے ہی دنوں میں ان کی یہ عادت ہمیشہ ہی رہی ہے اور پھر آج کل تو سر پر برسات آ رہی ہے　　(راشد الخیری، صبح زندگی، ۱۳۵)

"میرا دل دیکھ نسیمہ جیسی بیٹی جس کو کبھی دم بھر کے واسطے آنکھ سے اوجھل نہ کیا آج مجھ کو روتا چھوڑ اپنا گھر الگ بسا رہی ہے۔" (راشد الخیری، صبح زندگی، ۱۰۵)

"میں اس کو سنگدلی نہیں سمجھتا میں خود دوسرا نکاح کر رہا ہوں۔ اتنا کہہ کر اصغر باہر گیا۔" (راشد الخیری، محی دلہن، ۹۵)

## مختصر نتائج

مستقبل مطلق کا صیغہ وہ کام ظاہر کرتا ہے جو ایک بار ہو یا بار بار ہو یا کسی محدود عرصے کے اندر برابر ہوتا ہو مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کام کیسے ہو رہا ہے۔

مستقبل کی ترقی پذیر، وقفہ پذیر اور طویل صورت کے صیغوں میں کام کا جاری رہنا پایا جاتا ہے۔ ترقی پذیر اور طویل صورت کے صیغوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ کام کا تسلسل ہمیشہ غیر منقطع ہو بلکہ کام کسی چھوٹے یا بڑے عرصے پر پھیلا ہو کر اکائی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس سے تسلسل کا اظہار ہوتا ہے۔ جملے میں "دن بہ دن" "برابر" وغیرہ مناسب تمیزی الفاظ موجود ہو سکتے ہیں جن سے کام کا طور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

ماضی تمام، حال مطلق اور حال کی استمراری صورت کے صیغوں میں فرق ڈھونڈنا چاہیں تو سب سے پہلے یہ بتانا پڑے گا کہ ان تینوں میں زمانہ کا فرق ہے۔ ماضی تمام کے صیغے میں کام کے جلدی ہو جانے کا جو احساس ہے اتنا حال کے استمراری صورت کے صیغے میں نہیں ہے

ماضی تمام اور حال مطلق کے صیغے زمانے کے لحاظ سے ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔ پہلے سے کام کے جلدی ہو جانے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ دوسرے میں فاعل کی یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ کام کرے۔ یہ دو معنی بہت قریب ہیں۔ جیسے :

"انھوں نے کہا میں باہر سے ابھی آتا ہوں۔ یہ باہر گئے، دوستوں سے کہا ارے یار ابھی ایک گھنٹہ ہے میں ابھی آیا۔" (سرشار، کامنی، ۲۴۳)

---

ایک لٹ ٹرے پر بے پروائی سے لہرا رہی تھی اور اس سے یاسمین کے سینٹ کی ہلکی ہلکی سی شمیم یوں آ رہی تھی جیسے پھولوں کے کنج سے ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم کے جھونکے چھن رہے ہوں۔

بی۔اے۔او۔سی کا ایک طیارہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنے چاروں انجنوں کی طاقت سے پوری رفتار پر پرواز کر رہا تھا۔ راوی گزر چکی تھی ........ (بشکریہ "ادب لطیف" لاہور)

خلیل الرحمن اعظمی

# شہر آشوب

جناب اعظمی کیوں آپ ہیں اُداس وملول ہُوا ہے خانۂ دل میں یہ کس بلا کا نزول
ہیں بال بال پریشاں، اَٹی ہوئی ہے دھول کسی سے بات بھی کرتے ہیں اب تو اُوٹ پٹانگ
کہاں گیا وہ توازن، وہ ضبطِ غم کے اصول

عزیز من! ابھی کچھ بھی نہیں ہوا ہے مگر خدا نے دی ہیں جو آنکھیں یہ میرے چہرے پر
سمجھ میں اب نہیں آتا کھلی رکھوں کیونکر مجھے عجیب سا لگتا ہے آج ہر منظر
بدل گئے ہیں زمین و زماں کے سب معمول

ہے چہل پہل بہت، شہر خوب ہیں آباد مگر کہیں نہیں ملتی ہے روحِ آدم زاد
جسے قریب سے دیکھو وہی ہے گرگ نژاد چمن کو آج نہیں کوئی خطرۂ صیاد
کہ ہیں بکھرے ہوئے زاغ و زغن، چغد، چنڈول

ذلیل و خوار وہی ہیں جو اب ہیں اہلِ کمال ہیں فاقہ مست جناب ڈھونڈتے ہیں اکل حلال
نہیں شریفوں کو ملتی ہے آج روٹی دال مگر رذیلوں کی جھولی میں ہے ہر اک تر مال
اُنھیں پہ فضلِ خدا ہے کہ جو ہیں سخت فضول

اُسی کی آؤ بھگت جس کو آئے دلّالی جو کھودتا ہو جڑیں سب کی ہے وہی مالی
اُسی کا نام مسیحا، کرے جو پامالی اُسی کو عدل کا دعویٰ جو عدل سے خالی
اُسی کی عقل کا چرچا کہ جو ہے نامعقول

بغل میں جس کی ہو اب رذیلوں کا پشتارہ اُسی کے علم کا بجتا ہے خوب نقارہ
وہی ہے صاحبِ فن جو ہے فن کا ہرکارہ وہ جس کا نام بکے ہے اُسی کا چوبارہ
جو منبروں پہ کھڑا ہو وہی ہے آج رسول

جو اپنی ذات سے اک مرکزِ جہالت ہو جو کوڑھ مغز ہو جو تودۂ حماقت ہو

وہ جن کی منصبِ اعلیٰ کے بل پہ شہرت ہو — اُسی کو پیش ہر اک کُرسی صدارت ہو
اُسی کے سر پہ نچھاور ہوں ساری قوم کے پھول

وہ درس گاہوں میں تعلیم پر ہیں اب مامور — کہ جن میں علم، نہ دانش، نہ زندگی کا شعور
کسی کے رُخ پہ خباثت، کسی کے سر میں فتور — ملے جو موقع تو بن بیٹھیں نادر و تیمور !!
یہ دے کے ڈگریاں کرتے ہیں اُن کے دام وصول

وہ جن کے نام کے آگے لگا ہے پروفیسر — کوئی غلام چرٹی کا تو ہے کوئی جوکر
کسی کا چہرہ ہونق، کسی کا دل پتھر — اکڑتے پھرتے ہیں یوں جیسے جنگی کے افسر
یہ جمع کرتے ہیں بازارِ علم کے محصول !

عجب طرح کے ہیں اب نونہالوں کے اطوار — نہ اُن میں ذوقِ نمو، نہ صلابتِ اظہار
یہ وضع قطع سے لگتے ہیں فلم کے کردار — بس ایک فکر کہ ہم بن سکیں دلیپ کمار
یہ ہیرو اپنی اداؤں کے آپ ہیں مقتول

نہ ان میں میر، نہ غالب نہ کوئی تلسی داس — نہ جستجوئے ہنر ہے نہ کوئی علم کی پیاس
وہ کہتے ہیں کہ ہے یہ شعر و فلسفہ بکواس — ہمارے جسم پہ سجتا ہے صرف چست لباس
مکالماتِ فلاطوں کو پڑھ کے کیا ہے حصول

جو دیویاں تھیں وہ کرتی ہیں اب نئے فیشن — کوئی ہے زلف بریدہ تو کوئی کُھلی بن
بتائے کون کنواری ہیں یا کہ یہ دُلھن — نہ ان کی مانگ میں سیندور نہ ہاتھ میں کنگن
نہ ان کی آنکھ میں تنکا، نہ ان کے کان میں پھول

مشاعروں میں غزلخواں ہیں شاعرانِ کرام — سُنا رہے ہیں بڑے تال سُر سے اپنے کلام
جو کامیاب گویّے ہیں ان کے اونچے دام — بدل سمجھتا ہے مجرے کا اس کو مجمع عام
غزل ہو پست تو کچھ اور ہوتی ہے مقبول

پڑھے لکھوں میں نئی شاعری کا چرچا ہے — ہر ایک مجتہدِ عصر بن کے بیٹھا ہے
مگر رسالوں میں ایسا کلام چھپتا ہے — کہ جس کا کوئی نہ اُلٹا ہے اور نہ سیدھا ہے
ہے ناقدوں کی سزا یہ بٹھائیں اس کی چول

یہاں ادیب تو کم ہیں مگر بہت نقّاد — کہ جن کا علم بہت سرسری و نام و نہاد
کوئی کلرک، کوئی مدرسے کا ہے اُستاد — رٹی رٹائی سی کچھ اصطلاحیں ان کو یاد

کہ جن کو اپنے مضامین میں کرتے ہیں منقول

ہے ناشروں کو شکایت ادب نہیں بکتا ۔۔۔ یہ سوچتے ہیں کریں کاروبار کوئلے کا !
وہی کتابیں جو ہیں محش مبتذل، گھٹیا ۔۔۔ بس ان کو چھاپ کے ہوتا نہیں گھاٹا
کہ آج خلقِ خدا کرتی ہے انھیں قبول

بڑے فروغ پہ ہے آج فلم کا بیوپار ۔۔۔ تجوریاں لیے بیٹھے ہیں سیٹھ، ساہوکار
وہی گھسے ہوئے قصے، وہی پٹے کردار ۔۔۔ وہی سڑی ہوئی رومانیت کہ حسن کے شکار
تمام کوچہ و بازار، کالج و اسکول

منگائی جاتی ہیں جاسوسی ناولیں گھر گھر ۔۔۔ عجیب نشہ سا ہوتا ہے جن کو پڑھ پڑھ کر
کمی سی رہتی ہے ملتا نہیں جو فلم فیئر ۔۔۔ ریلیز کیوں کر نہ ہوئی بن رہی ہے جو پکچر
پہن کے نکلیں گے جس میں گدھے سنہری جھول

ہمارے مورث و اجداد پیٹتے تھے جو لکیر ۔۔۔ اسی لیے تو بنے رہ گئے حقیر فقیر
مگر یہ ہم کہ ہیں روشن خیال و باتدبیر ۔۔۔ رہیں گے توڑ کے رسم و رواج کی زنجیر
رہے گا اب نہ کوئی فرقِ فاعل و مفعول

اب اس کے آگے کہوں گا تو ہوں گے سب برہم ۔۔۔ اگرچہ اس میں نہیں جھوٹ کچھ خدا کی قسم
بدل گئے وہ زمانے، بدل گیا موسم ۔۔۔ گئے دنوں کا کہاں تک کریں گے ہم ماتم
اسی میں خیر ہے اب اور دیں سخن کو نہ طول

(بشکریہ "دورِ حیات" بمبئی)

---

## ادبی خبریں

اُردو ٹیلی پرنٹر تجارتی پیمانے پر اُردو کے ٹیلی پرنٹر اور ٹائپ رائٹر تیار کرنے کا ایک کارخانہ پاکستان میں اسی سال قائم کیا جا رہا ہے۔ یہ کارخانہ ایک جرمن کمپنی قائم کرے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کمپنی نے اردو ٹیلی پرنٹر کے لیے جو بورڈ تیار کیا ہے وہ معیاری ہے اور اس کے ذریعے خبروں کی ترسیل اتنی ہی آسانی اور تیزی سے ہو سکے گی جتنی انگریزی ٹیلی پرنٹر کے ذریعے ہوتی ہے۔

"کتاب" کا نئی ہندی کہانی نمبر ماہنامہ کتاب چوک لکھنؤ نے اعلان کیا ہے کہ ان کا اگلا شمارہ نئی ہندی کہانی ہوگا اور اس میں ہندی افسانوی ادب کو نئی آوازیں عطا کرنے والے ادیبوں کی تخلیقات شامل ہوں گی۔ اس نمبر کو ہندی کے مشہور کہانی کار ٹھاکر پرشاد صاحب ترتیب دے رہے ہیں یہ مصور نمبر ۰۰ا سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ اور اس کی قیمت صرف ایک روپیہ ہوگی۔

قدرت اللہ شہاب

# سرودِ رفتہ

سہسرام کا شہر کئی لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک تو یہاں شیر شاہ سوری کا مقبرہ ہے۔ دوسرے یہاں آغا جانی کا بازار ہے۔ اور تیسرے اسی شہر میں ایک بار رانو کی موٹر کار کے دو ٹائر پنکچر ہو گئے تھے۔

جس طرح شیر شاہ سوری کی عظمت آغا جانی کے بازار کے پس منظر کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے اسی طرح رانو کی کار کے پنکچروں کے بغیر سہسرام کا شہر بھی اپنی تاریخی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔ آغا جانی کے بازار کا قصہ یوں ہے کہ کسی زمانے میں اس مقام پر ایک قصبہ آباد تھا۔ یہاں کے سردار کا لقب آغا جان تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جسے لوگ جانی کہتے تھے۔ غالباً جانی اس کا نام نہ تھا۔ بلکہ اس کی دل فریب شان محبوبیت سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ بے حد خوب صورت اور جمیل لڑکی تھی جس پر بہت سے لوگ دل و جان سے فدا تھے۔ ان میں سے ایک فرید خاں بھی تھا۔

فرید خاں خواب دیکھنے کا شوقین تھا۔ خوب صورت خواب، بھیانک خواب، جنگ و جدال کے خواب، ہندوستان کی بادشاہت کے خواب، جانی کی آنکھوں، جانی کے بالوں، جانی کی مسکراہٹوں کے دل فریب سپنے۔ اور جب اس کے خوابوں کی تعبیر نکلی اور شیر شاہ نے ہندوستان کی بادشاہت کا تاج پہنا، تو ایک تیز رفتار قاصد ایک پیغام لایا کہ "جانی میرا انتظار کرنا۔ میں بہت جلد اپنی ملکۂ عالم کے حضور میں آرہا ہوں۔" شیر شاہ بادشاہت کرتا رہا۔ اور جانی انتظار۔ انجام کار شیر شاہ پر ایک سنگلاخ، تاریخی مقبرہ تعمیر ہو گیا۔ اور جانی کے نام پر جانی بازار کی بنیاد پڑ گئی۔ جہاں ہر روز اس شہیدِ وفا کی یاد میں بیسوں جانیاں بن سنور کر، سولہ سنگار کر کے سو سو کنڈل پاور کے برقی قمقموں کے عین نیچے کرسیاں جما کر...... خیر، یہ تو ایک دوسری کہانی ہے۔ یہاں پر تو ایک قصہ رانو کی موٹر کار کا تھا۔ جسے پنکچر بھی ہونا تھا تو سہسرام میں۔ اب اگر وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اسے کون

روک سکتا تھا؟ اگر وہ شیر شاہ کے مزار پر چلی جاتی، تو شاید وہاں پر سوئی خاک کی چٹکی میں ایک لمحہ کے لیے آگ سی بھڑک اُٹھتی۔ اور اگر وہ جاپانی کے بازار کی طرف جا نکلتی تو ...... خیر، یہ بھی حسن اتفاق تھا۔ کہ وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جاپانی کے بازار کی طرف جانے کی بجائے کچہریوں کی طرف چلی آئی۔

اس وقت عدالت کے سامنے چوری کا کوئی معمولی سا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما بڑے جوش و خروش سے ایک گواہ پر جرح فرما رہے تھے۔ وہ مقامی عدالتوں کے سب سے سربرآوردہ اور گھاگ، کہنہ مشق وکیل تھے۔ جب وہ گواہ سے کوئی مفید مطلب بات کہلواتے تھے تو بصد ادب واحترام، جھک کر شیریں زبانی سے فرماتے تھے کہ "عالی جناب، عدالت اس فقرے کو نوٹ کرے"۔ لیکن ان کی ایک بھینگی آنکھ جو مدعی، مدعا علیہ، گواہ اور مجسٹریٹ کو ایک ہی ترچھے زاویے سے دیکھنے کی عادی تھی پکار پکار کر کہتی تھی کہ "ارے او مجسٹریٹ کے بچے اس فقرے کو یاد رکھنا۔ گواہ کی جرح پورے طور پر ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ عدالت نے اچانک مقدمے کی سماعت اگلی پیشی تک ملتوی کر دی۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما نے کہا "حضور ابھی صفائی کے دو گواہ اور موجود ہیں۔ جناب عالی وہ بڑی مشکل سے کلکتہ سے بلائے گئے ہیں۔ سرکار والا، وہ آج رات کی گاڑی سے واپس جانے پر مصر ہیں ...... ان کی بھینگی آنکھ نے بھی اپنی مخصوص زبان میں بہت سے الٹے سیدھے وار کیے۔ لیکن عدالت کا فیصلہ اٹل تھا۔ ابھی ابھی عدالت نے ملاحظہ فرمایا تھا کہ آج اس کی سرزمین پر سُرخ حاشیوں کے سینڈلوں والے دو خوب صورت اور نازک پاؤں یوں محو خرام تھے۔ جیسے کسی ستار پر دو حنائی انگلیاں مدھر مدھر سُر میں درباری کا الاپ بجا رہی ہوں۔ کچہری کے احاطے میں اچانک ایک مدہوش سی شمیم بس گئی تھی۔ اور سفید جارجٹ پر بڑے بڑے گلابی پھولوں والی ایک ساڑی نے ساری فضا کو گلنار کر دیا۔ چاروں طرف ایک سناٹا سا چھا گیا۔ جیسے کمشنر صاحب اچانک کسی ہنگامی معائنے پر نمودار ہو گئے ہوں۔ عدالت کو ایک حسین مقدمے کے تخیل نے سرشار کر دیا —— عبدالوہاب پیشکار کچھ عرصے کے لیے پان کی پیک نگلنا بھول گیا۔ اور اس کے چند قطرے سامنے پڑی ہوئی تعزیرات ہند کی جلد پر ٹپک گئے، جو اس نے نظر بچا کر کرتے کے دامن سے پونچھ ڈالے۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما نے بھی اپنی آنکھ کا زاویہ بدلا، اور اس دھڑکتی ہوئی خاموشی میں ساری دنیا نے سُنا کہ ایک موسیقار کسی اردلی سے پوچھ رہی ہے "کیا یہاں کسی

کے پاس موٹر کار ہے ؟"

یوں تو سہسرام کے مقدمہ بازوں، وکیلوں، مجسٹریٹوں، کلرکوں اور چپراسیوں کو اکثر یہ خیال آیا ہوگا کہ دنیا میں موٹر کار بھی اک نعمت ہے۔ لیکن اس وقت انھیں یہ احساس نہایت شدّت سے ستانے لگا کہ موٹر کار کا نہ ہونا بھی ایک ناقابلِ عفو جرم اور ناقابلِ تلافی گناہ ہے۔ اس جنسِ نایاب کے فقدان نے کچہری کے احاطے میں ایک حیرانی اور پشیمانی کا ماحول پیدا کر دیا۔ اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ ایک زبردست احساسِ بے مائگی سے آب آب ہونے لگا۔ "ہائے عجب جنگلی شہر ہے یہ۔ ارے بھئی اگر موٹر نہیں تو پنکچر لگانے کا سامان تو ہوگا۔ کسی کے پاس ٹائر اور رینچ جیک، ربڑ سلیوشن وغیرہ ؟" رانو بات تو اردلی سے کہہ رہی تھی لیکن ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ وہ خاص اسی سے مخاطب ہے۔ اور ان کے پشیمان چہرے، زبانِ حال سے فریاد کر رہے تھے، کہ میری جان، یہ ایک موٹر ہی ہمارے بس کا روگ نہیں ورنہ تم کہو ہم آسمان سے تارے نوچ لائیں۔ چاند اتار کر تمھارے پاؤں پر رکھ دیں، کالی گھٹاؤں کو تمھارے گیسوؤں سے لڑا دیں، شیر شاہ سوری کا مقبرہ تمھاری ٹھوکر میں لا بچھائیں۔ جانی کا بازار تمھارے آگے پیچھے بچھا دیں، لیکن اے جان یہ موٹر کار کا جوتا ہمارے منہ پر نہ مارو۔ ہم روسیاہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رانو جلدی میں تھی، اس لیے وہ آگے پیچھے، دائیں بائیں بلبلاتے ہوئے کسمساتے ہوئے فریادی چہروں کی آواز نہ سن سکی۔ اور نہ اس نے حسرت و یاس، شرمندگی اور بے بسی کا وہ امتزاج دیکھا جو ایشور داس سائیکل ڈیلر کے منہ پر گرم گرم کوِل تار کی طرح تہہ بہ تہہ بچھا جا رہا تھا۔ وہ دن بھر مقدمہ بازوں، منشیوں اور مختاروں کی سائیکلوں کے پنکچر درست کیا کرتا تھا لیکن اسے رانے کہ زندگی عزیز کے اس انمول لمحے اس کا سارا کمال بے کار، بے سود، رائگاں تھا۔ اگر خالی ربر کی بات ہوتی تو خیر وہ اپنی کھال تک کھینچ لیتا۔ لیکن اس کے پاس نہ کوئی بڑا رینچ تھا، اور نہ جیک، چنانچہ اب وہ اپنی ماڈل سائیکل ورکشاپ کے سامنے بے یار و مددگار اپاہج کی طرح کھڑا تھا۔ جس کا مال و متاع اس کے سامنے لوٹا جا رہا ہو۔ اب قسمت سے یہاں آ گئی ہو تو اپنا نور پھیلاتی جاؤ۔ تمھارے نور میں تو کوئی کمی نہ ہوگی، لیکن یہ زندگیاں غیر فانی ہو جائیں گی۔ یہ گھر آباد ہو جائیں گے۔ آنے والی نسلیں تمھارے گیت بھی اسی شوق، اسی سوز، اسی حسرت سے گائیں گی۔ جس طرح اب جانی کے قصے گائے جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کوئی ہوٹل، کوئی ڈاک بنگلہ ؟ کوئی ریسٹ ہاؤس ؟ ہائے یہ بھی کیا مجبوری ہے۔

اس گاڑی کی کار کو بھی اسی جنگل میں پنکچر ہونا تھا۔ پھر ایک بھی نہیں بیک وقت دو ٹائر پنکچر ہوگئے
ہیں۔ شاید ایک ٹیوب بالکل ہی پھٹ گیا ہو۔ اب اس اجاڑ بیابان میں نئی ٹیوب کہاں سے
ملے گی بھلا؟ ہائے دن بھی ڈھلتا جا رہا ہے۔ بنارس یہاں سے کوئی پچاس ساٹھ میل ہی تو
ہوگا۔ اگر یہ کمبخت کار پنکچر نہ ہوتی تو اب وہاں پہنچ بھی گئی ہوتی۔ بنارس پہنچ کر اس کو ابھی کتنے
کام کرنے تھے۔ ایک بادشاہ کا مقبرہ، ہماری آغوش میں آج بھی ایک جلیل القدر بادشاہ
محو استراحت ہے۔ لیکن یہ قدر ناشناس لوگ۔ پھر بھی اس کے لیے کتنے سو کتنے برس انتظار
کرنا پڑے۔ اور پھر ہربنس نے اس موقع پر خاص مدعو کیا تھا۔ ہربنس اس کا منگیتر تھا۔ بڑا
البیلا، خوش باش، خوش دل جوان تھا۔ اور ناچتا بھی کیا خوب تھا۔ خصوصاً آج رات جب
گرینڈ ہوٹل کا آرکسٹرا نئی نئی سُریلی دھنیں بجائے گا۔ جب بال روم کی فضا میں عطر اور
لیونڈر، شمپین، قہقہے اور خوب صورت اور نازک اندام حسینوں کے اجسام ایک تیز و تند خمار
کی طرح چھا جائیں گے جب رات کے بارہ بجے ہزاروں سال کے انتظار کے بعد آزادی
کی دیوی دیکھی ——— جن ——— شیریں نے گلاسوں کی خوشنما جھنکار کے ساتھ زمین پر اترے
گی، تو ہربنس کے ساتھ میں کیا کیا ارمان نہ ناچے گی۔ اس کے سبک قدم رقص گاہ کے شفاف
اور چکیلے فرش پر یوں پڑیں گے جیسے کسی جھیل کی لہروں میں کنول کے پھول تیرتے پھر رہے
ہوں، اور اس کے گرسنہ، بے قرار بازو رانو کو ایک شعلۂ بے قراری کی طرح اپنی لپیٹ میں لیے
ناچ گھر کے جھمگٹے میں یوں رقصاں جیسے دیا سلائی کو بھڑکتی ہوئی آگ میں دستی سے تیز تیز
گھمایا جائے اور اسے آگ نہ لگنے پائے لیکن تقدیر کا نوشتہ کس نے مٹایا ہے۔ اور کون مٹائے
گا؟ عین اس وقت جب کلکتہ میں ہربنس اپنے ڈنر سوٹ کے کالر میں لگانے کے لیے سفید
گلاب کے ایک بڑے سے پھول پر پرلائن پیرس کا عطر "پنشن" سوئیوں سے چھو چھو کر بسا رہا
تھا۔ رانو گرینڈ ٹرنک روڈ پر ایک حیران سہمے ہوئے کی طرح بسے ہوئے چھوٹے شہر سہسرام میں
سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے چھوٹے سے تاریک سے بنگلے میں ایک ناقابل بیان بے کسی
بے زاری اور مایوسی کے عالم میں اپنا سامان اُتروا رہی تھی۔ لیکن اس مہمان کی آمد پر صدیوں
سے سویا ہوا بنگلہ انگڑائی سی لے کر بیدار سا ہو گیا۔ اس کی اونگھتی ہوئی بے جان دیواروں
میں زندگی کے آثار لہرانے لگے۔ جمی ہوئی کھڑکیاں اور فرسودہ دریچے نودمیدہ کلیوں کی طرح
کھلنے لگے۔ تاریک چھتوں پر جیسے چاند اور تارے طلوع ہو گئے۔ اور جب رانو نے اپنے لاجواب

ہاتھوں سے ڈرائنگ روم کی کرسیوں اور میزوں پر بکھری ہوئی کتابوں کو الماری میں رکھ کے صوفے کا رُخ قدرے بدل کر رکھا تو اس بھولے بسرے پریشان حال کمرے میں نشاط اور شالامار کی گل پوش روشیں آراستہ ہو گئیں۔ اور پھر آج کی تاریخی رات کلکتہ نہ پہنچ سکنے کا غم غلط کرنے کے لیے رانو نے اپنے پکنک بکس سے جن رم، اور وسکی نکال کے چند تیز عنابی رنگ کے کاک ٹیل بنا کے نوش جان فرمائے۔ ان کا خمار گلابی دوڑوں کی صورت میں اس کی غزالی آنکھوں میں جھلک آیا۔ اور اس کے گالوں پر آتش بازی کی مہتابیاں، انار سے چھوٹنے لگے۔ آدھی رات کے قریب جب ہم شیر شاہ کے مقبرے کی چھت پر جا کر بیٹھ گئے، تاکہ سہسرام کی گلی کوچوں میں آزادی کا نفوذ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ تو اس وقت وہ ویران مقبرہ گرینڈ ہوٹل سے زیادہ منور اور بارونق محسوس ہونے لگا۔ اور اس کے سناٹے میں ایک عجیب سماوی سا آرکسٹرا سا بجنے لگا۔ سہسرام کی سرزمین پر ایک نئے شیر شاہ نے جنم لیا جس پر تاریخ کبھی کوئی یادگار مزار تعمیر نہ کر سکے گی۔ اور ایک نئی جانی نے ظلمت شب کو اپنے گیسوئے عنبریں سے تابانی عطا فرمائی۔ لیکن اس کے نام پر غالباً کوئی بازار قائم نہیں ہوا...... گھڑی کی سوئی بارہ بجنے سے کچھ منٹ ادھر دھیمے دھیمے لرز رہی تھی۔ جیسے کسی حسینہ کے دہکتے ہونٹ انکار اور اقرار کے مابین تھرتھرا رہے ہوں۔ شیر شاہ سوری کے مقبرے کے گرد جو تالاب ہے اس کی سیڑھیوں پر بہت سے بچے خوشی اور جوش سے کلکاریاں مارتے ہوئے انار، مہتابیاں، پھلجھڑیاں اور پٹاخے جمع کر رہے تھے۔ اور انھیں تالاب کے گرد اس خوبی اور کوشش سے سجا رہے تھے، جس پر رانو نے میوے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے پیچیدہ کاکلوں کو آراستہ کیا تھا۔ کلکتے کے گرینڈ ہوٹل میں بال روم اپنے جوبن پر تھا۔ ہر مس رانو کی آمد سے مایوس ہو کر مس پرمیلا کو اپنی بانہوں کے حلقے میں لیے آزادی کا رقص ناچ رہا تھا۔ "ڈارلنگ مجھے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو۔" رانو نے مخمور موسیقار آواز میں کہہ رہی تھی۔ "بائی گاڈ۔ اس مقدس رات کو آسانی سے برداشت نہیں کر سکتی۔ بائی گاڈ، میں جذبات سے مر جاؤں گی۔" آزادی کے انتظار میں رانو بھی ان بچوں کی طرح بے خود اور بے قرار ہو رہی تھی جو نیچے تالاب کی سیڑھیوں پر ہمیں سہسرام ہی کہے جاتے ہیں۔ جاہل، پاگل، احسان فراموش۔ دیکھو تو سہی تمھاری کار کے پنکچر تک نہیں جوڑ سکتے ـــ گنوار ـــ نالائق ـــ نکمّے......

"کیا یہاں رات گزارنے کے لیے کوئی اچھا ہوٹل ہے؟"

ارے ہوٹل میری جان، تجھے ہوٹل کی کیا حاجت؟ یہ دل دیکھو، یہ سینہ دیکھو، یہ آنکھیں دیکھو، یہ سارے پٹ تمہارے لیے ہی وا ہیں! آؤ، یہ کاشانے تمہارے ہی منتظر تھے۔ اب تم کہاں جاؤ گی؟ یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے...

"ہائے نہیں! میں کسی کے پاس ٹھہرنا نہیں چاہتی۔ کیا یہاں کوئی ڈاک بنگلہ بھی نہیں؟ کوئی ریسٹ ہاؤس؟"

سہسرام کچہری کے احاطے میں جتنے دل دھڑک رہے تھے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ ہوٹل یا ڈاک بنگلہ یا ریسٹ ہاؤس کا رتبہ حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگے۔ اور اُن کے کواڑ بے قراری سے بار بار کھلتے تھے۔ اور دامن پھیلا پھیلا کر فریاد کرتے تھے، کہ آؤ گھڑی دو گھڑی ان ویرانوں کو آباد کرتی جاؤ۔ اگر یہ لاجواب ساعت بیت گئی تو کون جانتا ہے پھر دوبارہ واپس آئے نہ آئے۔ اگر تم یونہی چلی گئیں تو تاریک دہرا انگلی تک نہ ہلا سکے گا۔

"خاک!" رانو جھلّا سی گئی — "کیا نام ہے اس شہر کا؟"

سہسرام کا ذرہ ذرہ پکارنے لگا کہ ہمیں سہسرام کہتے ہیں۔ پہلے ہمارا نام شہ سرام تھا بادشاہوں کے آرام فرمانے کی جگہ وہ دیکھو سامنے جو ایک سنگلاخ عمارت نظر آرہی ہے، وہ ایک مقبرہ ہے۔

اس روز اچانک موٹر سائیکل کو بار بار اچانک دھکے لگتے تھے۔ اسرافیل رہ رہ کے اپنا صور پھونکتا تھا جیسے پہاڑ ٹکرا گئے تھے۔ زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مل گئے تھے اور اس نفسا نفسی کے عالم میں رانو کے مرمریں بازو میری کائنات پر ایک مرغولۂ نور کی طرح آویزاں ہو رہے تھے۔ لیکن پھر وہ بگڑنے لگی۔ غصیلی ناگنوں کی طرح بل کھاتی ہوئی تیوریاں اُس پیشانی پر یوں تلملانے لگیں جیسے برفانی بادلوں کے آنچل میں بجلیاں تڑپ رہی ہوں۔ جیسے مرمر کی سلوں پر چاندی کے تار سیلاب کی طرح جھلملا رہے ہوں۔ غصّے میں بھی ایک کیف ہوتا ہے۔ کیسی رعنائی۔ چناں چہ اگر اس روز قدم قدم پر ٹھوکروں اور ہچکولوں نے ہمارا استقبال کیا تو اس میں نہ میرا قصور تھا نہ موٹر سائیکل کا، نہ سڑک کا، بلکہ ساری کائنات اس شہابی غبار کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی جو غصّے کی تمازت میں رانو کے گالوں پر قوس وقزح کی طرح چھا جاتا ہے۔ اور بعد وہ کیا ہی لاجواب، لافانی، انمول لمحہ تھا، جب اُس کے ڈرائیور نے قطعی طور پر کہہ دیا کہ "میم صاحب پنکچر لگانے کا سامان نہیں مل سکا۔ جب تک یہ

سامان نہ ملے، گاڑی بے کار ہے۔"

رانو کی کار سڑک کے کنارے اس خاموش گائے کی طرح کھڑی تھی جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہو۔ اور بیس بیس کوس تک کسی سلوتری کا ہسپتال ملنا محال ہو۔ ڈرائیور کا فیصلہ سُن کر رانو کے گالوں کا شہابی رنگ غبار آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح اس کی آنکھوں میں جوالا مکھی کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اور اس کے نازک پاؤں سہسرام کی اس خوش نصیب سرزمین کو غصّے سے یوں پیٹنے لگے، جیسے فرید خاں ہندوستان کا تخت پانے کے خواب بن بن کر بے چینی سے اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر پاؤں مارتا تھا۔ اور جیسے جانی انتظار کی گھڑیوں میں بے بس، پریشان ہجر ایڑیاں رگڑتی تھی۔ آج شام تک رانو کا کلکتہ پہنچنا لازمی تھا۔ اس کا احساس نہ ڈرائیور کو تھا نہ موٹر کار کو جو ایک اپاہج گائے کی طرح سڑک کے کنارے دم توڑے پڑی تھی۔ حالاں کہ یہ اشد ضروری تھا کہ وہ شام تک کلکتے ضرور پہنچ جائے۔ کیوں کہ آج رات جشنِ آزادی کی رات تھی۔ اور رات کے عین بارہ بجے جب آزادی کی دیوی آکاش سے اتر کر اس دھرتی پر آئے گی اس وقت گرینڈ ہوٹل کا بال روم اپنے پورے جوبن کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ یوں تو گرینڈ ہوٹل کا بال روم ہر شب شبِ برات مناتا ہے۔ لیکن آزادی کی رات بھی کوئی روز روز آتی ہے۔ اگر رانو نے یہ زریں موقع کھو دیا تو نہ جانے اُسے یہ جشن دوبارہ منانے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ بچے گھروں میں آتش بازی کی قطاریں سجا رہے تھے۔ اُف ایک بچہ دھڑام سے پھسل کر سنگلاخ فرش پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ کا انار تڑاخ سے پھوٹ گیا۔ اس کا چہرہ گرم گرم دھوئیں کے غبار میں لپٹ گیا۔ اس کی آنکھیں جھلس کر مند گئیں —— اب وہ اپنی آنکھوں سے اس دیوی کی شانِ نزول نہ دیکھ سکے گا جس کا استقبال کرنے کے لیے اس نے اپنی توتلی زبان سے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانے سیکھے تھے۔ آسمان پر ایک تارا ٹوٹا اور دور تک ایک خطِ نور کھنچتا ہوا غائب ہو گیا۔ جانی کے بازار میں طبلے پر زور کی تھاپ پڑی گھنگھرو ناچے۔ شیر شاہ کے مقبرے کے پتھر سنگِ مرمر بن گئے۔ چھت کے اندھیرے میں ایک شمع فروزاں بھڑکی، آزادی کی دیوی سوا نیزے پر اُتر آئی تھی۔ اور میرے کانوں میں ایک نازک سی مترنم آواز کہہ رہی تھی —— "چاکلیٹ سر؟"

میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ہلکے نیلے فراک والی ایر ہوسٹس بسکٹوں، چاکلیٹوں، چوسنے والی مٹھائیوں کی ٹرے لیے میری سیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے احمریں بالوں کی

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

شراب کہنہ

# دبیر

۱۸۰۳ء ——————— ۱۸۷۵ء

مرزا سلامت علی دبیر ابن مرزا غلام حسین، شاگرد میر مظفر حسین ضمیر، مرزا صاحب موصوف کے جدِ اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے تھے، دبیر دہلی میں پیدا ہوئے، چھ سات سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آ گئے تھے اسی شہر کے نامور علماء سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، شعر و سخن سے قدرتی مناسبت تھی، پندرہ سال کی عمر سے مرثیہ گوئی شروع کر دی تھی۔ اپنی ذہانت اور طباعی کی بدولت اوائل عمر ہی سے شہرت اور مقبولیت کے درجے پر پہنچنے لگے بادشاہِ وقت کے سامنے مرثیہ پڑھنے کا فخر و اعزاز حاصل ہوا، لکھنؤ کے بعض رؤسا اور محلات شاہی ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتی تھیں۔

لیاقت علمی اور استعداد فن کے ساتھ ساتھ آداب و مراتب کا بے حد لحاظ رکھتے تھے۔ تہذیب و متانت کا بھی مکمل نمونہ تھے۔ مرثیہ گوئی کے فن اور صنف کو ان کی ذات سے بڑا عروج اور استحکام حاصل ہوا۔ وہ مرثیے جو ان سے پہلے بیس تیس سے آگے نہیں بڑھتے تھے ان کو دو دو ڈھائی ڈھائی سو تک پہنچایا۔ شوکتِ الفاظ، مضمون آفرینی، بلند خیالی، بلیغ استعارے، نادر تشبیہیں غم انگیز واقعات کا دل گداز انداز بیان، تمام جزویات اور تفصیلات کو قلم بند کر دینے پر یکساں دست رس، بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر ایک کے جذبات اور احساسات کی پر اثر ترجمانی، بین و بکا کے مضامین غرض مرثیے کی تمام خوبیاں اور خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں بکثرت بالالتزام پائی جاتی ہیں۔

پچاس ساٹھ سال تک کی مسلسل مشق سخن میں کم و بیش تین ہزار مرثیے لکھے ہوں گے اس کے علاوہ بے شمار نوحے اور ہزار ہا رباعیاں بھی ان کی یادگار ہیں۔

# انتخاب

کیا دھوپ ہے، کیا تابشِ خورشیدِ فلک ہے — سایہ اسی گرمی سے یہ آج تلک ہے

اُٹھی، گری، بلند ہوئی، پست ہو گئی — پی پی کے مے کشوں کا لہو مست ہو گئی

جانے میں شبِ وصل کی ساعت نظر آئی — آنے میں یہ عاشق کی طبیعت نظر آئی

---

اس رخش سے برق و شرر و شعلہ و سیماب — لرزندہ و شرمندہ و درماندہ و بے تاب

خورشید و سحاب و فلک و انجم و مہتاب — سوزاں و خروشاں و سراسیمہ و بے خواب

---

یاں بخت وہاں عمر، اِدھر عقل، اُدھر ہوش — خوابیدہ، برباد و پراگندہ و روپوش

یاں ناطقہ، واں حافظہ خاموش و فراموش — بے نور اِدھر چشم، تو بے بہرہ اُدھر گوش

---

گل پیرہن و گل بدن و گل رُخ و گلفام — شمشاد قد و غنچہ دہان و سمن اندام

خوش قامت و خوش رو، و خوش آغاز خوش انجام — حُسنِ چمنِ شرع، بہارِ گُلِ اسلام

---

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفا — لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا

نے پانی مانگ آتا ہے مجھ کو نہ التجا — منت کبھی گر کروں گا تو وہ دیں گے کیا بھلا

پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری — بچے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے — چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے

غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے — چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے یہ ہم کو لائے ہیں — اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

پھر ہونٹ بے زبان کے چوسے جھکا کے سر — رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر

باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر — سوکھی زبان تم بھی دِکھا دو نکال کر

پھیری زباں لبوں پہ جو اس نورِ عین نے — تھرا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

ظہر تک سب رُفقائے شاہ کے مقتول ہوئے
تھے وہ مقبولِ خدا اور بھی مقبول ہوئے
یک قلم صَرفِ خزاں فاطمہ کے پھول ہوئے
رُو بہ قبلہ شہ دیں شکر میں مشغول ہوئے
روکے کہتے تھے کہ اکبر نہیں عباس نہیں
اب امانت کوئی خالق کی مرے پاس نہیں

اب نہ قاسم مرا جیتا ہے نہ اکبر باقی
نہ علم دار سلامت ہے نہ لشکر باقی
بھانجے ہیں نہ بھتیجے نہ برادر باقی
اب فقط سر مرا باقی ہے اور اصغر باقی
قتل اصغر ہو، مرا سر بھی جدا ہو جائے
اس امانت سے بھی شبیرؔ ادا ہو جائے

یا خدا تجھ پہ میں صدقے، مرا لشکر بھی نثار
دل فدا، جان فدا، رُوح فدا، سر بھی نثار
علی اکبر بھی نثار اور علی اصغر بھی نثار
تجھ پہ باقر بھی فدا، عابد مضطر بھی نثار
میں نے جو کچھ ترے دربار سے پایا مولا
سب تری راہ میں خوش ہو کے لٹایا مولا

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بارِ خدا
ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطرِ عاشق جاں باز ہے البتہ جدا
اے خوشا حال کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا
حلق پہ تیغ رہے، سینے پہ جلاّد رہے
لب پہ ہو نام ترا، دل میں تری یاد رہے

بندہ پرورا میں ہوں اک عبدِ غریب واحقر
بے کس و بے وطن و بے پدر و بے مادر
منزلِ مُلکِ عدم تُو مرا ہو رہبر
نہ تو اس راہ سے آگاہ نہ منزل کی خبر
شوق بھی رُعب بھی مجھ کو تری درگاہ کا ہے
سامنا بندۂ ناچیز کو اللہ کا ہے

# رُباعی

چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل
رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہوں
اس واسطے کاندھوں پر سوار آیا ہوں
منہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں

# نئی مطبوعات

وطن میں اجنبی (مجموعہ کلام) جگن ناتھ آزاد ۳/۵۰ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵
کلموہی (ناول) رابندرناتھ ٹیگور ۷/۵۰ ناشر: ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی
آئینۂ عقل (ادبی) پروفیسر نکہت شاہجہانپوری ۴/۵۰ " ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ
شاہ غمگینؒ (" ) " عبدالشکور ۳/- " " " "
نشاطِ غالب (" ) وجاہت علی سندیلوی ۴/۵۰ " " " "
نغمہ نو (مجموعہ کلام) اختر مالیگانوی ۲/۵۰ " مہاراشٹر اردو مرکز، مالیگاؤں
پیاسی بیل (افسانے) مانک ٹالہ ۴/- " جیو پیٹر پبلشرز، بمبئی ۳۱
روشنی کے مینار (معلومات) اطہر پرویز -/۷۵ " اردو گھر۔ علی گڑھ
ہماری زمین (" ) " " ۱/- " " "
چار درویش (کہانی) " " ۱/۲۵ " " "
نسیم مغرب (منتخب انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ) ۱۔ سی۔ بہار ۲/۵۰ " انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ
لحۂ فکر جان کنتھ گالبریتھ۔ مترجم ڈاکٹر محمد یاسین ۲/- " حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی
فیروزاللغات اردو (ہندوستانی ایڈیشن) مولوی فیروزالدین ۱۲/- ناشر: آزاد بک ڈپو، امرتسر
دروازہ (نیا ایڈیشن) کرشن چندر ۲/۲۵ ناشر: " " "
گیتا (منظوم) ستیہ پرکاش مہتاب ۲/۵۰ " ستیہ پرش مہتاب، شاہدرہ

## زیر طبع

صحیفہ محبت یعنی مہاری افادی کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ
جدید مجموعہ مضامین پروفیسر آل احمد سرور " " "
مرثیہ نگاری اور میر انیس ڈاکٹر احسن فاروقی " " "
ناول کیا ہے معہ اضافہ ڈاکٹر احسن فاروقی و ڈاکٹر نورالحسن " " "
عرفان حافظ پنڈت شیاما چرن داس ۱/- کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی ۶

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## راہِ عمل

(سن اشاعت ستمبر ۶۳ء)

مصنفہ: صالحہ عابد حسین
صفحات: ۴۷۸　سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد
قیمت: سات روپے ۵۰ نئے پیسے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی

راہِ عمل، بیگم صالحہ عابد حسین کا ناول ہے۔ ان کا پہلا ناول ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اب تک ان کے تین ناول اور افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں اس لیے وہ اس میدان میں نووارد نہیں ہیں اور اُن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے انھوں نے جس ماحول میں ہوش کی آنکھ کھولی ہے اس پر مولانا حالی مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا بہت گہرا اثر ہے۔ جو اقدار ہمیں مولانا حالی، مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے بیان ملتی ہیں، وہی راہِ عمل میں مصنفہ کے پیش نظر رہی ہیں۔ کملا نگر کی چھوٹی سی بستی میں بیداری کی لہر دوڑانے میں حبیب میاں، گیتا، انوپم اور ندیم پیش پیش ہیں۔ ندیم جوشیلا ہے۔ اس کی اپنی شخصیت ہے۔ رائے ہے، اپنا سوچا سمجھا طرزِ عمل ہے وہ عدم تشدّد کا مخالف اور بائیں بازو کا ہم درد ہے۔ انوپم سادہ مزاج پرخلوص اور انتھک کام کرنے والا ہے۔ اس کے دل میں قوم کا سچّا درد۔ اس کی بھلائی کی لگن اور اس کی سیوا کا گہرا جذبہ ہے۔ ویسے یہ دونوں خدمت کو سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں اور ان کا آدرش یہ ہے کہ ہندوستان کی ہر عورت کو سچی اور پوری آزادی حاصل ہو۔ ان میں علم کی روشنی پھیلے اور عمل کی تعمیری صلاحتیں بیدار ہوں۔ انوپم کا خاص مقصد گاندھی جی کے اصولوں کی تبلیغ ہے۔ جس میں محبت، سچائی، عدم تشدّد اور امن پسندی کو سب سے بڑا درجہ حاصل ہے۔ انوپم سوشل سروس کا انچارج ہے۔ اس کے دل میں خدمت کا گہرا جذبہ ہے اس میں ان تھک محنت کی ایسی قوت اور لوگوں کو پرچانے کی ایسی مقناطیسی طاقت ہے جو ناممکن کو ممکن بنا سکتی

ہے۔ سیوا اور پریم کی آگ جو اس کے دل میں ہے وہ اس کی چنگاری، دوسروں کے دلوں میں بھی ڈال سکتا ہے۔ اس ناول میں گیتا اور خالدہ اور ندیم کی دوستی گنگ وجمن کے ملاپ سے زیادہ خوب صورت اور ہماری متحدہ کلچر کی بلیغ علامت ہے اس طرح حبیب میاں بہترین تہذیبی روایات کے آئینہ دار ہیں اور گیتا ہندوستانی عورتوں کے لیے بہترین مثال ہے

صالحہ عابد حسین نے کملا نگر کی فضا کو خوب پیش کیا ہے۔ گاؤں کے لوگوں میں سیکھنے کی لگن، جاننے کا شوق، اپنے کو بچانے کا جذبہ گاؤں والوں کے اکھڑ انداز میں خلوص اور اپنائیت، گیتا اور خالدہ کی محبت و خدمت۔ ندیم اور انوپم کی کوشش یہ کملا نگر ایک آئیڈیل بستی بن جائے۔ گاؤں والوں کی نادانی اور جہالت۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان دوستی۔ ہم دردی، سیوا کی لگن، علم کی پیاس، کچھ کرنے اور کچھ بننے کی آرزو۔ کملا نگر میں قدیم اور جدید کی کشمکش، مرتے ہوئے زمین دارانہ خیالات اور اُبھرے ہوئے ہندوستانی جمہوریہ کی جھلک، ان سب چیزوں کو صالحہ عابد حسین نے مصورانہ چابک دستی سے پیش کیا ہے۔

اُردو کے ناولوں میں عام طور پر گہرائی اور توازن بہت کم ہے۔ سرشار کے یہاں قصہ ہی سب کچھ ہے نصیحت کچھ نہیں۔ نذیر احمد کے یہاں نصیحت ہی سب ہے۔ اور قصہ برائے نام ہے، پریم چند صراط مستقیم کے قائل ہیں۔ زندگی کے پیچ و خم سے آشنا نہیں، بعض ناول نگار بعض ہنگامی واقعات ہی سے سروکار رکھتے ہیں لاشعور اور باطن کی ہنگامہ آرائیوں سے واسطہ نہیں رکھتے۔

صالحہ عابد حسین کے یہاں بھی گہرائی اور توازن کم ہے۔ وہ ناول کے ارتقا اس کے نشیب و فراز اور اس کی موجودہ منزل سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ انھوں نے باطن میں اُترنے اور لاشعور کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی محبت میں وہ گرمی نہیں ہے جو مرد و عورت کے فطری میلانات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس پر روحانیت اور تقدس کا سایہ ہے مولوی نذیر احمد کی طرح ان کے بیان میں بھی واعظانہ خشکی اور ایک سرد قلم کی مقصدیت ہے۔ وہ ان اصلاحی خیالات سے جو آجکل بار بار پیش کیے جاتے ہیں اس درجہ متاثر ہیں کہ اُن کی فن کارانہ حیثیت مجروح ہو گئی ہے۔ ناول لکھنے کے لیے زندگی کے گہرے عرفان اور سنجیدہ و مہذب شعور کی ضرورت ہے وہ دراصل ایک فلسفانہ مشغلہ ہے اور ایک اچھے ناول نگار کے لیے

ضروری ہے کہ وہ قدروں کی کشمکش، کردار کی خصوصیات، انسانی جذبات کے اُتار چڑھاؤ باہمی تعلقات کی پیچیدگیاں اور نفسِ انسانی کی گتھیوں کو اس سلیقے سے پیش کرے کہ وہ ادبی یا شاعرانہ حقیقت معلوم ہوں۔ صالحہ عابد حسین کا یہ ناول "راہِ عمل" فنی اعتبار سے کمزور ہے لیکن اس میں معنویت ہے۔ ان کے قصے میں قصہ پن کم اور اس کا فنی آہنگ مدھم ہے لیکن اس میں ایک نقطۂ نظر ہے جس کو پورے خلوص سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کی کردار نگاری میں تجربہ کی گہرائی اور ارتقا کے اصولوں کی کارفرمائی زیادہ نہیں ہے۔ انھوں نے ارتقا کی منزلیں خطِ مستقیم کے ذریعے ظاہر کی ہیں لہروں کے ذریعے نہیں۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ ان کا ناول بے کیف اور بے لطف نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صالحہ بیگم کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ مکالموں کی برجستگی اور طرزِ ادا کی خوبی نے ان کو واعظ اور ناصح ہونے سے بچا لیا اور ان کو موجودہ اُردو ادب کی ایک نامور شہزادہ بنا دیا۔

پروفیسر ڈاکٹر احمد فاروقی (آل انڈیا ریڈیو سے نشر)

## ترغیباتِ جنسی

(سنِ اشاعت دسمبر ۱۹۶۲ء)

از: نیاز فتح پوری

صفحات: ۳۳۲ سائز $\frac{20\times30}{16}$

قیمت: چار روپے پچاس نئے پیسے

ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

وہ چند موضوع اور مسائل جن پر ہم کو اپنی زبان میں معقول اور کارآمد کتابیں نہیں ملتی ہیں یا کم ملتی ہیں "جنسیات" بھی انھیں میں سے ایک ہے، اس سلسلے کا جو مسالہ اور مواد ہم کو ملتا بھی ہے تو اس میں تحقیق اور معلومات کا حصہ بہت کم ہوتا ہے۔ بازاری انداز، تجارتی مقاصد یا لذت پرستی کا عنصر غالب نظر آتا ہے ——— ہمارے باوقار اہلِ قلم حضرات خیر سے اب اس موضوع پر موقع محل دیکھ کر کچھ کہنا اتنا معیوب نہیں سمجھتے مگر آج سے تیس بتیس سال پہلے تو جنسیات کے موضوع پر کسی طرح کا اظہارِ خیال ایک بہت ہی نازیبا بات سمجھی جاتی تھی اُس زمانے میں "ترغیباتِ جنسی" قلم بند کر کے نیاز فتح پوری نے وقت کی ایک ضرورت کو بڑی جرأت اور جسارت کے ساتھ پورا کیا۔

"ترغیباتِ جنسی" میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس موضوع اور اس کے تمام جزئیات اور تفصیلات کا تاریخی، علمی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے احاطہ کر لیا جائے۔

فحاشی محبّت اور انسان کے اسی سلسلے کے میلانات کی ارتقا سے لے کر مستقبل تک کے امکانات کو لکھ دینے کے لیے تین سو صفحے ناکافی ہیں۔ اختصار کی غیر معمولی کوشش کی وجہ سے بہت سے پہلو تشنہ اور بعض ابواب نامکمل رہ گئے ہیں

کتاب کے صفحہ ۱۵ سے جو باب شروع ہوتا ہے وہ کئی حیثیتوں سے بحث طلب ہے۔ اس مسئلے میں دو الگ الگ نقطۂ نظر ہیں اس پر یک طرفہ رائے دینے کے بجائے دونوں خیال کے عالموں اور مبصروں کی رائیں اور نظریے لکھ دیے جاتے اور فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑ دیا جاتا۔ اسی طرح بعض اصطلاحوں کے عربی ترجمے اس زمانے کے اُردو داں کے لیے مشکل اور غیر دل چسپ ہیں۔

خود ہولیدک ایلس اور فرائڈ جیسے لوگوں کی تحقیقات اور تجربوں کو اس زمانے کے بعض نقادوں اور مبصروں نے غلط ثابت کیا ہے اس سے ان عالموں اور راہبروں کی عظمت اور اہمیت میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی بلکہ ان کا کام آگے بڑھا اسی طرح اگر اس کتاب کے مولف یہ خیال فرماتے کہ اس کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں کچھ ترمیم و اضافہ کر دیا جائے، نظریات اور تجربوں کا حوالہ دے دیا جائے تو اس سے کتاب زمانۂ حال کے مطابق اور وقیع تر بن جاتی ——— اور وہ احسان یا خدمت جو انھوں نے آج سے تیس سال قبل کی تھی اس کے لیے دور حاضر کے لوگ بھی اُن کے ممنون و شکر گزار ہوتے ——— بایں ہمہ کتاب کا مطالعہ بہت سی حیثیتوں سے افادی اور دل چسپی سے خالی نہیں۔ (رشید نعمانی)

## یادِ جگر

مرتب: درگا پرشاد سلطان پوری
صفحات: ۱۱۴ سائز $\frac{30 \times 20}{16}$ مجلد
قیمت: دو روپے

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، یہ اُردو کے نامور اور مقبول خاص و عام غزل گو جگر مرادآبادی کی یاد میں سپردِ قلم کی گئی ہے مگر شادؔ سلطان پوری نے اس میں ایک ندرت یہ پیدا کی ہے کہ انھوں نے جگر سے اپنی آٹھ ملاقاتوں کو جو جولائی ۱۹۵۶ء سے شروع ہو کر مئی ۱۹۶۰ء میں اختتام پذیر ہوتی ہیں، صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا ہے۔ شادؔ لکھتے ہیں:

"جن باتوں کو میں اہم سمجھتا تھا، انھیں گھر آکر حرف بحرف اپنی ڈائری یا نوٹ بک میں درج کر لیا کرتا تھا۔"

شاد کا کہنا ہے کہ وہ بوسویل کے نقش قدم پر چلنا چاہتے تھے جس نے انگریزی کے مشہور شاعر اور نقاد جانسن کی سوانح لکھی تھی۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ ملاقاتوں کے ذریعہ بشرطیکہ وہ "غیر رسمی" ہوں کسی شخصیت پر تحقیق کی جا سکتی ہے۔ ان کے اس ادعا کی تکمیل میں "یاد جگر" کے صفحات کہاں تک معاونت کر سکتے ہیں، اس سے قطع نظر یہ ضرور ہے کہ "یاد جگر" میں جگر کی شخصی زندگی کے بعض ایسے پہلو بھی بے تکلفانہ سامنے آجاتے ہیں جنھیں ان کی کمزوری بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔

سید احتشام حسین نے "یاد جگر" کے متعلق اظہار رائے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ شاد سلطان پوری نے "اظہار تمنا" کر کے "حسن بے پروا کو خود آرا" نہیں بننے دیا کیونکہ ملاقاتوں کی مقصدیت کا اظہار ہو جانے کے بعد ان میں تکلف کی آمیزش یقینی تھی اور پھر اس کتاب کی اصل افادیت ختم ہو جاتی۔ "یاد جگر" کی اولین اور اساسی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں جگر کو "خود آرائی" کا موقع نہیں دیا گیا ہے۔ شاد نے اس میں نہ ان کی شاعری پر کوئی تبصرہ کیا ہے نہ ان کی شخصیت پر کوئی روشنی ڈالی ہے بلکہ اس کتاب کے صفحات سے کیمرہ کا کام لیا ہے جو وقتاً فوقتاً جگر کی تصویریں محفوظ کرتا رہا ہے، وہ تصویریں جن میں کوئی "بناوٹ" ہو ہی نہیں سکتی۔ ان تصاویر کے بعض خطوط و دوائر خوش مذاقی کو ٹھیس پہنچا سکتے ہیں لیکن شاد کا یہ مقصد نہیں۔

کتاب کا گرد پوش جگر کی تصویر کا حامل ہے، علاوہ ازیں کتاب کے اندر بھی جگر کی ایک تصویر موجود ہے۔ اس کا پیش لفظ محوی صدیقی لکھنوی نے تحریر فرمایا ہے، سید احتشام حسین کی رائے بھی شامل کتاب ہے۔ بلاشبہ "یاد جگر" کافی دلچسپ کتاب ہے۔ اس کی کتابت و طباعت اور بہتر ہونی چاہیے تھی۔ (سید حرمت الاکرام)

# کتاب نما

| سالانہ چندہ<br>ایک روپیہ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ | فی پرچہ<br>۱۰ نئے پیسے |
|---|---|---|

پرنٹر پبلشر سید احمد نے ... نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

اعزازی ایڈیٹر
غلام ربانی تاباں

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۵ | جولائی ۱۹۶۴ء | شمارہ نمبر ۷


# اشاریہ

جیسا کہ ہم نے کتاب نما کے مئی ۶۴ء کے شمارے میں اعلان کیا تھا، بچوں کا مشہور رسالہ "پیام تعلیم" مکتبہ جامعہ سے دوبارہ جاری کیا جا رہا ہے۔ "پیام تعلیم" مکتبہ جامعہ کے زیر اہتمام ۱۹۲۶ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں چند ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے اس کی اشاعت بند کر دی گئی تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ بچوں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اب ہم اسے دوبارہ جاری کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اپنی قسم کے اس واحد اور نمائندہ ماہنامے میں بچوں کے لیے ہر ماہ نئی نئی اور سبق آموز کہانیاں، عمدہ نظمیں، مزے دار لطیفے اور ان کے کام آنے والے ادبی اور معلوماتی مضامین کے ساتھ ساتھ بچوں کی دلچسپی کے لیے خوب صورت تصاویر اور کارٹون وغیرہ بھی شائع کیے جائیں گے۔

"پیام تعلیم" بچوں کا ہمیشہ ایک اچھا دوست اور ایک شفیق اُستاد رہا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اب بھی اپنی اچھائیوں اور گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے بچوں کے رسالوں میں ایک بلند مقام اور خاص شہرت کا حامل رہے گا۔ ہمارے پہلے اعلان کے مطابق یہ رسالہ جناب حسین حسان صاحب (سابق ایڈیٹر پیام تعلیم) کی ادارت میں نئی آب و تاب، نئی اُمنگوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ اس ماہ کے آخر تک منظرِ عام پر آ جائے گا۔

■■

سعید سہروردی

# جگن ناتھ آزاد اور اُن کی شاعری

جگن ناتھ آزاد اُردو کے محتاط اور نسبتاً کم لکھنے والے شاعروں میں سے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے اُن کی ادبی کاوشوں نے ادب میں اپنی مستقل جگہ پیدا کرلی ہے۔ اُردو داں طبقہ ان کے تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا کلام ایک مدت سے ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہو رہا ہے اس کے علاوہ ان کی لکھی ہوئی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ان دنوں وہ جوش ملیح آبادی کے ساتھ 'بساطِ عالم' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ 'بساطِ عالم' پڑھنے والے اور دیکھنے والے یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایسے رسالے کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے محض صحافتی تجربہ کافی نہیں بلکہ زندگی کی قدروں کی پہچان ہونا بھی لازمی ہے۔ بیسویں صدی کی سیاست میں اسی عنصر کا فقدان ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی قومیں تعمیر اور ترقی کی ڈگر سے اس قدر دُور ہٹ گئی ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کی پیدائش ۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں ہوئی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نہ کوئی اُردو بولتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ یہاں کی زبان کو نہ پنجابی کہا جاسکتا ہے نہ پشتو، اس میں پشتو کی کرختگی تو ضرور ہے لیکن پنجابی کی تیزی و طراری نہیں۔ ایک زمانے میں عیسیٰ خیل سرحد کا شہر تھا لیکن آج کل مغربی پنجاب کا شہر ہے۔

منشی تلوک چند محروم کا نام غالباً ہر اس شخص نے سنا ہوگا جسے موجودہ دور کی اردو شاعری سے ذرا سی بھی دل چسپی ہوگی۔ جگن ناتھ آزاد ان کے صاحب زادے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کم از کم جگن ناتھ آزاد کے بارے میں تو یہ کلیہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے محروم صاحب جیسے نکتہ رس اور باکمال شاعر کی تربیت نے آزاد کی زندگی پر ایک گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان کے ذوقِ سلیم کا عکس لڑکے کی فطرت پر پڑا۔ ان کی حوصلہ افزائی کی بدولت اس بنجر علاقے میں بھی جگن ناتھ آزاد کی فطری صلاحیتوں کو سرسبز ہونے کا موقع ملا۔

جب جگن ناتھ آزاد دوسری جماعت میں تھے تو ایک مرتبہ ان کے والد صاحب نے دیوانِ غالبؔ ان کے سامنے رکھ دیا اور یہ غزل ؎

کوئی اُمید بر نہیں آتی

پڑھنے کو کہا۔ غالباً وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ بچّے کی طبیعت میں موزونی ہے یا نہیں۔ بچّے نے جب غزل سنادی تو مرحوم صاحب نے فرمایا۔ تم یقیناً ایک شاعر ہوگے...... اور آج ہم آزاد کے ادبی شعور کو پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ مرحوم صاحب کی بصیرت نے لڑکے کے مستقبل کا کتنا صحیح تصور قائم کرلیا تھا۔

جب مرحوم صاحب کا تبادلہ عیسیٰ خیل سے کلور کورٹ ہوگیا جو کوہستان کے دامن میں واقع ہے تو جگن ناتھ اپنے والد کے ساتھ یہاں آئے۔ اس مقام پر بھی دوسرے پہاڑی علاقوں کی طرح پہاڑوں پر مکان بنے ہوئے ہیں۔ راستے میں کالا باغ کے مقام پر اسٹیمر کے ذریعے سے دریائے سندھ کو عبور کرنا پڑتا ہے، جب اسٹیمر دریا کے وسط میں پہنچا تو مرحوم نے مکانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

پہاڑوں کے اوپر بنے ہیں مکان

جگن ناتھ نے فوراً دوسرا مصرع موزوں کردیا

عجب ان کی صورت عجب ان کی شان

مرحوم صاحب بولے "صورت" نہیں "شوکت" کہو اس وقت شاید جگن ناتھ آزاد نے فن کی اس باریکی پر توجہ نہ دی ہو لیکن یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس لفظی تبدیلی نے شعر کی خوبی میں کتنا بڑا فرق پیدا کردیا۔ کلور کوٹ پہنچ کر آزاد نے اس نظم کو مکمل کیا۔ جب مرحوم صاحب نے یہ نظم سنی تو ہنس پڑے۔ بچپن ہی میں جگن ناتھ آزاد کی شاعری کی اس طرح ابتدا ہوئی۔

جگن ناتھ آزاد نے میٹرک کا امتحان میانوالی سے پاس کیا۔ اس کے بعد مرحوم صاحب کا تبادلہ راولپنڈی ہوگیا۔ یہاں آزاد کو ایسی فضا میسر آئی کہ ان کا سویا ہوا ذوقِ سخن پھر بیدار ہوگیا۔ یہاں مرحوم صاحب کی آمد پر ان کے اعزاز میں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے دعوت دی گئی۔ آزاد اس وقت نو عمر تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ وہاں شعر و سخن کا سلسلہ بھی رہے گا تو اُن کی طبیعت بھی گدگدائی۔ مگر مدعو نہ تھے اس وجہ سے نہ جاسکے۔ اتفاق کی بات کہ دو سال بعد اسی انجمن نے جگن ناتھ آزاد کو اپنا سیکریٹری منتخب کیا اور وہ دو سال تک اس کی خدمت

انجام دیتے رہے۔

اس زمانے میں عبدالحمید عدم کا قیام بھی راولپنڈی میں تھا اور وہ محروم صاحب کے یہاں برابر آیا جایا کرتے تھے۔ عدم جب آتے تو اپنی نئی نظمیں سناتے اور محروم صاحب بھی اپنا کلام سناتے تھے مگر وہ نسبتاً کم کہتے تھے۔ اس ماحول نے آزاد کے ذہن پر اثر ڈالا لیکن عدم کے کلام سے متاثر ہونے کے باوجود آزاد نے کبھی ان کی تقلید نہیں کی۔ بعدازاں وہ اقبال کے کلام سے متاثر ہوئے اور انھیں یہ اعتراف ہے کہ انھوں نے اقبال کی تقلید کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن بہت جلد انھیں یہ احساس ہو گیا کہ تقلید کرنے سے ان کی اپنی ہستی بالکل اُجاگر نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ہر وقت گم ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

انٹرمیڈیٹ کی تعلیم ڈی، اے، وی کالج میں ختم کر کے انھوں نے گارڈن کالج میں بی، اے کی تعلیم شروع کی۔ پہلے تو انھوں نے نظم کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ نثر کے کچھ مضامین لکھے۔ لیکن انسان اپنی فطری صلاحیتوں سے بغاوت نہیں کر سکتا چناں چہ بہت جلد آزاد کی طبیعت نے پھر شاعری کی طرف رجوع کیا۔

آزاد انٹرمیڈیٹ میں کالج میگزین کے ایڈیٹر منتخب کیے گئے تھے اور جب بی، اے میں پہنچے تب بھی کالج میگزین کے اردو سیکشن کی ادارت ان کے سپرد تھی۔ اس وجہ سے میگزین کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔

اس کے بعد آزاد لاہور چلے آئے۔ یہاں شعرگوئی کے زیادہ مواقع انھیں نصیب ہوئے اور کلام 'شاہکار' 'ادبی دنیا' اور 'ادبِ لطیف' ایسے ممتاز رسائل میں شائع ہونے لگا۔ اخبارات میں کام کرنے کے بعد انھوں نے ایم، اے کیا۔ ایم، اے کے بعد وطنیت کے جوش میں وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے چند دوستوں کے ہمراہ اتحاد کا پرچم لیے پنجاب کے کونے کونے میں گھومے اور بلوچستان کی سرحد تک ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کرتے رہے۔

ایک زمانے تک پنجاب میں تقریریں کرنے کے بعد وہ پھر لاہور کے واحد کانگریسی اخبار 'جے ہند' کے عملے میں نامہ نگار کی حیثیت سے شریک ہو گئے۔ اگست ۱۹۴۷ء تک وہاں رہے۔ اس کے بعد شمالی ہند اور خصوصاً پنجاب میں جو افراتفری پھیلی اس میں آزاد کو بھی لاہور چھوڑنا پڑا۔ اخبار گو جالندھر چلا گیا لیکن آزاد دہلی آئے انھوں نے اپنی مشہور غزل

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری

دہلی آنے کے بعد کہی۔

جگن ناتھ آزاد نظمیں بھی کہتے ہیں اور غزلیں بھی لیکن جہاں تک ان کے فن کا تعلق ہے ان کی غزلوں اور نظموں کو الگ کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کا مخصوص رنگ دونوں جگہ ہی نمایاں ہے انھوں نے اردو کے روایتی تغزل کی پیروی نہیں کی اور دانستہ قدیم اساتذہ کی روش سے الگ رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے موجودہ دور کے بعض نوجوان شعراء کی تحریک کا ساتھ بھی نہیں دیا جو مغربی ادب سے متاثر ہونے کے بعد ہمارے کلاسیکی ادب کے نام سے بدکتے ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ کلاسیکی ادب کی تمام قدریں حال کے لیے نہیں۔ لیکن ہر ادبی تخلیق ایک فنی تجربے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں فن کار کے طبعی اور ذہنی ماحول کی جھلک ہوتی ہے۔ کلاسیکی ادب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ کلاسیکی ادب سے بے نیاز رہ کر شاعر یا فن کار اپنے ماحول کلچر اور اپنی زبان کے مزاج سے مکمل طور پر روشناس نہیں ہو سکتا۔

جگن ناتھ آزاد نے اپنے کسی ہم عصر کا رنگ بھی مستعار نہیں لیا۔ اگرچہ ان کی شاعری میں تمام ترقی پسند عناصر موجود ہیں لیکن ان کا رنگ منفرد ہے اور وہ اپنی ڈگر پر آج تک کامیابی سے چل رہے ہیں۔

وہ ہر موضوع پر اپنے تاثرات کو خوب صورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ انھیں احساس کی ترجمانی اور جذبات کی عکاسی میں کمال حاصل ہے لیکن وہ اتنی ہی خوبی کے ساتھ خارجی حقائق کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔ اور موجودہ دور میں کوئی فن کار زندگی کی حقیقتوں سے فرار اختیار کرکے ادب میں کوئی مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا زندگی کے حقائق ادیب کا شانہ ہلاتے رہتے ہیں۔ اور خواہ وہ حقائق کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں ادیب دلیری کے ساتھ ان کا سامنا کرتا ہے۔ آج کے شاعر کے لیے بہار ہی نہیں بلکہ خزاں بھی زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہے۔

نوبہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو
نوبہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے (جگن ناتھ آزاد)

۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزوں نے اختیارات ہندوستانیوں کے سپرد کر دیئے لیکن وہ ملک میں بارود کے ریزے بکھیر گئے تھے جو ذرا سی دیر میں مشتعل ہو گئے، جذبات سلگ اٹھے۔

دلوں میں آگ لگ گئی۔ مکانات جلنے لگے۔ کھیتیاں اجڑنے لگیں، اور اس وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان شعلوں کی آنچ ہندوستانی معاشرت کی تمام قدروں کو پگھلا دے گی۔ اخلاق، تہذیب اور کلچر کے اوراق بکھر جائیں گے اور گوتم اور گاندھی کی سرزمین میں راکھ کے سوا کچھ نہ رہ جائے گا ـــــ یہ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے الم ناک باب ہے۔ 'یومِ آزادی' پر آزاد کی غزل اس دور کے ادب میں ایک امتیازی رتبہ رکھتی ہے۔

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ مے خانہ یہ مے خانوں پہ کیا گزری

فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں ان کی
جنونِ سرفروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

نشانِ برگِ گل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گزری

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر ان شبستانوں پہ کیا گزری

وہ رنگ و نور سے بھرپور بستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمور کاشانوں پہ کیا گزری

ابھی تو چشمِ عبرت وقت کی رفتار دیکھے گی
ابھی یہ کس طرح کہہ دیں ستم رانوں پہ کیا گزری

نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ہوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گزری

ان واقعات اور حقائق سے متاثر ہو کر جگن ناتھ آزاد نے کئی اور نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔

ایک غزل کے چند اشعار ہیں ؎

ترتیبِ نشیمن کیا ہوگی آئینِ گلستاں کیا ہوگا
آغازِ بہاراں کچھ تو بتا انجامِ بہاراں کیا ہوگا!

اندازۂ طوفاں ہوتا ہے طوفاں کے قریب آجانے سے
ساحل پہ بسیرا کرنے سے اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

ماحول کی گرد سے کچھ ایسا دھندلا یا حال کا آئینہ
کچھ اس میں نظر آتا ہی نہیں مستقبلِ انساں کیا ہوگا

---

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہوگا
نئی محفل کو ہم اپنا بنائیں بھی تو کیا ہوگا!

چمن بدلا چمن کا رنگ بدلا باغباں بدلے
یہاں اب ہم پرانے گیت گائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں ہر سنگ پارے کو گہر کی شان حاصل ہو
فرادہ ہم وہاں جا کر اٹھائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں چاروں طرف سے آندھیاں مذہب کی چلتی ہوں
وہاں ہم عقل کی مشعل جلائیں بھی تو کیا ہوگا

جہاں انسان کو اونچے تخیل سے عداوت ہو
وہاں ہم موج میں تانیں اڑائیں بھی تو کیا ہوگا

تجلی کا اب اس ماحول میں طالب نہیں کوئی
اندھیری رات میں ہم جگمگائیں بھی تو کیا ہوگا

جب اس محفل میں سننے پر نہیں ہے کوئی آمادہ
تو پھر ہم نطق کا جادو جگائیں بھی تو کیا ہوگا

اور یہ اشعار:

اک بار گر قفس کی ہوا راس آگئی
اے خود فریب! پھر ہوسِ بال و پر کہاں

فضا کو دیکھ کے ذوقِ نظر پہ کیا گزری
نہ پوچھیے ہوسِ بال و پر پہ کیا گزری

شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جڑ نہ سکا
خبر نہیں کہ دلِ شیشہ گر پہ کیا گزری

داستانِ عشق سے رنگین ہے دل کی کائنات
عشق افسانہ ہے لیکن سرخیٔ افسانہ ہم

بہار لائے گی نکہتوں کا جب ایک طوفان تو کیا کریں گے
نہ رنگ و بو تھا نہ زمزمے تھے خزاں میں تو ہو گیا گزارا

یہ الگ بات ہے تو اس کو نہ دیکھے لیکن
تیرے ماحول میں آہوں کا دھواں آج بھی ہے

آج بھی پائی نہیں دین سے دنیا نے نجات
نالہ کش محفلِ صاحب نظراں آج بھی ہے

پھولوں سے، بہاروں سے، ستاروں سے گزر جا
ہے دور کہیں ذوقِ نظر تیرا ٹھکانہ

پھولوں کو دیکھتی ہیں نگاہیں کچھ اس طرح
جیسے میں آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی

یہ آباد سا ویرانہ، یہ ویران سی آبادی
دل بھی عجب آبادی ہے دل بھی عجب ویرانہ ہے

خاک پہ دھندلے نقش فضا میں بھٹکی بھٹکی آوازیں
ایک نظر آزاد کہ یہ بھی چند جمیل افسانہ ہیں

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد اس ملک میں جو طوفان آیا اور لاکھوں پودے جڑ سے اکھڑ گئے۔ کارواں در کارواں لوگ ٹھوکریں کھاتے ایک سمت سے دوسری سمت جانے لگے۔ فضا میں موت کے پروں کی سنسناہٹ سنائی دینے لگی۔ آزاد کو بھی اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ ان کی بعض نظمیں اسی دور کی عکاس ہیں۔ "وطن میں آخری رات" کے عنوان سے ایک نظم ہے جس کے دو بند یہ ہیں:-

نغمہ آباد میں یہ شہرِ خموشاں کا سکوت
زندگانی پہ عجب موت نے ڈالا سایا

کان میں دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
مجھ کو اے جذبۂ مشتاق کہاں لے آیا

آج یہ لرزہ براندام اُجالا، لیکن ا
آپ ہی آپ مٹتا سا چلا جاتا ہے
کوئی برچھی، کوئی خنجر، کوئی پتھر، کوئی اینٹ
میرے احساس کو ماحول سے خوف آتا ہے

ایک دوسری غزل ہے ؎

بس ایک نور جھلکتا ہوا نظر آیا
پھر اس کے بعد نہ جانے چمن پہ کیا گزری
جدا جب اس سے ہوئے اہلِ کوثر و تسنیم
نہ پوچھو عالمِ گنگ و جمن پہ کیا گزری
وہ انجمن کہ جو کی تھی خلوص نے تعمیر
نہ پوچھ مجھ سے کہ اس انجمن پہ کیا گزری
خموش کیوں ہیں قتیلِ نسیم کچھ تو کہیں
ہمارے بعد ہمارے وطن پہ کیا گزری

۱۹۴۶ء میں جگن ناتھ آزاد کی رفیقۂ حیات انتقال کر گئیں۔ اور اس صدمے سے متاثر ہو کر انھوں نے دو نظمیں "شکنتلا" اور "ایک آرزو" کہیں۔ "شکنتلا" ادبی دنیا نومبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا صلاح الدین نے اس نظم کے متعلق یہ خیالات ظاہر کیے ہیں۔

"جگن ناتھ آزاد نے شکنتلا کے عنوان سے اپنی رفیقۂ حیات کا مرثیہ لکھا ہے۔ مرثیہ کیا ہے۔ اشکِ خونیں کا ایک سیلاب ہے جو زمینِ شعر کو شاداب کرتا ہوا منزلِ ابد کی طرف رواں ہے۔ آزاد نے مرثیہ لکھ کر حقیقتاً مرثیے کی اس صنف پر احسان کیا ہے جس کا تعلق رسمِ شعر سے نہیں غمِ دل سے ہے اور ہمیں یقین ہے کہ مستقبل کا مورخ اسے زبانِ اُردو کے بہترین مرثیوں میں جگہ دے گا۔ جذبات کا خروش اور الفاظ کا حسن دونوں اپنے عروج پر نظر آتے ہیں اور حیرت کا مقام ہے کہ شاعر نے ایسی کیفیت میں کہ اس کا دل غم سے پارہ پارہ ہو رہا تھا، ایک ایسا ادبی شاہکار کیوں کر تعمیر کیا مگر شاید ادبِ عالیہ کی تخلیق جذباتِ عالیہ کے ہیجان ہی کی دوسری صورت ہے اور مرنے والی کو کیا معلوم کہ اس کے پھولوں پر اس کے شوہر نے شعر کا تاج محل تعمیر کر کے اسے جاوداں کر دیا۔"

ریل گاڑی رُک چلی ہے دھرم پور آنے کو ہے
ساغرِ لبریز آنکھوں سے چھلک جانے کو ہے
سلسلہ نا ناوتی کا ہے نظر کے سامنے
پھر وہی تصویر کھینچی ہے سکوتِ شام نے
دیکھ لے اک بار پھر اے دیدۂ خونناب بار
سامنے ہے زندگی کی آرزوؤں کا مزار
کیا خبر کس کیفیت میں گم ہوا جاتا ہوں میں
ایک طوفاں ہے کہ جس میں ڈوبتا جاتا ہوں میں

خامشی ہے نالہ کش ہے خاطرِ اندوہگیں
روح میں دھڑکن سی ہے جذبات پر قابو نہیں
نطق کا حاصل کہاں تاب بیانِ زندگی
کہہ گئے آنسو چھلک کر داستانِ زندگی

آزاد کی نوائے درد میں جو تڑپ، چبھن اور چٹیلا پن ہے وہ اس نظم کو شاہ کار بنا دیتی ہے۔ اس احساس کی لذت ہمہ گیر ہے۔ اس مرثیے کے آخری اشعار اردو شاعری میں اپنی مثال نہیں رکھتے ؎

عالمِ فردوس میں تو آج آرامیدہ ہے
میرے سینے میں تری یادِ حسیں خوابیدہ ہے
روحِ باقی جا چکی ہے جسمِ فانی جل چکا
آج وہ میرا جہانِ شادمانی جل چکا
ہائے کیا نقشہ دکھایا گردشِ ایام نے
تو نہیں ہے اور ہیں تیرے پھول میرے سامنے
چُن کے تیری راکھ سے یہ پھول لے آیا ہوں میں
گوہرِ اشکِ رواں دے کر انھیں لایا ہوں میں
بزمِ فانی کی کثافت سے نہ آلودہ رہیں!
پھول تیرے دامنِ گنگا میں آسودہ رہیں

دوسری المیہ نظم "ایک آرزو" بھی انھیں تاثرات کی حامل ہے اور شاعر کے مجروح جذبات کی پوری طرح ترجمان ہے۔ یہ اشعار تو اپنا جواب نہیں رکھتے ؎

میں تو اتنا جانتا ہوں اے قرارِ چشم و دل
اے مری حدِّ نظر اے انتظارِ چشم و دل!
جب چتا کی لکڑیوں پر سو گیا تیرا شباب
"کچھ نظر آیا نہ جز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک ہی میں نے یہ دیکھا کہ پروانہ گیا"
دُور تک گو جستجو میں شوقِ دیوانہ گیا

---

دیدۂ آہو میں ہے تو یا رمِ آہو میں ہے
کچھ بتا دے پھول میں یا پھول کی خوشبو میں ہے
برگِ گل پر قطرۂ شبنم کی بے تابی میں ہے
یا مرے سوئے ہوئے اشکوں کی نایابی میں ہے
آبِ گوہر میں ہے دریا کی روانی میں ہے تو
یا مرے ٹوٹے ہوئے دل کی کہانی میں ہے تو

مولانا صلاح الدین احمدؔ اس نظم کے متعلق کہتے ہیں:

"محبوبِ رفتہ کی جستجو کا ایسا لطیف اور درد انگیز اظہار بلند سے بلند شاعری

کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد اپنے فن پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی قدروں کا صحیح ادراک رکھتے ہیں۔ ہمیں ان کے کلام میں کسی جگہ پر کھوکھلے پن کا احساس نہیں ہوتا ان کا ہر شعر زندگی کی ایک اٹل حقیقت ہوتا ہے۔ ان کے انداز بیان میں کوئی الجھاؤ نہیں انھوں نے کبھی نعروں کا سہارا نہیں لیا اور نہ ایک قدامت پرست فن کار کی حیثیت سے اپنے فن کو عروض کی زنجیروں کا غلام بنایا ہے۔

انھوں نے بعض بڑی کامیاب فکریہ نظمیں بھی کہی ہیں تقسیم سے قبل ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "نذر اقبال" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس کا موضوع خود اقبال اور کلام اقبال ہے اس مجموعے کے متعلق سر عبدالقادر لکھتے ہیں :۔

> "یہ گویا عقیدت کے چند پھول ہیں جو انھوں نے اقبال پر نچھاور کیے ہیں اسی لحاظ سے اس مجموعے کو اقبال کی نذر کیا گیا ہے۔ جو بے ساختہ تعریفیں ان اشعار میں آزاد کے قلم سے نکلی ہیں، اُن سے ان کا دلی جذبۂ محبت نظر آرہا ہے اور ان میں خوبی یہ ہے کہ مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا محض اظہارِ حقیقت ہے مثلاً یہ تعریف ملاحظہ ہو۔

| | |
|---|---|
| تری نگاہ گئی بزمِ کہکشاں سے پرے | وجود اگرچہ رہا بزمِ خاک کا پابند |
| مہ و ستارہ و برقِ تپاں و مہرِ مبیں | تری نگاہ نے ڈالی کہاں کہاں نہ کمند |

حال میں ان کی نظموں کا مجموعہ "طبل و علم" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان نظموں کا موضوع کشمیر ہے۔ اس مجموعے میں بھی بڑی کامیاب نظمیں ہیں۔

جوش ملیح آبادی نے 'طبل و علم' کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے :۔

> "اگر وقتی اور ہنگامی شاعری کو ایک ایسی زبردست شخصیت مل جاتی ہے جو اسے ادب کی ابدی قدروں سے مالا مال کر دیتی ہے۔ تو ایسی شاعری پر بھی مہرِ دوام ثبت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ 'طبل و علم' کی نظموں کے ساتھ بھی استثنائی ردِ عمل ہوا ہے اور آزاد کے انفاسِ گرم نے ان میں وہ برقی رَو دوڑا دی ہے جو ادب کے اُفق پر ہمیشہ درخشاں رہے گی "

عنقریب ان کی نظموں کا مجموعہ "بیکراں" شائع ہونے والا ہے جو ان نظموں اور غزلوں

پر مشتمل ہوگا جنھیں ان کی شاعری کا ماحصل کہا جاسکتا ہے۔

آزاد کا فن زندگی سے عبارت ہے اور یہی فن کی عظمت کی کسوٹی ہے۔

وہ اپنے ماحول کے حقائق پر بڑی بے باکی سے تبصرہ کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد جو نیا دَور شروع ہوا ہے اس کے بارے میں ان کی نظم "نیا دور ــــــ نئے رہزن" بہت کامیاب ہے۔

یہ کوئی خاص بڑی بات نہیں ہے اے دوست
چور گلشن سے اگر پھول چرا لیتے ہیں
حادثہ ہے یہ مگر اس پہ تعجب تو نہیں
راہ زن قافلے والوں کو اُڑا لیتے ہیں

---

اس نئے دور میں دیکھے ہیں وہ رہزن ہم نے
جو بہاروں کو گلستاں سے چرا لے جائیں
دیں نگاہوں کو جو دھوکا تو پتہ بھی نہ چلے
اور ضوِ انجم تاباں سے چرا لے جائیں

---

اس طرح ان کی نظر پھول پہ ڈاکہ ڈالے
پھول موجود رہے پھول میں خوشبو نہ رہے
حرص کی آنکھ سے وہ تیری طرف دیکھ جو لیں
تیرا پیکر رہے موجود مگر تو نہ رہے

---

قعرِ دریا میں اُتر جائیں تو انجام یہ ہو
قعرِ دریا میں صدف تو رہے گوہر نہ رہے
اور مائل جو ترے ذہن پہ ہوں ان کا دماغ
ذہن میں تیرے غرض تو رہے جوہر نہ رہے

# لغات

| | | | |
|---|---|---|---|
| اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری کلاں | مرتبہ: مولوی عبدالحق | قیمت | -/۳۰ |
| " " " " خورد | " " " | " | -/۱۲ |
| پریکٹیکل " " " | " " " | " | -/۶ |
| اسٹوڈنٹس لیٹسٹ پریکٹیکل ڈکشنری (انگلش اردو) | | " | -/۱۲ |
| جیم آکسفورڈ پاکٹ ڈکشنری ( " " ) | | " | -/۳ |
| اُردو انگلش ڈکشنری | مرتبہ: رام نرائن لال، الہ آباد | " | -/۸ |
| فیروزاللغات اُردو کلاں (ہندوستانی) | مولوی فیروزاحمد | " | -/۱۲ |
| " " " خورد ( " ) | " " | " | ۶/۷۵ |
| اُردو ادبی لغت | نور محمد | " | -/۸ |
| فرہنگ عامرہ (اُردو) | عبداللہ خویشگی | | ۷/۵۰ |
| کریم اللغات ( " ) | مولوی کریم الدین | | -/۲ |
| فرہنگ آصفیہ مجلد (صرف حصہ اوّل) | سرسیداحمد دہلوی | | -/۴۰ |
| لغات کشوری (فارسی) | مولوی سید تصدق حسین رضوی | | ۸/۵۰ |
| فیروزاللغات ( " ) | مولوی فیروزاحمد | | -/۲۰ |
| اربع عناصر اردو، فارسی، عربی، انگریزی لغت | | | ۵۰/- |
| مصباح اللغات عربی اردو | مرتبہ: ادارہ برہان | | -/۱۶ |
| ڈکشنری مضامین القرآن | " شوکت علی فہمی | | -/۲۰ |
| غریب القرآن (ڈکشنری قرآن مجید) | " مرزا ابوالفضل | | -/۱۸ |

لغات النساء (خواتین کی زبان ان کے محاورات، اصطلاحات اور ضرب الامثال کی لغت) ۷/۵۰

فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں حصہ اوّل ۲/۲۵، دوم ۲/۲۵، سوم ۲/۲۵، چہارم ۱/۷۵، پنجم ۲/۲۵، ششم ۲/۵۰، ہفتم ۲/۷۵، ہشتم ۲/۵۰

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ جامع مسجد۔ دہلی ۶

بیکل اتساہی

# غزل

نہ بیانِ کیف و مستی نہ حدیثِ دلبراں ہے
غمِ آگہی سے شاید ابھی عشق سرگراں ہے

یہ عجیب ہے زمانہ کہ چمن سے مے کدے تک
نہ کہیں سکونِ دل ہے نہ کہیں نشاطِ جاں ہے

ترے لطف کی حکایت ترے جور کا فسانہ
وہ نصیبِ دشمناں ہے یہ نصیبِ دوستاں ہے

مری بے دلی سلامت کہ یہ حال ہے قفس میں
نہ خیالِ بال و پر ہے نہ تو فکرِ آشیاں ہے

نہ حرم کی آرزو ہے نہ غرض ہے بت کدے سے
مری جستجو کا حاصل ترا سنگِ آستاں ہے

مرے ذوقِ جستجو کو کوئی کیا سمجھ سکے گا
کہ ہنوز کہکشاں بھی مری گردِ کارواں ہے

(بشکریہ صبح امید بمبئی)

ساجدہ عابد

# خلیل خاں

تم کبھی خلیل خاں سے ملے ہو؟
نہیں تو۔
اگر نہیں ملے تو آؤ آج ان سے ملا دوں، سامنے کی سڑک...... سے دائیں جانب مڑ جاؤ۔ بائیں جانب تیسرا گھر ان ہی کا ہے۔
تم گھر کا پتہ بتا رہے ہو یا ان سے ملا رہے ہو؟
اجی سنو تو۔ بات جب تک پوری نہ ہو بیچ میں نہ بولا کرو۔
اچھا بھئی، تم ان سے اتنی دل چسپی کیوں رکھتے ہو؟
اس لیے کہ انھیں ساری دنیا کے انسانوں سے دل چسپی ہے۔ تو پھر کیوں نہ دنیا ان سے دل چسپی لے۔ اس کے علاوہ وہ ہیں بھی بڑے دل چسپ آدمی۔
ہاں تو شروع کرو ایک، دو، تین۔
میں آنکھ مچولی تھوڑا ہی کھیل رہا ہوں۔
انسانوں سے ملنا ملانا، لڑنا لڑانا دوسروں سے ان کی خوبیاں بیان کرنا یہ بھی ایک آنکھ مچولی ہے۔
اچھا تو یوں سمجھو کہ تم چور ہو اور خلیل خاں کو ڈھونڈھ رہے ہو۔ پٹی تو آنکھوں پر بندھی ہوئی نہیں ہے۔ مگر ان سے ملنے کے بعد بڑی سی موٹی پٹی آنکھوں پر ضرور باندھی جائے گی۔
کیا مطلب ــــ
یہی کہ پھر تم ان کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھا کرو گے جس طرح بند آنکھوں والا انسان بھٹکتا پھرتا ہے اسی طرح تم بھی ان سے مل کر بھٹکنے لگو گے۔
تو پھر ان کو دور ہی سے سلام۔

نہ نہ سلام نزدیک سے کرو تو لطف آئے۔ وہ لوگوں کی آنکھوں پر رنگ کی عینک چڑھا دیں تو دنیا کو اسی رنگ کے انسان نظر آتے ہیں۔

تو کیا ان کے پاس کوئی جادو ہے۔

جادو سے بڑھ کر ان کا کھیل نرالا ہے۔ دن رات رام نام جپتے ہیں اور بھگوان کو خوش کرنے کے لیے انھوں نے ایک کنٹریکٹ کیا ہے۔ دنیا والوں کے تمام چھپے ڈھکے کرتوت کی رپورٹ تیار کرتے ہیں اور بھگوان تک پہنچاتے ہیں۔ بھگوان کی کرپا سے سی۔ آئی۔ ڈی۔ کا کام کرتے ہیں۔

پھر تو بڑے خطرناک ہیں۔

نہیں تو خطرناک اس لیے نہیں ہیں کہ ان کی جتنی رپورٹیں تیار ہوتی ہیں وہ سب جھوٹی ہیں اور بھگوان نے انھیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ مرنے والے کو تنکے کا سہارا چاہیے۔ خلیل خاں کو دوسروں کے اعمال کا سہارا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کے سہارے وہ سیدھے جنّت میں پہنچ جائیں گے۔ جنّت میں!

جنت دوسروں کے ذریعہ حاصل کرنا کوئی کمال تو نہیں۔

کمال کیوں نہیں کوئی اپنے عمل سے جنّت حاصل کرتا ہے کوئی دوسروں کے ذریعہ پہنچتا تو سبھی کو ہے۔ کوئی سیدھی سڑک سے جاتا ہے کوئی ٹیڑھی۔

ٹیڑھی سڑک سے پہنچنے میں خطرہ ہے۔

خطرہ کی بھی ایک ہی کہی! اجی خطرہ ان کے پاس پھٹکنے نہیں پاتا کیوں کہ اس دشوار گزار گھاٹی میں وہ دوسروں کو پھنساتے ہیں اور خود دور سے تماشہ دیکھتے ہیں۔

واقعی بڑے عجیب انسان ہیں۔

اس میں کوئی شک تھوڑا ہی ہے۔ ارے وہ دیکھو وہ خود چلے آ رہے ہیں مجھے ان سے ملانے کی ضرورت نہیں وہ خود اپنا آپ تعارف ہیں۔

آداب عرض ہے،

آداب عرض ہے۔

خیریت۔

اجی میاں مجھ سے کیا خیریت پوچھتے ہو اپنے پڑوسی لالہ جی سے پوچھو۔

محلہ میں اتنا بڑا حادثہ ہو گیا، آپ کو اب تک خبر نہیں۔
نہیں تو کیا کوئی بم پھٹا۔
بم سے بڑھ کر زبردست دھماکہ ہوا۔
کیا زلزلہ آیا۔
زلزلے کی بھی ایک ہی کہی۔
آخر بات کیا ہے۔
بات معمولی بھی نہیں۔ چھوٹی بھی نہیں۔ اچھی بھی نہیں۔
آخر۔
یہی کہ ــــ
آپ رُک کیوں گئے۔
زبان نہیں اٹھتی۔
فرمایئے فرمایئے۔ ہمارے کان سننے کے لیے بے تاب ہیں۔
لالہ جی کی بڑی لڑکی فرمائش خاں کے خانساماں کے ساتھ فرار ہو گئی۔
فرار ہو گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔
جی ہاں فرار ہوئی اور پراسرار طریقے پر۔ کل میں لالہ جی کے گھر کے پاس سے گزر رہا تھا دیکھا کہ گھر میں ہنگامہ بپا ہے۔ رونا دھونا سر پیٹنا میں نے سوچا خیر تو ہے۔ چلتے چلتے رک گیا۔ اندر پہنچا۔ ڈرائنگ روم میں سارا سامان الٹ پلٹ تھا۔ گل دان ٹوٹا ہوا۔ چیزیں بکھری ہوئی اور اندر ماتم۔
ماتم ــــ؟
جی ہاں ــ ماتم۔ لالہ جی کی سیٹھانی سینہ کوٹ رہی تھیں۔ میں نے دستک دی سیٹھانی جی آئیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ لالہ جی بُری طرح زخمی ہو کر بستر پر آخری سانسیں لے رہے ہیں ان کے پاس پہنچا۔ سر پھٹا ہوا۔ پٹی بندھی ہوئی۔ شکل سمجھ میں نہ آتی تھی۔ مجھے بھی نہیں پہچانا۔ معلوم ہوا خانساماں رات میں مع دس غنڈوں کے گھر میں گھس آیا لڑکی تو تیار تھی ہی۔ ماں باپ جاگے۔ لڑائی ہوئی لڑکی کو بچانے کے لیے لالہ جی نے ریوالور چلایا۔ ایک غنڈہ مرا۔ پھر کیا تھا سب نے مل کر اس کی درگت بنا دی۔ میرا تو خیال ہے ان کی حالت کل بگڑی ہوئی تھی

اب وہ سدھار بھی چکے ہوں گے۔ اِنَّا لِلّٰہ ......... بے چارے بڑے اچھے آدمی تھے۔
بڑے ہمدرد۔ خلوص و محبت والے مگر قرض دار۔ بال بال قرضہ میں جکڑا ہوا دن رات پریشان'
اور یہ قرضہ بچوں کی وجہ تھا۔

مگر صاحب۔ لالہ جی تو خود دوسروں کو قرض دیا کرتے تھے۔

اجی میاں۔ تم لونڈے ہو تمھیں کیا خبر۔ دوسروں سے قرض لے کر تیسرے کو دیتے تھے
بے چارے لالہ جی۔ توند تو بہت بڑی تھی۔ جن لوگوں کی توند بڑی ہوتی ہے تا وہ بہت کنجوس مکھی
چوس ہوتے ہیں' روپیہ جمع کرتے ہیں ا ہر اسی لیے تجوری ہمیشہ بھری رہتی تھی۔

مگر جناب ابھی آپ نے فرمایا کہ وہ قرض دار تھے۔

ہاں ہاں تو کیا ہوا اپنا پیسہ محفوظ رکھ کر دوسروں کا پیسہ لینا، اترانا، اور دوسروں کو
ڈبونا بہت سارے لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے یہی صفت ہمارے دوسرے پڑوسی رائے بہادر
کی بھی ہے۔

مگر صاحب وہ دیکھیے لالہ جی تو ———

ارے ہاں شکر ہے، سلامت ہیں۔ آئیے لالہ جی۔

نمستے خلیل خاں صاحب۔

اجی نمستے لالہ جی۔ آپ سے ملیے۔ یہ ہمارے محلہ کے بڑے لالہ ہیں۔ بڑے اچھے آدمی
ہیں۔ ان کا دل تو ہیرا ہے ہیرا۔ محلہ بھر میں چراغ لے کر ڈھونڈھیے تو لالہ جی کی طرح کے انسان
نہ ملیں۔ ہاں تو میں رائے بہادر کی حقیقت بیان کر رہا تھا۔

کون رائے بہادر۔

اجی لالہ جی وہی جو ہمارے پڑوسی ہیں۔ بڑے رائے بہادر بنے پھرتے ہیں۔ ظاہر میں
ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں۔ مگر ان پر تو وہی مثال صادق آتی ہے کہ ....... اندر مٹی
و بر چونہ۔

مگر ان کی آبائی جائیداد ہے۔

آبائی جائیداد تھی ایک زمانے میں اب کہاں رہی۔

شراب پینے والوں کے پاس کہیں روپیہ رہا ہے۔

شراب!!

جی ہاں شراب۔ دن رات چڑھایا کرتے ہیں۔ جام پر جام لنڈھاتے ہیں۔ سارا روپیہ اسی میں پھونک ڈالا۔

مگر خلیل خاں وہ تو بڑے اچھے منش ہیں۔

لالہ جی منش ہیں تو اور بھی خراب بات ہے۔

صاحب منش ہندی لفظ ہے اور اس کے معنی انسان کے ہیں۔

توبہ توبہ۔ منش عربی کا بھی لفظ ہے اور فارسی کا بھی اور اس زبان میں اس کے معنی آوارہ، بدمعاش اور اوباش کے آتے ہیں۔ لالہ جی میں وہی سمجھا۔

جی نہیں صاحب۔ منش عربی اور فارسی کا لفظ نہیں ہے۔

اجی لالہ جی کبھی میری لائبریری آیئے تو عربی کی لغت میں بتادوں۔

آپ کے پاس لائبریری بھی ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔

خوب! لائبریری تو میری جان ہے۔

تو صاحب چلیے آپ کا گیٹ تو سامنے ہی ہے وہیں چلیں۔ لغت دیکھ لیں پھر بیٹھ کر باتیں کریں۔

لائبریری اس گھر میں کبھی تھی مگر جب کتابیں خوب ہوگئیں تو ان کو تین جگہ منتقل کرنا پڑا۔ کئی کتابیں سالار جنگ نے خرید لیں۔ کئی کتابیں کتب خانہ آصفیہ میں بکیں اور یونی ورسٹی میں بھی میں نے بہت ساری کتابیں.. بیچ ڈالیں۔ ان ہی کتابوں کے پیسے سے میں نے انگلستان کا سفر کیا تھا۔

آپ انگلستان بھی گئے تھے۔

جی ہاں پہلے نہیں گیا سو چا اب اتنا قریب آہی چکے ہو تو کیوں نہ انگلستان بھی دیکھ لو۔ لہذا چلا گیا، بورنیو، تبت اور کشمیر سے ہوتے ہوئے انگلستان پہنچا۔ انگلستان بڑا ہی گرم ملک ہے۔ اس سے ہمارا ہندوستان ٹھنڈا ہے۔ لالہ جی ہندوستان جنت ہے جنت۔ جی ہاں جہاں آپ جیسے انسان بستے ہوں وہ جنت نہیں تو اور کیا ہوگا۔

جنت میں اور کیا خوبی ہے بھلا۔ اچھا خلیل خاں صاحب ہمیں اجازت دیجیے ضروری کام سے جارہا تھا۔ باتوں میں لگ گیا۔

کہاں جارہے ہیں آپ۔

عابد شاپ۔

مجھے بھی عابد شاپ جانا ہے چلیے میں بھی چلوں۔

آپ عابد شاپ کیوں جارہے ہیں۔

ہمارا ملازم کل سے سخت بیمار ہے۔ رات بچنے کی اُمید نہ تھی ڈاکٹر نے آکر انجکشن دیا۔ وہ کہتا تھا کہ ملازم سے اتنی ہمدردی اس نے آج تک نہ دیکھی نہ سنی تھی اور وہ بھی کیسا ملازم۔ چور، ڈاکو، لٹیرا۔ اس نے میرا روپیہ نہیں لیا بلکہ محلہ کی بہت ساری لڑکیوں کا اغوا کیا۔ کیا بتاؤں لالہ جی باہر کا کمرہ ہے نا دہاں، ایسے ایسے نظارے دیکھے کہ خدا ہی جانتا ہے۔ ان آنکھوں سے کن کن شریف بہو بیٹیوں کو آتے دیکھا ہے توبہ توبہ قیامت قریب ہے۔ خدا کا قہر نازل ہونے والا ہے یہ جو گرمی ہے نا یہ قہر ہی تو ہے ہاں تو ایسے ملازم کے ساتھ اتنی ہمدردی۔ ڈاکٹر حیران تھا مگر انسان ہونے کی حیثیت سے میرا دل پسیج گیا۔ بے چارہ میری بھینس کی رکھوالی کرتا ہے۔ دودھ میں پانی ملا کر بیچتا ہے اور پیسے بیچ کھاتا ہے۔ خیر برائیاں تو بہت ہیں اس میں مگر میرا ملازم ہے نا وہ آج کل بڑا فریش ہے بستر سے اٹھ نہیں سکتا۔ اس کے لیے دوا لینے جارہا ہوں۔

اجی خلیل خاں صاحب۔ آپ کا ملازم تو مجھے ابھی راستہ میں ملا تھا۔ سودا لینے جارہا تھا۔

اچھا ہو گیا ہوگا جتنا میرا مال کھاتا ہے اتنا ہی وفادار بھی ہے گھر پھونک دے مگر میں تو اسے آخری دم تک نہیں نکالوں گا۔

بڑی خوبیوں کے مالک ہیں آپ۔

لالہ جی بھلا مجھ میں خوبیاں کہاں۔

اتنی انکساری نہ کیجیے۔ اچھا چلیے مجھے دیر ہورہی ہے۔

چلیے۔

خدا حافظ۔

خدا حافظ۔

مل چکے پڑوسی سے۔

ہاں خلیل خاں ڈاکٹر بھی معلوم ہوتے ہیں۔

جی ہاں دوسروں کے ناسور چھیڑ کر اس سے خون بہاتے ہیں اور مرہم پٹی کرتے ہیں زخم کو کبھی بھرنے نہیں دیتے۔ دوا کی بجائے نمک چھڑکا کرتے ہیں اور صاحب ساتھ ساتھ فاختہ بھی خوب اڑاتے ہیں۔

●● (بشکریہ "صبا" حیدرآباد)

## شرابِ کہنہ

# شیفتہ

۱۸۰۶ء ——————— ۱۸۶۹ء

نواب محمد مصطفا خاں، تخلص شیفتہ (اُردو) حسرتی (فارسی) ان کے دادا ولی داد خاں فرخ سیر کے عہد میں کوہاٹ سے ہندوستان آئے اور فرخ آباد میں مقیم ہوگئے۔ والد نواب مرتضا خاں ایک دور اندیش اور صاحب تدبر لوگوں میں سے تھے اسی بنا پر ملک کے بہاں بڑے رسوخ تک پہنچے، انگریزوں سے پنجاب میں جاگیر ملی، جہاں گیر آباد (ضلع بلند شہر) کا علاقہ اور جائداد خریدی۔

نواب مصطفا خاں دہلی میں پیدا ہوئے، وقت کے بہترین اساتذہ اور علماسے تعلیم و تربیت حاصل کی، عربی اور فارسی میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے اُردو کے کلام پر مومن سے اور فارسی میں غالب سے اصلاح لی، تینتیس[۳۲] برس کے سن میں مکروہات اور ممنوعات سے تائب ہوکر پاک بازی کی زندگی اختیار کرلی، اسی زمانے میں حج کرنے گئے واپس آنے کے بعد شعروشاعری میں کم اور اوراد وظائف میں زیادہ وقت صرف کرنے لگے شیفتہ کا مرتبہ سخن روی میں اتنا بلند نہیں جتنا سخن فہمی، سخن سنجی اور نقد و نظر میں، ان کے تمام عصر صہبائیؔ، علویؔ، آزردہؔ، نصیرؔ، ذوقؔ اور عیشؔ ان کے اس وصف کے ہم معترف اور معترف ہیں حالیؔ اور غالبؔ تو ان کے بہت ہی مداح اور قائل تھے۔

۱۸۵۷ء کے معرکے میں نواب شیفتہ کو بھی طرح طرح کے ذہنی، جسمانی اور مالی اذیتیں اور نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ گھر لٹا، جاگیر ضبط ہوئی، سرمایۂ سخن اور اک نادر کتب خانہ تلف ہوا، انگریزوں کی قید و بند کی سختیاں جھیلیں مگر ہر حال میں صابر و شاکر رہے۔

"گلشن بے خار" شیفتہ کی مشہور تالیف ہے، فارسی زبان میں اردو شاعروں کا تذکرہ جسے انھوں نے تیس[۳۰] برس کی عمر میں ترتیب دیا تھا، اپنی بعض خوبیوں اور خصوصیتوں کی وجہ

سے آج بھی سند اور حوالے کا کام دیتا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے ان کا کلیات (جس میں اردو فارسی نظم و نثر سب شامل ہے) طبع ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں بھی لاہور سے اردو کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔

شیفتہ نے غزل کے سوا اور کسی صنف سخن پر طبع آزمائی نہیں کی، ان کی زبان صاف اور بامحاورہ ہے، خیالات میں پاکیزگی ہے، سادہ بیانی، متانت، اخلاق و تصوف اور بلند مضامین ان کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔

## انتخاب

دیکھتے ہم بھی کہ آرام سے سوتے کیوں کر — نہ سنا تم نے کبھی ہائے فسانہ دل کا
ہم سے پوچھیں کہ اسی کھیل میں کھوئی ہے عمر — کھیل جو لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا
خوبیٔ بخت کہ پیمانِ عدو! — اس کو ہنگامِ قسم یاد آیا!
دو قدم یاں سے وہ کوچہ ہے مگر — نامہ بر صبح گیا شام آیا
شیفتہ! ضبط کرو، ایسی بھی کیا بےتابی — جو کوئی ہو، تمھیں احوال سنانا دل کا
کون کہتا ہے کہ ظلمت میں کم آتا ہے نظر — جو نہ دیکھا تھا سو ہم نے شبِ ہجراں دیکھا
دامن تک اس کے ہائے نہ پہنچا کبھی وہ ہاتھ — جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنا دیا
حسرت سے اس کے کوچے کو کیونکر نہ دیکھیے — اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا
کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر — کیا کوئی اور ستم یاد آیا
یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی — صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا
ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام — بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

---

یاد نے جس کی بھلایا سب کو — اس کی میں یاد بھلاؤں کیوں کر

---

اے تابِ برق، تھوڑی سی تکلیف اور بھی — کچھ رہ گئے ہیں خار و خسِ آشیاں ہنوز

---

دل کا گلہ، فلک کی شکایت یہاں نہیں — وہ مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں

اس نوبہارِ حسن کو بدنام کرو　　تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

---

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں　　گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
آخر جہاں میں شب تار یک بھی تو ہے　　اچھا نہ آئیں آپ شب ماہتاب میں

---

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ　　طاعت میں کچھ مزا ہے، نہ لذّت گناہ میں

---

ہر شکوے سے ٹپکے ہے ادا ناز تو دیکھو　　ہر بات میں اک بات ہے انداز تو دیکھو

---

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت　　دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

---

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

---

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں، پر کچھ کچھ　　بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لیے

---

ناصح تری زبان، ترے بس میں جب نہ ہو　　انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے
بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر　　یہ اہلِ مروّت ہیں تقاضا نہ کریں گے
تذکرہ صلح کا کرو نہ کرو!　　بات اچھی نہیں لڑائی کی!!
دل لگایا تو ناصحوں کو کیا　　بات جو اپنے جی میں آئی کی

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے ■■

---

**ضروری تصحیح**

افسوس کتاب نما کے جون ۶۳ء کے شمارے میں "شراب کہنہ" کے عنوان کے تحت مرزا دبیر کی ایک رباعی، کتابت کی غلطی کی وجہ سے غلط شائع ہو گئی۔ صحیح رباعی اس طرح ہے:

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں　　منہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل　　اس واسطے [illegible]

# اُردو کا کلاسیکی ادب

## (پاکستانی مطبوعات)

| کتاب | مصنف | مرتب | قیمت |
|---|---|---|---|
| مذہبِ عشق | از نہال چند لاہوری | مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی | ۲/- |
| قواعدِ اُردو | مشہور بہ رسالۂ گل کرسٹ | 〃 〃 〃 〃 | ۲/- |
| بہارِ دانش | از مرزا جان طپش | 〃 〃 〃 〃 | ۳/- |
| نورتن | از محمد بخش مہجور | 〃 〃 〃 | ۵/۷۵ |
| یادگارِ غالب | از خواجہ الطاف حسین حالی | 〃 〃 〃 〃 | ۹/- |
| دیوانِ درد | حالاتِ زندگی اور کلام پر مبسوط تبصرہ | 〃 〃 〃 〃 | ۳/۵۰ |
| سروشِ سخن | از سید محمد فخر الدین حسین سخن | 〃 〃 〃 〃 | ۹/- |
| آرائشِ محفل | از میر شیر علی افسوس | 〃 کلب علی خاں فائق | ۸/- |
| مہتابِ داغ | نواب میرزا خاں داغ دہلوی | 〃 سید سبطِ حسن | ۴/۵۰ |
| ابن الوقت | ڈپٹی نذیر احمد | 〃 〃 〃 〃 | ۳/۵۰ |
| مرقعِ لیلیٰ مجنوں | از مرزا ہادی رسوا | 〃 عشرت رحمانی | ۳/۵۰ |
| وکرم اُروسی | از مہاکوی کالی داس | ترجمہ 〃 | ۱/۷۵ |
| فردوسِ بریں | عبد الحلیم شرر | مرتبہ وقار عظیم | ۲/- |
| جوہرِ اخلاق | از جیمز فرانسس کارکرن | 〃 پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر | ۱/۵۰ |
| موعظۂ حسنہ | ڈپٹی نذیر احمد کے سبق آموز خطوط کا مجموعہ | مقدمہ پروفیسر افتخار احمد صدیقی | ۴/- |
| فسانۂ مبتلا | ڈپٹی نذیر احمد | مرتبہ 〃 〃 〃 | ۴/۵۰ |
| امراؤ جان ادا | از مرزا رسوا لکھنوی | 〃 ظہیر فتح پوری | ۵/- |
| سوانحِ مولانا رُوم | از شبلی نعمانی | 〃 سید عابد علی عابد | ۲/۵۰ |
| حیاتِ سعدی | از خواجہ الطاف حسین حالی | 〃 شیخ محمد اسماعیل پانی پتی | ۲/۵۰ |
| مسافرانِ لندن | سرسید احمد خاں | 〃 〃 〃 | ۳/- |

اخلاق ہندی از میر بہادر علی حسینی مرتبہ کارکنان مجلس ترقی ادب ۳/-
توتا کہانی از حیدر بخش حیدری " " " ۲/۵۰
قصص ہند از محمد حسین آزاد " " " ۲/-
خرد افروز از حفیظ الدین احمد " " " ۲/۵۰
رسوم ہند از پیارے لال شوب کپتان ڈبلیو جے ہالرائیڈ مرتبہ " " ۳/۵۰
مقالات سرسید از سرسید احمد خاں (۱۳ حصے) " شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی ۵۲/-
جامع الحکایات ہندی از شیخ صالح محمد عثمانی " پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر ۳/-

# پاکستانی رسائل

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| نقوش | پطرس نمبر | ۷/- | نگار | خدا نمبر | ۳/- |
| " | شوکت نمبر | ۷/- | سویرا | نمبر ۲۷ | ۲/- |
| " | ادب عالیہ نمبر | ۱۲/- | " | نمبر ۲۸ | ۴/- |
| " | لاہور نمبر | ۱۵/- | " | نمبر ۳۲ | ۳/- |
| " | افسانہ نمبر | ۸/- | " | نمبر ۳۳ | ۳/- |
| افکار | افسانہ نمبر (تازہ) | ۳/- | نقش | مارچ ۶۱ء | ۱/- |
| " | عام شمارہ نمبر ۱۴۷ | ۱/- | " | فروری ۶۱ء | ۱/- |
| " | " نمبر ۱۵۱ | ۱/- | " | اپریل ۶۱ء | ۱/- |
| نگار | ہندی شاعری نمبر | ۴/- | اُردو نامہ | جنوری تا مارچ ۶۳ء | ۱/- |
| " | نظیر اکبر آبادی | ۳/- | " | اکتوبر تا دسمبر ۶۲ء | ۱/- |
| " | اقبال نمبر | ۳/- | " | جنوری تا مارچ ۶۴ء | ۱/- |
| " | مصحفی نمبر | ۳/- | | نقوش آپ بیتی نمبر | ۲۰/- |
| نگار کے تذکروں کا تذکرہ نمبر | | ۲/- | | افکار افسانہ نمبر | ۳/- |

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ۔ ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی ۳

# نئی مطبوعات

| کتاب | مصنف | قیمت | ناشر |
|---|---|---|---|
| ماہ جبیں (ناول) | زبیدہ سلطانہ | ۴/۵۰ | ناشر ادبی دنیا، دہلی |
| رُبابی (〃) | عذرا جمال | ۶/۷۵ | 〃 〃 〃 〃 |
| اسلام کے مشہور سپہ سالار (تاریخ) | عبدالواحد سندھی | ۳/۷۵ | 〃 سہیل پبلشنگ ہاؤس، دہلی |
| دل ایک سمندر (ناول) | انیس مرزا | ۵/- | 〃 〃 〃 〃 |
| برف بنی انگارے (〃) | اندرجیت سنگھ تلسی | ۶/۷۵ | 〃 آرٹس اینڈ لیٹرس، دہلی |
| کلنلنی (〃) | گلشن نندہ | ۴/- | 〃 پنجابی پُستک بھنڈار، دہلی |
| دہلیز (〃) | عارف مارہروی | ۴/۷۵ | 〃 〃 〃 〃 |
| مادھوئی (〃) | گلشن نندہ | ۲/- | 〃 〃 〃 〃 |
| حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ (سوانح) | اسلام اللہ صدیقی | ۱/۲۵ | 〃 مکتبہ انسانی برادری لکھنؤ |
| شمشیر حیات (افسانے) | نجم فضلی | ۵/- | 〃 مکتبہ ماحول، کراچی |
| شہر فرہاد (غزلیں دوسرا ایڈیشن) | عدمؔ | ۴/- | 〃 〃 〃 〃 |
| آغوشِ خیال (مجموعہ کلام) | آزاد گلاٹھی | ۳/- | 〃 مکتبہ اُردو ادب |

## زیرِ طبع

| کتاب | مصنف | قیمت | ناشر |
|---|---|---|---|
| سپنوں کا قیدی (افسانے) | کرشن چندر | | 〃 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی |
| پت جھڑ کی آواز (〃) | قرۃ العین حیدر | | 〃 〃 〃 〃 |
| تاریخ الامت ہشتم (اسلامی تاریخ) | مولانا اسلم جیراج پوری | | 〃 〃 〃 〃 |
| سخن در سخن (غزلیں) | اعجاز صدیقی | | 〃 شاعر، بمبئی |
| صندل اور گلاب (پنڈت نہرو پر اردو شعراء کی تخلیقات) | مرتبہ وفا اعظمی | ۲/- | بریز سروسیز، کرلا |
| سحر ہونے تک | آغا جانی کاشمیری | | تاج آفس بک ڈپو، بمبئی |

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## روح اور اس کی ماہیت

(سن اشاعت ۱۹۶۳ء)

از: سید فرخ حیدر
صفحات: ۴۸ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$
قیمت: درج نہیں ہے۔
پرنٹر: سرفراز قومی پریس، لکھنؤ

سید فرخ صاحب نے ۴۸ صفحات کے اندر روح اور اس کی ماہیت بیان کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ اس کتابچہ کی تیاری میں ان کے پیش نظر دو تین انگریزی کتب رہی ہیں۔ یہ موضوع فلسفۂ یونان ہی میں نہیں بلکہ اس سے بھی قبل زیر بحث رہ چکا ہے۔ مافوق الطبعیات مضامین نے ہمیشہ فکر انسانی کو للکارا ہے اور اس مادیت کے دور میں بھی ایسے مباحث کم از کم خواص کی دلچسپی کا باعث ضرور ہیں۔

یہ تو عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ روح مادہ نہیں ہے۔ لیکن روح کی ماہیت کیا ہے۔ بقول اکبرؔ ہزاروں سال فلسفہ کی چناں اور چنیں رہی، لیکن بات اب بھی وہیں ہے، جہاں تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے دقیق موضوع کے ساتھ چند صفحات میں انصاف ممکن نہیں ہے بلکہ ایسے مواقع پر بسا اوقات اختصار ذہنی خلفشار کا موجب ہوتا ہے۔ اگرچہ علمی مضامین کے ساتھ اصطلاحات سے نہیں بچا جا سکتا تاہم سید فرخ حیدر صاحب کے بیان میں روانی اور زبان میں توازن موجود ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

---

## راحت

(سن اشاعت ۱۹۶۳ء)

مصنف: جمیل الرحمن منگلوری
صفحات: ۲۰۰ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$
قیمت: تین روپے
ناشر: نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

اس ناول کی ہیروئن شہر کراچی میں مقیم ایک ہندوستانی مہاجر خاندان اور متوسط طبقہ

کی لڑکی "راحت" ہے۔ ہیرو "جاوید" ایک خان بہادر کا بیٹا ہے۔ دونوں ایک ہی کالج میں تعلیم پاتے ہیں۔ دونوں کو مشرقی تہذیب سے بے حد عقیدت ہے۔ یہ ربط بڑھ کر محبت اور پھر ازدواجی زندگی میں بدل جاتا ہے۔

راحت کو اپنے گھر کی اقتصادیات بہتر بنانے کے لیے خان بہادر صاحب کے یہاں پرائیوٹ ٹیوٹرین کر بھی کام کرنا پڑا ہے۔ دونوں خاندانوں کی مالی اور سماجی حیثیت کے فرق نے ازدواجی رشتہ کو ناقابل قبول بنا دیا تھا مگر جاوید نے راحت کے لیے خاندان کو ناراض کیا۔ عیش وعشرت کو چھوڑا۔ اپنی پھوپی کی بیٹی شاہین کو ٹھکرا دیا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مغربی تمدن کی دلدادہ تھی۔ اسی طرح راحت کے حسن دلبری نے اپنے کلاس فیلو، ذہین اور کافی سرمایہ دار لڑکوں کو جاوید کی خاطر مایوس کر دیا تھا۔

راحت، نہایت سلیقہ مند اور کفایت شعار لڑکی ہے۔ لیکن راحت اپنی دوشیزگی اور تعلیم کے دوران اپنے باپ، خان بہادر، سن رسیدہ خواتین کو مذہبی اصولوں کی تلقین کرتی ہے۔ اپنی شادی شدہ سہیلیوں کو ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کے راز بتاتی ہے تو عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ہیروئن کا کردار نہیں ہوتا۔ راحت ایک تبلیغی ہیروئن بن جاتی ہے۔

اس کتاب میں ناول نگار ہر باب میں تمام کرداروں سے آگے نظر آتا ہے یہی اس ناول کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

ہیروئن کے کردار کی بعض خصوصیات متوسط طبقہ کی لڑکیوں کے لیے یقیناً سبق آموز ہیں۔ کہانی میں دلچسپی قائم رہتی ہے اس لیے توقع ہے کہ ناول پسند کیا جائے گا۔

کتاب کی لکھائی چھپائی اچھی ہے۔

سیفی پریمی

---

## آب خضر

(سن اشاعت ۱۹۶۳ء)

مرتب: کرامت علی کرامت

صفحات: ۱۷۶ سائز: ۲۰×۳۰/۱۶

قیمت: تین روپے

ناشر: اڑلیسہ اردو پبلشر دیوان بازار کٹک (اڑلیسہ)

اڑلیسہ ہندوستان کا دورافتادہ ساحلی علاقہ ہے۔ جس کی زبان اڑیہ ہے لیکن اس میں تقریباً دو فی صد اردو بولنے والے بھی ہیں۔ آب خضر اڑلیسہ کے قدیم و جدید شعرا کا مختصر مگر اہم تذکرہ ہے۔

تذکرہ نویسی صنف سخن کا مشکل ترین پہلو ہے اس میں جانب داری سے دامن بچاکر گزر جانا بہت مشکل کام ہے۔ پھر بھی کرامت صاحب نے "آب خضر" مرتب کر کے حق وطنیت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی بھی خدمت انجام دی ہے۔

'آب خضر' تذکروں کی عام روش سے ہٹ کر ایک کوشش ہے جس میں کرامت صاحب ایک حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر شعراء کے حالات کے ساتھ ہی انتخاب کلام بھی دیا جاتا تو قاری کو پڑھنے میں سہولت ہوتی۔

اردو ہندوستان گیر زبان ہے کشمیر سے لے کر کیرل تک اس کے بولنے اور لکھنے والے مل جاتے ہیں ہر جگہ سے ایسے آفتاب اُبھرے ہیں جن کی ضیا نے مقامی طور پر اپنے علاقہ پر کافی گہرے اثرات چھوڑے ہیں اڑیسہ کے قدیم شعرا کے کلام میں بھی مذہبی گہرے رنگ کی چھاپ ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں غزل کا وہ روپ نہیں ہے جو غزل کی جان ہے۔ البتہ دور جدید کے شعراء میں چند شعراء پر ہماری نظر ٹھہر جاتی ہے۔ امجد نجمی اڑیسہ کے مایۂ ناز اور کہنہ مشق شاعر ہیں چند برس پہلے ان کا شعری مجموعہ "طلوع سحر" اہل زبان سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے ان کے ہاں نظم کا شعور بھی ہے اور غزل کا رچاؤ بھی۔ کرامت علی کرامت، جنھوں نے یہ تذکرہ ترتیب دیا ہے۔ ایک ابھرتے ہوئے فن کار ہیں۔

"آب خضر" کے مطالعہ سے جہاں اڑیسہ کی ادبی تحریکات اور رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اردو کی ہمہ گیریت پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے 'آب خضر' ایک کامیاب کوشش ہے جو ہر صاحب علم کے پاس ہونی چاہیے اور لائبریریوں کی زینت بنی چاہیے۔

عشرت کرت پوری

---

## نشاط روح

مرتبہ: مولانا عبدالسلام صاحب
صفحات: ۴۸ سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ۵۰ نئے پیسے
ناشر: کتب خانہ انجمن ترقی اردو - دہلی ۶

بزرگوں کے اقوال اور مواعظ کو شخصیت بنانے، دینی حسن پیدا کرنے، اور عمل کی طرف راغب کرنے کے سلسلے میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ میں کتنے لوگوں کا ذکر ملتا ہے جن کی زندگی کسی صاحب دل کے ایک جملہ ہی سے بدل گئی، اور انھوں نے تاج و تخت کو خیرباد

کہہ کر بوریا نشینی اختیار کرلی، اسی قسم کے کچھ اقوال، حدیثیں اور مواعظ جناب عبدالسلام صاحب بانی مدرسہ مفتاح العلوم خورجہ نے اس کتاب میں جمع کیے ہیں، جن کی تعداد ۱۳۶ ہے۔ ان مقولوں میں قرآنی آیات کے ترجمے، زبور اور توریت کے مقولے، حدیثوں کے ترجمے، اقوال صحابہ، انبیائے سابقین میں سے حضرت ابراہیم اور حضرت عزیر کے بعض مقولے بہت اچھے انداز سے پیش کیے ہیں۔ جن کے مطالعے سے دین کی بنیادی باتوں سے متعلق مفید اور مستند مقولوں کا اچھا خاصا علم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عبادت وریاضت سے لے کر اخلاقیات تک کے مباحث سے متعلق مشہور انبیاء، فلاسفہ، حکما، اور صاحب علم و عمل ہستیوں کے مقولے جمع کردیے گئے ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔
البتہ مؤلف نے مقولے جمع کرنے میں کسی ترتیب کا خیال نہیں رکھا ہے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ جن ہستیوں کے مقولے انھوں نے شامل کتاب کیے ہیں، ان کی ترتیب اس طرح کرتے کہ تاریخی اعتبار سے جو ہستی پہلے گزری ہے اس کا مقولہ پہلے ہوتا اور اس کے بعد والی ہستی کا مقولہ بعد میں، یا عنوانات کے تحت مقولوں کو جمع کرنے کا اہتمام کیا جاتا، اسی طرح بعض جگہ اُردو کا ترجمہ جتنا شگفتہ اور سلیس ہونا چاہیے تھا اتنا نہیں ہے جس کی وجہ سے مقولہ سمجھنے اور اس سے لطف لینے اور فائدہ اٹھانے میں دشواری ہوتی ہے۔ کتاب کم پڑھے لکھے لوگوں اور ثانوی کے طلبہ کے لیے خاص طور سے بہت مفید اور معلومات افزا ہے۔

عبدالحلیم ندوی

---

## بابر ہندوستان میں

(سن اشاعت ۱۹۶۳ء)

از: محمد قاسم صدیقی ایم، اے، بی ٹی
صفحات: ۴۰ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ: احباب پبلشرز، اقبال منزل مقبرہ عالیہ گولہ گنج ۔ لکھنؤ

ہندوستان میں حکومت مغلیہ کے بانی بادشاہ ظہیر الدین بابر کی خودنوشت ضخیم سوانح عمری کا نام تزکِ بابری یا بابرنامہ ہے۔ بابر نے یہ کتاب ترکی زبان میں لکھی تھی۔ بعد میں متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔
صدیقی صاحب نے اس کتاب کے جستہ جستہ اقتباسات کی محدود بنیاد پر یہ کتابچہ

مرتب کیا ہے اور مضمون متن کے ساتھ مشہور و معروف حیوانات وغیرہ کی تصاویر بھی شامل کر دی ہیں۔ جس سے متن کی وضاحت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ کتابچہ بظاہر بچوں کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ زبان اور اسلوب بیان کے لحاظ سے اسے زیادہ مؤثر اور دل چسپ بنانے کی کوشش کی جاتی۔ اور معروف حیوانات کے ساتھ غیر معروف حیوانات و نباتات وغیرہ کی تصویریں بھی مہیا کی جاتیں۔ پھر بھی "بابر ہندوستان میں" بچوں کے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس کے مطالعہ سے بابر کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق بچوں کے دل میں پیدا ہو اور بابر کی زندگی اور اس کے شجاعانہ کارناموں کو پڑھ کر بچے ہمت اور استقلال، اور ذاتی جد و جہد کے بعد حصول کامیابی کا سبق سیکھیں۔

مرتب نے صفحہ ۳ پر لکھا ہے کہ "اس کہانی میں پندرھویں صدی (عیسوی) کے ہندوستان کی جھلک ہے"۔ اس کی جگہ بابر کی پیدائش اور اس کی مہمات کے آغاز کا لحاظ رکھ کر موصوف "سولھویں صدی (عیسوی) میں ہندوستان کی جھلک" تحریر فرماتے تو تاریخی اعتبار سے زیادہ صحیح ہوتا۔ تفصیل سے قطع نظر وضاحت بیان کے لیے متعدد جملوں کی ساخت پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ طبع دوم میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے گا۔ بہر حال مرتب کی پوری ہمت افزائی ہونی چاہیئے تاکہ وہ اس مفید کام کو جاری رکھ سکیں۔

محمد شفیع الدین نیر۔ ایم، اے

## کلید املا

مصنف: خان محمد شیخ

صفحات: ۴۰ سائز: ۱۸×۲۲/۸

قیمت: ۶۵ نئے پیسے

ناشر: خان محمد شیخ، کمرہ ۲۲ واچ میکر چال بھوانی پیٹھ پونا سٹی

شیخ صاحب کو مہاراشٹر میں ایک قابل قدر استاد ہونے کا ممتاز درجہ حاصل رہا ہے۔ آپ کی اس کتاب میں حروف تہجی کے لحاظ سے ذخیرۂ الفاظ مہیا کیے گئے ہیں جس کے پڑھنے اور لکھنے سے صحیح املا کے ساتھ ساتھ ایسے الفاظ نظروں سے گزرتے ہیں۔ جن کے لکھنے میں اکثر و بیشتر طلبا غلطیاں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ کون سے

حروف تحریر میں آتے ہیں اور کون سے درگزر کر دیے جاتے ہیں۔

دوسرے باب میں بھی ذخیرۂ الفاظ ہی ہیں۔ مگر حروفِ تہجی سے نہیں بلکہ اس کی نوعیت کچھ بدلی ہوئی ہے۔ اس باب میں ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ ساتھ سرخیاں قائم کر کے بڑی مفید و کارآمد معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ جس میں تاریخ، جغرافیہ شہریت سائنس و جنرل نالیج (واقفیتِ عامہ) شامل ہیں۔

صرف و نحو کے حصے میں تذکیر و تانیث، جمع واحد، مرکب الفاظ، اسم فاعل، اسم مفعول، ہم معنی الفاظ، متضاد، مشتقات، محاورات نیز حرف کی ابتدائی و ضروری معلومات و تعریف بتلائی گئی ہے۔

اسی طرح مختلف قسم کے خطوط اور ان کے نمونے نیز ایک جدول میں مکتوب الیہ۔ القاب و دعا۔ آداب۔ اختتام کی سرخیوں کے ساتھ طریقۂ خطوط نویسی درج ہیں۔

حصۂ نظم میں ردیف، قافیہ، مطلع وغیرہ کی تعریف و نمونۂ کلام دیے گئے ہیں۔ آخر میں زبان و بیان (تقریر و تحریر) میں استعمال کیے جانے والے مستند استادوں کے مختلف اشعار بھی بہ لحاظ مختلف موضوعات درج ہیں۔

یقین ہے کہ یہ کتاب ابتدائی اور ثانوی مدارج کے طلبا کے لیے مفید اور ان کے اساتذہ کے لیے کارآمد ثابت ہوگی۔

شیخ وزیر مصطفےٰ آبادی (مقیم کاسودہ)

---

(بقیہ خبریں)

یونی ورسٹی میں اردو کے وزیٹنگ پروفیسر ہیں۔

**سب سے وزنی کتاب**

پیرس، دنیا کی سب سے بڑی اور بیش قیمت کتاب جو ۴۰۰ ہنڈریڈ ویٹ وزن رکھتی ہے اور جس کا دس لاکھ ڈالر میں بیمہ کرایا گیا ہے، بحری جہاز "فرانس" پر نیویارک کے عالمی میلے کے لیے روانہ کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نام "اپوکالیپس" ہے۔ اس کے حروف اور تصاویر طلائی ہیں۔ اس کتاب کی نمائش ۱۹۶۱ء سے اب تک متعدد یورپی ممالک میں کی جا چکی ہے۔

# ادبی خبریں

## نہرو پرائز

۳۰ رمئی ۶۴ء محمد علی ہال جامعہ میں، جامعہ برادری کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت شیخ الجامعہ جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب نے فرمائی۔ اس موقع پر محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے "فخر روزگار" کے عنوان سے پنڈت جی کی شخصیت پر ایک مضمون پڑھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے جامعہ سے پنڈت جی کے تعلق پر روشنی ڈالی آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے ایک مختصر تقریر کے بعد اعلان کیا کہ پنڈت جی کے نام پر ایک ہزار روپے کا انعام جامعہ کے اس طالب علم کو دیا جائے گا جس میں زیادہ سے زیادہ وہ خصوصیات موجود ہوں جو پنڈت جی کو عزیز تھیں۔

## تعزیتی جلسہ

بریلی ۲۹ رمئی رائٹرز ایسوسیشن کی طرف سے پنڈت نہرو کی تعزیت میں ایک جلسہ عام ہوا جس میں ملک کے نصف درجن زبانوں کے مصنفین نے پنڈت جی کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ایسوسیشن کا نام بریلی رائٹرز ایسوسیشن سے بدل کر جواہر لال رائٹرز ایسوسیشن کر دیا گیا۔ (کے۔ ٹی۔ احمد مدرسہ مصباح العلوم بریلی)

## مولانا حامد حسن قادری

کراچی ۶ رجون ۶۴ء بروز ہفتہ عصر و مغرب کے درمیان اردو کے مشہور مصنف اور محقق جناب الحاج مولانا حامد حسن صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

## غالب پرائز

حکومت اتر دیش نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" کو حالیہ اردو کتابوں میں سے بہترین قرار دیتے ہوئے ڈیڑھ ہزار روپے کا غالب پرائز دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس کتاب میں اردو مثنویوں کی ہندوستانی بنیاد کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان مثنویوں سے مفصل بحث کی گئی ہے جن کے قصے ہندوستان کی عوامی اور تاریخی روایتوں سے لیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ آج کل امریکہ کی وِس کانسن


| فی پرچہ ۱۰ پیسے | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ | سالانہ چندہ ایک روپیہ |
| --- | --- | --- |

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے کوہ نور پریس ... سوئیوالان دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

ایڈیٹر
ایجان احمد عباسی

مجلس ادارت
غلام ربانی تاباں

جلد نمبر ۵ | اگست ۱۹۶۴ء | شمارہ نمبر ۸

# اشاریہ

جامعہ کے مدرسے اور کالج گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کھل گئے ہیں اور جامعہ نگر کی بستی میں پھر وہی رونق اور چہل پہل شروع ہو گئی ہے۔ نئے تعلیمی سال کے آغاز نے مکتبہ جامعہ کی مصروفیت میں بھی اضافہ کر دیا ہے اور اسی لیے آج کل غیر درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ درسی کتابوں کی تیاری اور روانگی کا کام زور شور سے جاری ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس مصروفیت کے باوجود ہمارے اعلان کے مطابق بچوں کا مشہور رسالہ "پیام تعلیم" جولائی کے آخری ہفتے میں نہایت آب و تاب اور شان و شوکت کے ساتھ منظر عام پر آگیا ہے اور ہر جگہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔

جیسا کہ جون ۶۴ء کے کتاب نما میں ہم نے ایک جگہ ذکر کیا تھا، مکتبہ جامعہ نے آسان ہندی زبان میں بھی بچوں کے لیے مذہبی کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کتابوں کا صرف رسم الخط ہندی رہے گا، زبان اردو ہی ہوگی۔ ان کتابوں میں عربی آیات کے ترجموں کے ساتھ ساتھ اصل عبارات بھی دی جائیں گی۔ یوں تو مکتبہ جامعہ نے آسان اور عام فہم اردو میں بچوں کے لیے مذہبی، معلوماتی اور کہانیوں وغیرہ کی ہر قسم کی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں لیکن ان میں بھی جو خصوصیت مکتبہ کی بچوں کی مذہبی کتابوں کو حاصل ہے وہ خاص طور سے قابل تعریف ہے۔ اسی مذہبی سلسلے کی فی الحال دو کتابیں "ہمارے نبی" اور "آں حضرت" اس ماہ کے آخر تک ہندی رسم الخط میں شائع ہو رہی ہیں۔ بقیہ کتابیں بھی سلسلے وار جلد شائع کرنے کا پروگرام ہے۔

اسلم جیراج پوری

# میری کہانی

مجھے اپنے طالب علمی کے حالات کو منظرِ عام پر لانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ صرف اس خیال سے ان کو لکھ رہا ہوں کہ میرا یہ زمانہ اسلامی ہند میں ایک عظیم الشان مذہبی تحریک یعنی اہلِ حدیث کے آخری دور کی یادگار ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ان دھندلے سے نقوش سے جن کو میں تحریر میں لا رہا ہوں اس تحریک کے تاریخ نگار کو کچھ مدد مل سکے۔

ہندوستان میں ترکِ تقلید کا خیال حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ علیہ کی تعلیمات سے پیدا ہوا۔ وہ قرآن کریم پر غائر نظر رکھتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ کتاب سرتاسر ذہنی غلامی کے خلاف صدائے احتجاج ہے تو اہلِ عام کو تقلید شخصی سے روکنے اور تحقیق کی طرف مائل کرنے کے لیے علمی کوشش کی کیوں کہ اس ماحول میں جب کہ قرآن کے ترجمہ کرنے پر ہر مسلمان تلواریں کھینچ کر ان کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا، تقلید کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانا دشوار تھا۔

رفتہ رفتہ علماء میں سے کچھ لوگ ان کی باتوں کی طرف توجہ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے پوتے مولانا اسماعیل شہیدؒ کے زمانے میں خالص کتاب و سنت کی حامل ایک جماعت تیار ہو گئی۔ ان لوگوں کے حوصلے بلند تھے اور انھوں نے پوری توجہ اعلاءِ کلمۃ الحق پر صرف کی۔

اس دور کے بعد جماعت کی بقا کے لیے علماء اہلِ حدیث نے علمی کوشش شروع کی جن میں شمس العلماء مولانا سید نذیر حسین میاں صاحب، خاص طور پر ممتاز ہیں۔ انھوں نے دہلی میں حدیث کا درس دینا شروع کیا جو نصف صدی سے زیادہ تک مسلسل جاری رہا۔ ان کے فیض سے ہندوستان میں ہزاروں علمائے حدیث پھیل گئے جنھوں نے گوشہ گوشہ میں کتاب و سنت کی اشاعت کی اور تقلید کو مٹایا۔ میاں صاحب کی آخری زمانہ میں نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال سے ایک تحریک کی مالی اور علمی امداد کی جس سے اس کو عظیم الشان تقویت پہنچی۔

پہلے اس جماعت نے اپنا کوئی خاص نام نہیں رکھا تھا۔ مولانا شہید کے بعد جب مخالفوں نے ان کو بدنام کرنے کے لیے وہابی کہنا شروع کیا تو یہ اپنے آپ کو محمدی کہنے لگے پھر اس کو چھوڑ کر اہل حدیث کا لقب اختیار کیا جو آج تک چلا جاتا ہے۔

الغرض ہندوستان میں غیر مقلدی کا آغاز شاہ ولی اللہ سے ہوا پھر مولانا شہید نے اس کی جماعت تیار کی جس کا امام سید احمد بریلوی کو بنایا اس کے بعد صادق پوری علماء نے تبلیغی اور میاں صاحب نے علمی کوشش سے اس کو مستحکم کیا اور فروغ دیا۔ اس کا آخری مرکز بھوپال تھا جہاں سے اس کی اشاعت کا نام سرگرمی کے ساتھ ہوا۔

نواب صدیق حسن خاں کی ذات اور نواب شاہ جہاں بیگم کی علمی قدردانی کی بدولت بھوپال اس زمانہ میں علماء و فضلاء کا مرکز تھا۔ نیز اقطاع ہند میں جو علماء مقلدوں کا مقابلہ اور کتاب و سنت کی اشاعت کرتے تھے ان میں سے اکثر بھوپال سے رابطہ رکھتے تھے اور بعضوں کو امداد بھی ملتی تھی۔ اس وجہ سے ہندوستان کے ہر حصے سے اس جماعت کے اہل علم کی وہاں آمد و رفت تھی۔ بلکہ نواب صاحب کی عربی تصانیف کی شہرت کی وجہ سے عراق شام اور نجد وغیرہ کے علماء بھی کبھی کبھی وہاں آتے تھے۔ میرے والد سلامت اللہ مرحوم علماء بھوپال میں سلیقہ گفتگو میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے۔ اور عربی نہایت صاف اور بے تکلف بولتے تھے۔ اس وجہ سے ان وفود سے گفتگو کے لیے بیشتر وہی بلائے جاتے تھے۔

نواب صاحب کے انتقال کے بعد سے جو ۱۳۰۷ء میں ہوا بیرون ہند کے علماء کی آمد کا سلسلہ تو بہت کچھ ہو گیا تھا لیکن ہندوستان کے اہل علم شاہ جہاں بیگم کے عہد میں ۱۳۱۹ء تک آتے رہے کیوں کہ امداد کا سلسلہ ان کی زندگی بھر جاری تھا۔

نواب صاحب کے بیٹوں کی زندگی ایسی نہ تھی اور ان کے دروازوں پر پہرے تھے جہاں علماء کا گزر مشکل تھا۔ اس لیے وہ لوگ اکثر والد ہی کے پاس ٹھہرتے تھے۔ والد اس زمانے میں ریاست کے محکمہ تعلقات کے مہتمم تھے۔ اور واعظ شہر سرکار کی طرف سے ان کو رہنے کے لیے قدسیہ بیگم کا محل ملا ہوا تھا جو شہر میں معزز ترین حصہ میں شیش محل اور موتی محل کے سامنے واقع ہے اور جس میں سینکڑوں آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ اس وجہ سے ہمارا گھر مقامی اور بیرونی علماء اہل حدیث کا مرجع تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ان بزرگوں کی خدمت میں رہا۔ اسی وجہ سے مجھے ان کے حالات دیکھنے اور ان کے فیوض و برکات

سے متمتع ہونے کے مواقع زیادہ نصیب ہوئے۔ بھوپال میں میری طالب علمی کا زمانہ ۱۳۰۵ھ سے شروع ہوکر ۱۳۱۹ھ میں ختم ہوجاتا ہے۔ یہ شاہ جہاں بیگم کی حکومت کا زریں عہد تھا۔ جن کی دین داری، علمی قدردانی اور بے نظیر فیاضی کی بدولت شہر میں اسلامی شان اور خوش حالی نمایاں تھی اور علم دین کا چرچا عام تھا۔ اس دراز مدت میں بہت سے علما و فضلا کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان کو تحریر میں محفوظ نہیں رکھا۔ اب کہ ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ بہت تھوڑی باتیں میرے حافظہ میں باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں سے بھی صرف انھیں لکھوں گا جن کا تعلق میرے تاثرات سے ہے لیکن اس سے پہلے اپنی طالب علمی کا حال نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

**آغاز** میری ولادت میرے وطن موضع جیراج پور ضلع اعظم گڑھ ۱۲۹۹ھ میں ۷ ربیع الاول یوم جمعہ کو ہوئی اس سال میرے والد حج کو گئے ہوئے تھے حجاج کا یہ قافلہ ہمارے دیار میں اب تک مشہور ہے۔ اس میں علاوہ دیگر نامور بزرگوں کے آٹھ مشہور علما اہل حدیث تھے جن میں مولانا حکیم عبداللہ صاحب جیراجپوری اور مولانا حافظ عبداللہ صاحب جیراج پوری بھی تھے ان لوگوں نے علمائے حرمین شریفین سے حدیث کی سندیں حاصل کیں یہی وجہ ہوئی کہ واپسی میں دیر لگی۔ وطن واپس آنے کے بعد والد کو نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال میں بلاکر مدرسہ دقضیہ کا صدر مدرس کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ مدرسہ سلیمانیہ کے نائب مہتمم ہو گئے۔ پھر جب مولوی محمد بشیر صاحب سہوانی مہتمم مدرسہ مذکور کی تنخواہ مناصب میں منتقل ہوئی تو ان کی جگہ والد مدرسہ سلیمانیہ اور ریاست کے صیغہ تعلیمات کے مہتمم ہوگئے۔ وہ ہر سال کنوار تعطیل میں ایک ماہ وطن آیا کرتے تھے۔ جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو مجھ کو مکتب میں بٹھا دیا۔

یہ مکتب خاص ہمارے دروازہ پر تھا۔ اس میں ایک میاں جی مولوی شکراللہ نامی ہمارے خاندان کے بچوں کو پڑھاتے۔ ایسے جلاد کہ اپنی نشست کے سامنے ہمیشہ ایک رسّی لٹکائے رکھتے جس میں قصور وار لڑکوں کے ہاتھوں کو باندھ کر پیٹھوں پر چھڑیاں توڑا کرتے۔ لڑکے جس قدر ان سے ڈرتے تھے۔ دنیا کی کسی اور چیز سے نہیں ڈرتے تھے۔ لیکن والد نے ان کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو صرف مکتب میں بیٹھنے کی عادت ڈالنے کے لیے آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ سختی نہ کیجیے گا۔ چنانچہ انھوں نے مجھ پر کبھی سختی نہیں کی اور وہی برتاؤ رکھا جس کی الد صاحب نے ہدایت کی تھی۔ صبح کو جب میں مکتب جاتا تو مجھے سبق دے دیتے اور یہ کہہ کر دیتے

جس وقت یاد کر کے سنا دو گے اس وقت چھٹی مل جائے گی۔ اس میں مجھے [illegible]نی ہوتی۔ محنت کر کے تھوڑی دیر میں یاد کر لیتا اور سنا کر گھر چلا آتا۔ وہ اس قدر مہربان تھے۔ کہ اگر کسی دن میرا جی پڑھنے کو نہ چاہتا تو چھٹی دے دیتے تھے۔

پھر سال بھر میں قاعدہ اور تین پارے ختم کیے۔ دوسرے سال جب والد تعطیل میں مکان پر آئے تو مجھ کو معہ میری والدہ کے بھوپال لائے۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ میرے ایک حقیقی پھوپی زاد بھائی عبدالاعلیٰ تھے جن کے والدین انتقال کر گئے تھے۔ اگرچہ ان کے دادا اور چچا موجود تھے۔ مگر ان کی کفالت اپنے ذمہ میں لے لی تھی اور ان کو اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ وہ سن میں مجھ سے دو سال بڑے تھے۔ جب میں بھوپال میں آیا ہوں وہ ڈھائی پارے حفظ کر چکے تھے۔ والد نے مجھے بھی حفظِ قرآن میں لگا دیا۔

### حفظِ قرآن

والد کے پیش کار سید مظہر حسین مرحوم متقی، باوضع اور جید حافظ تھے۔ ہم دونوں بھائی مدرسہ میں جا کر ان سے سبق لیتے تھے۔ مکان پر ایک دوسرے حافظ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ صبح اور شام کو سبق یاد کرانے اور آموختہ سننے کے لیے ملازم تھے۔ ان کا نام عبدالکریم تھا۔ لیکن حافظ ”مینو“ کہے جاتے تھے۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک دن تنہا بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کر کے پنجابی میں ایک شعر گا رہے تھے۔ جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا۔

مینو تینو کہن وہابی اس وچ کی برائی

اسی دن سے ان کا لقب ”مینو“ پڑ گیا۔ اور سب اسی نام سے ان کو پکارنے لگے یہاں تک کہ شہر کے لوگ بھی۔ وہ قرآن صحیح پڑھتے تھے اور قواعد قرأت سے واقفیت رکھتے تھے۔

والد صاحب نے ہمارے لیے مطبع نظامی کا چھپا ہوا کلام مجید منتخب کیا جس میں علاوہ اس کے کہ سوائے ایک نقطہ کے اور کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ خوبی ہے کہ ایک پارہ کم و بیش چار ورق اور ایک رکوع نصف صفحہ میں تمام ہوتا ہے۔ جس کا یاد کر لینا طبیعت پر بار نہیں گزرتا۔ ہم ہر مہینہ میں آسانی سے ایک بلکہ ڈیڑھ دو پارے تک حفظ کر لیتے تھے۔ روزانہ پڑھائی کے صرف تین گھنٹے تھے باقی دن آزادی۔

عبدالاعلیٰ کو والد نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور مجھ کو والدہ نے۔ ہم دونوں میں مقابلہ رہتا تھا سبق ہمارے مختلف منزلوں سے ہوتے تھے۔ باوجود یہ کہ وہ ڈھائی پارے مجھ سے پہلے حفظ کر چکے

تھے۔ میرے ختم قرآن کے دن ان کے چار پارے باقی تھے۔

مجھے ۲۴ مہینے یعنی دو سال پورا قرآن حفظ کرنے میں لگے جن میں سے تقریباً تین مہینے بیماری میں گزرے۔

یہ بیماری تپ محرقہ کی تھی حکیم بھی تھے اور ڈاکٹر بھی مگر کسی دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ سر کے بال جھڑ گئے۔ اور کبھی کبھی غفلت کا غلبہ ہونے لگا۔ ایک دن سرشام ہی سے بالکل ہوش جاتا رہا اور آنکھیں بند ہوگئیں۔ رات بھر والدہ میرے سرہانے بیٹھی رہیں۔ اور والد اضطراب میں چارپائی کے سامنے صحن میں ٹہلتے رہے۔ پریشانی کی وجہ سے گھر میں کھانا بھی نہیں پکا۔ فجر کے وقت جب کہ والد مسجد میں جماعت پڑھانے گئے تھے۔ میں ایک دم اُٹھ بیٹھا اور لوٹے میں پانی مانگا۔ والدہ نل میں سے لوٹا بھر رہی تھیں کہ سیڑھیوں پر والد کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ لپک کر گئیں اور کہا لڑکا اُٹھ بیٹھا۔ والد اُلٹے پاؤں مسجد کو لوٹ گئے۔ اور مقتدیوں کو جن کے ساتھ مل کر میری صحت کی دُعا مانگی تھی۔ یہ خبر سنائی پھر گھر میں آئے۔ میں ہشاش تھا اور مرض سے نجات پا چکا تھا۔

میرا ننہال خاندان کہیں ہے بچپن سے مجھ کو میری نانی اور نانے نے پرورش کیا تھا اس وجہ سے میں والدین سے زیادہ مانوس نہ تھا اور بھوپال آنے پر ان کو کبھی کبھی تنگ کیا کرتا تھا والدہ نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ دیکھو ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے تمھارے ابا کی زبان سے کوئی بُرا کلمہ نکل جائے کیوں کہ اللہ ان کی بات سنتا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا ہماری بات نہیں سنتا؟ کہنے لگیں کہ سنتا تو سب کی ہے مگر ان کی جلد مان لیتا ہے جو اس کے ولی ہوتے ہیں۔ غالباً وہی تھا جب کہ والد ادھر نماز کے بعد دعا مانگ رہے تھے کہ ادھر اللہ نے مجھ کو دوبارہ زندہ کردیا اس لیے مجھ کو والدہ کی بات کا یقین آگیا۔

والدہ نے میرے صحت یاب ہونے پر اپنے زیوروں کو خیرات کردینے کی منت مانی تھی۔ صبح کو ان سب کی ایک پوٹلی باندھ کر والد کے حوالے کردی انھوں نے اس کو طلباء کے صرف کے لیے ابراہیم پورہ کی مسجد میں بھیج دیا والدہ نے اس کے بعد سے پھر کبھی چاندی کا ایک چھلّہ بھی نہیں پہنا۔

یہاں بطور تحدیث نعمت الٰہی کے یہ بیان کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بیماری کے بعد سے آج تک تقریباً پچاس سال ہوگئے اور مجھے ہمیشہ وطن سے باہر غربت میں ہی رہنا پڑا

کبھی کسی سخت بیماری میں اللہ نے مبتلا نہیں کیا۔ اتفاقیہ طور پر اگر کبھی کوئی معمولی شکایت ہوجاتی ہے تو دوا کرتا ہوں مگر فوراً اطلاعی خط والد کو لکھ دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کس دن ڈاکیا میرے گاؤں جاتا ہے۔ اسی دن شفا کی امید رکھتا ہوں کیوں کہ جہاں خط پہنچا والد دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ادھر میں اچھا ہوا۔ حفظِ قرآن کے بعد رمضان الشریف میں چند مہینے رہ گئے تھے اور مجھے اس سال قرآن سنانا تھا اس وجہ سے روزانہ دس دس پارے حافظ جی کو سنانے شروع کر دیے اور خوب رواں کر لیا بالآخر ۱۳۲۱ھ میں جب کہ میری عمر کا نواں سال تھا میں نے پہلی محراب سُنائی۔ روزانہ ایک پارہ آٹھ رکعتوں میں پڑھتا تھا لیکن دن بھر اس کو رٹتا تھا اور شام کو حافظ جی کو سنا دیتا تھا میری قرأت قواعد کے مطابق اور صاف تھی کہیں بھولتا نہ تھا آواز بھی اس وقت اچھی تھی اس وجہ سے لوگ پسند کرتے تھے۔ اور اہل حدیث دور دراز محلّوں کے سننے کے لیے آتے تھے۔ شب قدر کے خیال سے ستائیسویں رات ختم کے لیے متعیّن ہوئی اس دن مسجد آراستہ کی گئی والدہ نے دن بھر مٹھائی تیار کرائی۔ اور سرکار کی طرف سے چھ بورے بتاشے آئے اور کچھ روپے بھی جوان حافظ صاحب کو دیے گئے جنھوں نے میرے پیچھے کھڑے ہو کر قرآن سنا تھا۔

اس دن والدین کی خوشی دیکھ کر مجھے اپنا گھر خوشی سے معمور نظر آتا تھا اور اس خیال سے اس میں اور بھی زیادتی تھی کہ یہ میری بدولت حاصل ہوئی ہے۔

شام کے وقت والدہ نے مجھے وہ کرتا اور پاجامہ پہنایا جس کو خود اپنے ہاتھ سے سی کر تیار کیا تھا اب تک مجھ کو اس کرتے کا رنگ اور بوٹے یاد ہیں اس وقت عقل نہیں تھی ورنہ اس کو پیراہنِ یوسفؑ کی طرح زندگی بھر کے لیے محفوظ کر لیتا۔

دوسرے دن والد نے ایک نہایت قیمتی دوشالہ جو اُسی سال سرکار سے خلعت میں ملا تھا نکالا اور اس پر سو روپیہ رکھ کر مجھے حکم دیا کہ اپنے اُستاد حافظ سید مظہر حسین کے سامنے لے جاکر پیش کر دو۔ ایک آدمی کے سر پر مٹھائی کا ٹوکرا رکھ کر ساتھ کر دیا۔ حافظ صاحب موصوف نے خوش ہو کر متبرک ہاتھ میرے سر پر پھیرا اور مجھے دعائیں دیں جن کا اثر بحمد اللہ آج تک دیکھ رہا ہوں۔

**فارسی** حفظ قرآن کے بعد روزانہ صبح کو ایک منزل سنانے کا سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا۔ اسی کے ساتھ فارسی کے چھوٹے چھوٹے رسائل جو اس زمانے میں عام طور پر پڑھائے جاتے تھے ہم نے گھر ہی میں پڑھے۔ حفظ قرآن کی بدولت محنت کی عادت پڑ گئی تھی اور حافظہ قوی ہو گیا تھا جو کچھ پڑھتے تھے چند بار دہرانے سے ازبر ہو جاتا تھا یہاں تک کہ گلستان

اور بوستان دونوں کتابیں پوری پوری یاد کر ڈالیں۔ ہر جمعرات کو ان کے ایک ایک باب کا آموختہ کھڑے ہو کر زبانی سنایا کرتے تھے۔ قواعد کی مشق لکھا کر کرائی گئی، چنانچہ اس نوشتہ کو قواعد اسلمیہ" کے نام سے میں نے اسی زمانے میں سرکاری مطبع میں طبع کرا دیا تھا۔ ایک جزو کا مختصر رسالہ سلیس فارسی زبان میں ہے۔

اس کے بعد مولانا احسن صاحب شاعر کے دو رسالے پنج سبق اور وہ سبق معہ تحریر مشق کے پڑھے جن سے صحیح فارسی لکھنے کا ڈھنگ آگیا۔ فارسی کی دیگر درسی کتب کی تعلیم والد نے مولوی فتح کے سپرد کر دی۔

مولوی صاحب موصوف نے ایک دن ظلمات اور آب حیات کے قصے میں فرمایا کہ اس کی حقیقت بھی کچھ سمجھے؟ ظلمات سے مراد سیاہ حروف ہیں اور آب حیات کے معانی جو شخص عبارت سے مطلب نکال لیتا ہے وہ گویا خضر ہے کہ ظلمات میں آب حیات لاتا ہے اور یہ قدرت صرف مطالعہ کی قوت بڑھانے سے حاصل ہوتی ہے اور جو شخص ہر قدم پر اُستاد کا محتاج ہو وہ اس سے محروم رہتا ہے۔

جیسے سکندر کو خضر کی رہنمائی سے بھی آب حیات اس کو نصیب نہ ہو سکا۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی اسی دن سے میں نے آئندہ سبق کا مطالعہ لازم سمجھ لیا جس کی بدولت ہر کتاب آسان ہو گئی اور فارسی کا درسی نصاب جلد ختم کر لیا۔ اس کے ساتھ بہت سی بالائی کتابیں شاہنامہ فردوسی دواوین اساتذہ و مثنویاں وغیرہ خود اپنے شوق سے دیکھ ڈالیں۔

**ریاضی**

حساب اقلیدس، مساحت اور جبر و مقابلہ پڑھانے کے لیے مولوی شاہ محمد صاحب جو بھوپال کے مشہور ریاضی دان تھے مقرر ہوئے۔ روزانہ ہمارے گھر آکر تعلیم دیتے تھے۔ ایک دن انھوں نے امتحان لیا۔ کسر ملتف کا سوال تھا سب سے پہلے اس کا جواب میں نے دیا انھوں نے سلیٹ کو دیکھا اور الٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد میرے ساتھیوں نے اپنی اپنی سلیٹیں دیں وہ اُن کو اسی ترتیب سے ایک دوسرے پر رکھتے گئے۔ جب سب کے جوابات آگئے تو غالباً اس وجہ سے کہ پہلی نظر میں ان کو میرا جواب غلط معلوم ہوا تھا۔ بے ساختہ ایک تماچہ مجھ کو مار دیا۔ میری زندگی میں یہ بالکل نیا اور غیر متوقع واقعہ تھا اس لیے میں مضطرب ہو گیا اور میری آنکھوں میں آنسو نکل آئے مگر خاموش بیٹھا رہا۔ جب انھوں نے الٹ کر ان سے جواب دیکھے تو کسی کا عمل غلط تھا تو کسی کا جواب۔ لیکن میرا جواب اور عمل دونوں ٹھیک نکلے میں نے

پوچھا؟ کیا غلطی ہوئی، کچھ نہیں بولے۔ میں اُٹھ کر سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا اور پلنگ پر لیٹ گیا مجھ کو سخت رنج تھا کیوں کہ میں ہر استاد کی عظمت کا خیال رکھتا تھا۔ اور اس کے ہر حکم پر اس کی منشا کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا کبھی کسی استاد کو ناراض کرنے کا موقع نہیں دیا اور ان کی طرف سے کبھی سوائے شفقت اور محبت کے دوسری بات نہیں دیکھی اس لیے اس واقعہ سے نا صرف میری عزت نفس بلکہ اس اعتماد کو صدمہ پہنچا جو میں استادوں پر رکھتا تھا۔ اگر تسلّی کے لیے یہ بات کافی تھی کہ استاد اور ساتھیوں دونوں پر ظاہر ہو گیا تھا کہ میں بے قصور ہوں مگر پھر بھی قلق تھا کہ یہ بات کیوں پیش آئی مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بعد واقع کی رفتار کیا ہوئی مگر پھر مولوی صاحب موصوف ہم کو پڑھانے کے لیے نہیں آئے بلکہ ان کی جگہ مولوی اکبر خاں صاحب جو مدرسہ جہانگیری میں ریاضی کے مدرس تھے آنے لگے۔ میرے نزدیک اُستاد اور شاگرد کا تعلق دماغی ہے یہ نا بیٹے اور باپ کا رشتہ ہے نہ بھائی اور بھائی کا بلکہ افادہ اور استفادہ اور خوردی اور بزرگی کا ایک مصاحبانہ مگر مقدس تعلق ہے جس کا احترام شاگرد سے زیادہ خود اُستاد پر لازم ہے کیوں کہ استاد کی ذرا سی بھی غلطی سے شاگرد کو بہت نقصان پہنچ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے شاگرد کی غلطی استاد کے لیے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ ریاضی ختم کرنے کے بعد ایک ماسٹر صاحب مجھے انگریزی پڑھانے کے لیے اُسی وقت میں آنے لگے۔

**صرف و نحو**

ان کی تعلیم میں کتابوں کی بجائے اصل فن کے سکھانے پر نظر رکھی گئی طریقہ یہ تھا مولوی فتح اللہ صاحب دن کو سبق پڑھاتے اور شام کو بعد مغرب ہمارے یہاں آجاتے۔ ان کے مواجہہ میں والد مجھے حکم دیتے کہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے بیان کرو۔ میں روزانہ اپنے ہر ایک سبق کی صاف اور سلجھی ہوئی تقریر تیار کر رکھتا تھا۔ کھڑے ہو کر سنا دیتا اگر کوئی اعتراض ہوتا تو اس کا بھی جواب دے دیتا۔ ہر مہینے کے آخر میں اس مہینے کی پوری پڑھائی اپنی عبارت میں لکھ کر پیش کرنی پڑتی تھی یہ سلسلہ فصول اکبری اور کافیہ تک رہا جو زبانی یاد کرائی گئی تھیں۔

بھوپال میں اس وقت صرف و نحو کے اچھے اچھے اُستاد تھے۔ جب ان میں سے کوئی یہاں آتا تو امتحان لیتا۔ میرے ساتھی اس کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن مجھے خوشی ہوتی تھی کیوں کہ میں ہر سوال کا جواب دینے کو تیار رہتا۔

جب شرح جامی شروع ہوئی تو میرے ساتھیوں کی تعداد ۱۲ تک پہنچ گئی، میں اپنا سبق مطالعہ کر کے تیار کر لیتا تھا کہ استاد سے کسی بات سمجھنے یا پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ اُن کو

یہ بات معلوم تھی۔ اس وجہ سے سبق کے وقت تقریر مجھ ہی سے کراتے تھے۔ تکرار میں اطمینان کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا تھا۔ ان میں ایک شخص مولوی عبدالصمد صاحب سرحد کے رہنے والے تھے۔ جن کی عمر تیس سال سے کم نہ تھی۔ وہ بار بار شرح جامی مختلف مدرسوں میں پڑھ چکے تھے بلکہ انھوں نے خود کافیہ کی ایک شرح فارسی میں لکھی تھی۔ تحریر نسبت ان کو مستحضر تھی۔ اس کے اعتراضات کرتے تھے۔ مگر وہ کتاب میرے پاس بھی تھی۔ اس لیے میں جوابوں کے واسطے تیار ہو کر آتا تھا۔

**فقہ واصول** مولوی فتح اللہ صاحب جس طرح صرف و نحو میں اچھے استاد سمجھے جاتے تھے اسی طرح فقہ اور اصول میں بھی ان کی شہرت تھی۔ والد نے ان علوم کی تعلیم بھی انھیں کے سپرد کی۔ اہل حدیث کے نزدیک فقہ کی دینی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی تعلیم محض اتمام نصاب کے لیے دی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے اکثر مسائل سے ہماری روح بغاوت کرتی تھی۔

ایک دفعہ قاضی شیخ محمد صاحب جعفری نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو۔ میں نے کہا شرح وقایہ پھر پوچھا حدیث کی بھی کوئی کتاب پڑھی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگے کہ تمھارے والد بہت دانش مند ہیں۔ وہ پہلے تاریکی کی سیر کراتے ہیں۔ تاکہ روشنی کی قدر معلوم ہو سکے۔

اصول فقہ قیاسی علم ہے جس سے مجھ کو دلچسپی ہو سکتی تھی مگر نصاب میں جو کتابیں ہیں ان کا علمی پہلو نہایت حقیر ہے۔ والد نے جب شکایت سنی تو غزالی کی "المصطفٰے" کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔

سراجی میں جب حجبت کا مسئلہ آیا اور معلوم ہوا کہ حافظ عبدالاعلیٰ محجوب الارث ہیں تو ان سے زیادہ مجھ کو تعلق ہوا۔ میرا دل مطلق قبول نہیں کر سکا کہ یہ اسلام کی تعلیم ہو سکتی ہے کہ یتیم پوتا جملہ خاندانی ملکیت سے محروم کر کے گھر سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن جس قدر اس کی تحقیق کی اسی قدر اس پر نہ صرف مذاہب اربعہ بلکہ جملہ ائمہ حدیث و علماء سلف کو متفق پایا اور ساری اسلامی تاریخ میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جس نے اس کی مخالفت کی ہو مگر دل میں یہ خلش برابر رہی الحمد للہ کہ قرآن کریم نے رہنمائی کی اور سورج کی طرح واضح کر دیا کہ یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے۔ آخر میں خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری کے رسائل سے جو انھوں نے اس مسئلے پر لکھے تھے۔ مزید دلائل مل گئے۔ میں نے سالہا سال تک بہت سے ایسے اہل علم سے زبانی گفتگو کی اور جو اہل فتویٰ ہیں۔ ان سے تحریری

مناظرے کیے مگر کسی کے پاس میری دلیلوں کے جواب نہ نکلے۔ اس وقت رسالہ محجوب الارث لکھوا کر شائع کیا۔ جس میں ثابت کیا کہ قرآن اور حدیث تو خیر خود فقہ کی رو سے بھی یتیم اولاد محجوب نہیں ہو سکتی۔

اس مسئلہ کے علاوہ میراث کی تدوین میں بنیادی غلطیاں ہو گئی ہیں جن کو خواجہ احمد الدین صاحب نے اپنے رسالہ معجزہ قرآن میں تفصیل کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ان کو عملی شکل میں ترتیب دے کر عربی زبان میں "الوراثۃ فی الاسلام" کے نام سے شائع کیا۔

**منطق و فلسفہ**

والد نے خود صغریٰ و کبریٰ وغیرہ پڑھا کر منطق کے اصول ذہن نشین کرائے پھر تہذیب زبانی یاد کرائی۔ اس کے بعد شرح تہذیب اور ہدایت الحکمۃ ساتھ ساتھ پڑھائی روزانہ دو سبق فقہ اور اصول کے مولوی فتح اللہ صاحب کے یہاں ہوتے تھے۔ اور دو سبق منطق و فلسفہ کے والد کے یہاں مطولات میں پہنچ کر صرف تین سبق روزانہ رہ گئے جن کو والد خود ہی پڑھاتے تھے۔ صدرا اور شمس بازغہ تک یہی سلسلہ رہا ہیاۃ میں تصریح اور چغمینی بھی والد ہی نے پڑھائی۔

**ادب**

والد نے پہلے زمخشری کی اطواق الذہب حفظ کرائی۔ پھر نفحۃ الیمن پڑھائی۔ ہمارے مکان سے ملا ہوا مکان مولانا عباس کا تھا جو صاحب نفحۃ الیمن احمد شروانی یمنی کے بیٹے تھے۔ میرا خیال تھا کہ باپ کی تصنیف بیٹے سے پڑھیں لیکن والد کو ان کی عربیت پر اعتماد نہ تھا۔

صحابہ کرام کے رجزیہ و بعض دیگر اشعار کا مختصر مجموعہ والد نے تیار کیا تھا۔ اس کو ہم سے نقل کر لیا اور سبقاً سبقاً پڑھ کر یاد کیا۔ پھر مقامات زمخشری پڑھی اور سبعہ معلقہ ازبر کیا جریری اور ہمدانی کے مقامات اور دیوان وحماسہ کے انتخابات تقریباً نصف نصف جو خود والد نے کر دیے تھے پڑھے۔

حکیم سیف الدین خاں صاحب سابق افسر الاطبا بھوپال نے مطول کو محشی کر کے نہایت خوبی کے ساتھ چھپوایا تھا جس زمانہ میں اس کتاب کو میں شروع کرنے والا تھا۔ انھوں نے ایک نسخہ والد کے لیے ایک نسخہ خاص میرے لیے بھیج دیا۔ اس وقت خوشی اور ممنونیت کا جو جذبہ میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ آج تک یاد ہے۔

ادب کی تعلیم عربی ہی زبان میں دی جاتی تھی اور ہر ہفتہ میں ایک ہی قصہ عربی میں ترجمہ کرایا جاتا تھا۔ مطالعہ کے لیے واقدی کی فتوح شام اور الف لیلہ کی جلدیں ملیں جن کو میں نے

چند ہفتوں میں ختم کر ڈالا پھر محاضرات اور تراجم کی کتابیں دیکھنی شروع کیں۔

**حدیث**

سب سے پہلے شیخ محمد عبدالوہاب نجدی کے مسائل کا مجموعہ جو دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اور جس میں کتاب التوحید اور کتاب الایمان وغیرہ میں سبقاً سبقاً پڑھایا گیا۔ اس کے بعد بلوغ المرام اور موطا امام ملک اصول حدیث میں تحبہ و دیگر رسائل تھے جملہ اقسام حدیث اور اس کے ملل کے شجرے لکھا کر یاد کرائے گئے۔ آخر میں صحیح بخاری پڑھائی گئی اور پھر صحیح مسلم۔

میرا خیال تھا کہ کوئی کتاب شیخ حسین عرب سے بھی پڑھ لیتے جو اس وقت حدیث کے جگت اُستاد تھے مگر والد سند کے زیادہ قائل نہیں تھے۔ وہ لیاقت پیدا کرانی چاہتے تھے۔

والد نے کہا میں قرآن پڑھاؤں گا تم میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک ایک الگ الگ تفسیر منتخب کرے اور سبق اس سے تیار کر کے لائے۔ میں تفسیر کبیر چاہتا تھا مگر اس کو میرے عزیز ترین ہم سبق توقیر الحسن نے چن لیا۔ کشاف کو عبدالغفور نے لیا میں نے اپنے واسطے شیخ علی مہائمی کی تبصیر الرحمٰن کی جس میں آیات کا ربط دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اوروں میں سے کسی نے ابن کثیر کو لیا کو کسی نے جامع البیان کو کسی نے جلالین کو۔ والد کے سامنے معالم التنزیل رہتی تھی۔ میں اس کا بھی ایک نسخہ اپنے مطالعہ میں رکھتا تھا۔

یہ سبق روزانہ ظہر کے بعد کم و بیش دو گھنٹے میں ہوتا تھا۔ ہر آیت کے متعلق تفسیری مباحث مختلف پہلوؤں سے درمیان میں آتے تھے۔ جو علوم ہم کو پڑھائے جاتے تھے ان کی غرض و غایت فنی حیثیت اگرچہ بیان کر دی جاتی۔ مگر ہماری نگاہ میں صرف یہ بات تھی کہ

**درسی نصاب**

جاننے والے معزز اور مولانا سمجھے جاتے ہیں اس لیے ان کا جاننا ہی بجائے خود انسانیت کے لیے شرف ہے۔ اس وقت کسی درسی علم کے ضروری یا غیر ضروری یا مفید یا غیر مفید ہونے کا کوئی خیال ہمارے ذہنوں میں نہ تھا۔ لیکن دو باتیں بالخصوص میری نگاہ میں اسی وقت بھی کھٹکتی تھیں۔

ایک تو یہ کہ حدیث کے سوا باقی علوم میں خواہ وہ عقلی ہوں نقلی جو کتابیں درس میں رکھی گئی ہیں وہ تقریباً تمام شرحیں ہیں جن میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر متعلق اور مخل بحثیں بھری ہوئی ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ خود فنون مثلاً شمسیہ، مسلم العلوم، مسلم الثبوت اور وقایہ وغیرہ۔ کیوں نہیں پڑھائے جاتے اور شروح کی تعلیم میں کیوں فضول وقت ضائع کیا جاتا ہے مگر جب

ان متون پر غور کیجیے تو اس قدر متعلق نظر آتے کہ پڑھانے کے قابل نہیں معلوم ہوتے کیوں کہ ان کے مصنفوں کے نزدیک بڑا کمال یہ تھا کہ کم سے کم الفاظ میں مسائل کی طرف اجمالی اشارات کر دیے جائیں خواہ وہ معمہ ہی کیوں نہ بن جائیں۔

شروح اور متون کی ان خرابیوں کے متعلق اسی زمانہ میں میں نے ایک طالب العلمانہ غزل بھی لکھی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں۔

| | |
|---|---|
| چیستاں مسلم، مسلّم سر بسر ابہام ہے | کچھ عبارت سے نہ حل عقدۂ باطن ہوا |
| ہو سکے شرحوں سے شرح صدر کی امید کیا | شارحوں میں بحثِ لفظی کا مرض مزمن ہوا |
| ایک کا اجمال مہمل، ایک کی تفصیل لغو | علم تھا جتنا وہ نذرِ شارح و ماتن ہوا |

بے شک ان سب میں سراجی ایسی ہے جس کو متن متین کہا جا سکتا ہے اس کے مصنف نے نہ معلوم کس وقت نظر کے ساتھ اس کو لکھا ہے کہ بے کم و کاست پورا فن اس سے حل ہو جاتا ہے۔ ساری کتاب میں اگر کہیں ایک لفظ بھی بڑھایا گھٹایا یا بدلا جائے تو وہیں مطلب خبط ہو جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس فن کی تدوین ہی میں اصولی غلطیاں ہوئی ہیں۔ جن سے بہت سے مسائل قرآن کے خلاف پڑتے ہیں۔ کیوں کہ یہ مصنف کا قصور نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ نہ صرف عقائد و اصول و فقہ بلکہ منطق و فلسفہ و ہیاۃ وغیرہ پر بھی جو غیر شرعی علوم ہیں۔ قدامت کے تقدس کا ایک غلاف چڑھا دیا گیا ہے۔ اور جو کچھ کتابوں میں لکھا جا چکا ہے اساتذہ کی نگاہوں میں آخری الفاظ بلکہ معلمات ہیں جن میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ میری طبیعت میں کچھ تو فطرۃً تنقید کا مادہ ہے کچھ والد کی تعلیم نے اس سونے پر سہاگہ کا کام کیا جو بار بار یہ حقیقت ذہن نشین کراتے رہتے تھے کہ سوائے ان چیزوں کے جن پر تم ایمان لائے ہو، ہر شے پر تم کو تنقید کا پورا حق حاصل ہے۔ اس لیے میں ان مصنفوں کی بزرگی کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ان کی جن باتوں کو غلط سمجھتا تھا، ان پر اعتراض کرتا تھا میرے استاد اس رویہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شرح عقائد نسفی پڑھتے وقت میں نے ملا عبدالحکیم کی ایک صریح غلطی نکالی جو انھوں نے خیالی کی توضیح میں کی ہے۔ استاد نے بوجوہ اس کے کہ ان کی مدافعت نہ کر سکے ان کو اعتراضات سے بالاتر قرار دیا اور ان کی شان میں یہ اشعار سنا کر خاموش کر دیا۔

| | |
|---|---|
| خیالات خیالی بس بلند است | در انجا جائے قل احمد و جند است |

ولے عبدالحکیم خوشں خصالی کے حل کردہ خیالات خیالی

یہ استاد غیر مقلد تھے مگر مقلد یا غیر کسی کی تخصیص نہیں، مسلمان من الحیث القوم صدیوں سے ماضی پرستی میں بتلا ہیں۔ ان کی مثال کلکتہ کے اس نان بائی کی ہے۔ جو باسی روٹی کو تازی سے زیادہ قیمت پر بیچتا تھا۔ کسی نے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ اس سے مقدم اور عہد رسالت سے کی رسالت سے ایک رات قریب تر ہے اس لیے اس کے دام زیادہ ہیں۔

اب اگر آپ پوچھیے تو ایک مدت تک غور و فکر کرنے اور نتائج کو دیکھنے کے بعد ان درسی علوم کی نسبت جو مشرق میں پڑھائے جاتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مردہ علوم کی لاشیں ہیں جن کو ہمارے اساتذہ صدیوں سے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور جن کی عفونت سے عقل اور دین کو دنیا کمانے اور ملت میں تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ نہ بنائیں۔

مجھے امید ہے کہ امت میں جس دن یہ مرکزیت آجائے گی اور اجتماعی مقاصد کی تشکیل ہوگی اس دن سوائے قرآن کریم کے کوئی دوسرا دینی نصاب ہمارا قرار نہ پاسکے گا۔

**تربیت** والد نے ہم کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اصلاح وہی ہے جو خود اپنے علم سے ہو کسی بزرگ کا یہ مقولہ کئی باران کی زبان سے سنا:۔

هلنا العلم للدنیا لکن ابی العلم ان یکون الا اللہ

صرف ایک چیز تھی جس کی خاص طور پر وہ تاکید رکھتے تھے یعنی جاہلوں کی صحبت سے پرہیز۔

ہم نے محل کے نیچے کا ایک بڑا حصہ جو مسجد کی جانب ہے پڑھائی کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اس میں دن بھر ہم اور میرے دس ساتھی رہتے تھے۔ سوائے پڑھنے پڑھانے اور علمی بحثوں کے کوئی دوسری بات نہ تھی۔ اور نہ وہاں بجز اہل علم یعنی علماء طلباء کے آنا جانا تھا۔ والد بھی اس میں بیٹھا کرتے تھے۔ ان کی محبت اور عظمت کا ہم پر اس قدر اثر چھایا ہوا تھا کہ ان کی منشا کے خلاف کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر اجیانا کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو متنبہ کر دیتے تھے مگر دلپذیر انداز کے ساتھ نہ تحکمانہ۔ ایک بار رسالہ کے دو افسر ملنے کے لیے آئے جب اوپر آکر والد کے پاس بیٹھ گئے تو میں چپکے سے نیچے اترا اور ان گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر سوار ہو محل کے سامنے ایک بڑا احاطہ ہے جس میں منشی امتیاز علی صاحب وزیر کی توجہ سے جو صدر منزل ہمارے بالمقابل رہتے تھے۔ چاروں طرف سڑک چھوڑ کر اس وقت ایک خوش نما چمن لگایا تھا۔ اس سڑک

پر میں نے گھوڑے کو تیزی کے ساتھ دو چکر دیے۔ والد نے ٹاپوں کی آواز سنی ہوگی۔ اور یہ بھی اندازہ کرلیا ہوگا کہ کون ہے۔ جب میں اوپر آیا تو اپنے قریب بلاکر یہ جملہ فرمایا جو ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔

انکَ امرءٌ فیکَ جاھلیۃٌ

بھوپال میں اس زمانے میں ایک حنفی مولوی جو نیک اور پرہیز گار تھے۔ روزانہ صبح کو اپنے محلہ کی مسجد میں قرآن کا ترجمہ سنایا کرتے تھے۔ شہر کے لوگ دُور دُور سے اس میں آکر شریک ہوتے تھے والد کی محفل میں ایک ڈاکٹر صاحب نے ان کے ترجمہ کی تعریف کی اور اس کے ساتھ ان کی علمیّت کی مدح کرنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف علوم دینیہ سے واقف ہیں اور معقولات نہیں جانتے اور میرے نزدیک اس وقت جو معقول نہ ہو وہ عالم کہے جانے کا مستحق نہ تھا۔ اس وجہ سے بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ کہ ان کو علم سے کیا واسطہ۔ والد نے میری طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا ؂

وما عبر الانسان عن فضل نفسہ | بمثل اعتقادالفضل فی کل فاضل

ایک دن ہم کئی طالب علم کسی بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔ والد مغرب کی نماز پڑھ کر آگئے۔ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر بولے کہ کیسے شیاطین ہو کہ جماعت کا بھی خیال نہیں رکھتے عمر بھر میں یہی ایک سخت لفظ تھا جو ہم نے ان کی زبان سے اپنی بابت سنا۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس موقع پر اس کا استعمال بجا نہ تھا۔

ان کا برتاؤ ہم سب کے ساتھ یکساں تھا۔ خاص کر حافظ عبدالاعلیٰ اور میرے درمیان میں تو وہ کسی امر میں تفریق جائز ہی نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم دونوں کے لباس بھی بالعموم ایک ہی کپڑے کے ہوتے تھے۔ مگر ایک بات کا مجھے علم تھا جس کی وجہ سے یہ ظاہری مساوات ناگوار نہیں تھی۔ وہ یہ کہ میرے رات کے رہنے کا کمرہ اوپر والد کے کمرہ کے بازو میں تھا۔ گرمیوں میں جب وہ سائبان میں تہجد کی نماز پڑھتے تھے۔ تو میں ان کی دُعائیں سنتا تھا۔ دین و دنیا کی کون سی خوبی تھی جس کو میرے لیے نہیں مانگتے تھے۔ خاص کر جب وہ مجھ کو اللہ کی امانت قرار دے کر الحاح وزاری کے ساتھ اس کی حمایت اور حفاظت میں سپرد کرتے تھے۔ اس وقت فرطِ منّت سے بستر میں پڑے پڑے میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے تکیہ پر ٹپک پڑتے تھے اور دل ہی دل میں آمین آمین کہتا تھا۔ اس لیے میں جانتا تھا کہ ان کے دل کی دنیا میں

میرا کیا مقام ہے اور سمجھ گیا تھا کہ باپ کا رشتہ بیٹے کے ساتھ صرف جسمانی ہی نہیں بلکہ روحانی بھی ہے۔

انھوں نے ہمارے لیے ایک اُستاد بھی مقرر کر دیا تھا۔ جو روزانہ شام آکر بانک۔ باناا اور بنوٹ وغیرہ سکھاتے تھے جس سے ورزش بھی ہو جاتی تھی۔ میں نے بندوق کی نشانہ بازی کی بھی مشق کی تھی مگر شکار کی اجازت اسی وقت ملتی تھی۔ جب ریاست کے دورہ پر والد کا ساتھ ہوتا تھا۔

**کچھ حدیث کے متعلق**

یہ خیال اس وقت دل میں بمنزلہ تخم کے پڑ گیا جو برابر پرورش پاتا رہا۔ ۱۹۱۰ء میں لاہور میں مولوی عبداللہ چکڑالوی جو حدیث کے قائل نہیں ہیں، ان سے جا کر ملا۔ تین گھنٹے تک گفتگو رہی جس کو انھوں نے اسی بحث میں ضائع کر دیا کہ رسول کا لفظ کلام مجید میں جہاں جہاں آیا ہے۔ اس سے مراد قرآن ہے نہ کہ ایک مخصوص انسان! میں نے دیکھا کہ وہ حقیقت آشنا نہیں ہیں۔ انھوں نے سنت متواترہ یعنی عمل بالقرآن کا بھی انکار کر دیا تھا۔ اس وجہ سے سخت مشکل میں گرفتار تھے اور سوائے تاویلات اکیکہ کے عمل کے لیے کوئی راستہ نہیں پاتے تھے۔ پھر دوبارہ کبھی ان کی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ جب قرآنی حقائق اللہ نے میرے دل پر کھولے اس وقت حدیث کی اصلی حیثیت بالکل واضح ہو گئی کہ وہ دینی تاریخ ہے۔ خود اس کو دین سمجھنا صحیح نہیں اگر دین ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی طرح اس کو بھی لکھوا کر امت کو دے جاتے۔ دین کے لیے قرآن کافی ہے جو کامل کتاب ہے۔ اور جس میں دین مکمل کر دیا گیا ہے۔

**کچھ قرآن کی نسبت**

قرآن کو میں نے توجہ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا۔ لیکن جس طرح ہمارے مفسرین نے اس کو ایک علمی اور نظری کتاب بنا رکھا ہے۔ اسی طرح میں بھی سمجھتا تھا۔ زیادہ توجہ علمی و ادبی لطائف یا فقہی و کلامی دلائل کی طرف تھی اور حقائق جن کی تعلیم کے لیے وہ نازل کیا گیا ہے۔ نظروں سے نہاں تھے۔ ایک بار میں نے ایک خواب دیکھا جس کے بعد سے میری نگاہ میں حقائق کا جلوہ شروع ہوا۔ میں اپنے جیسے لوگوں کے خوابوں کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں۔ لیکن اس خواب کا اثر چوں کہ میری زندگی پر پڑا ہے۔ اس وجہ سے بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

۱۹۱۲ء میں جب میں علی گڑھ کے کالج میں مدرس تھا۔ ایک رات خواب میں

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پہاڑی پر اکیلا گھوم رہا ہوں۔ اس کے دامن میں سرسبز وادی ہے جس میں کہیں کہیں پھول بھی نظر آتے ہیں۔ وادی کے وسط میں ایک عمارت تھی۔ میں پہاڑی سے اتر کر اس کی طرف گیا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ تمام تر سنگِ سُرخ کی بنی ہوئی ہے۔ چاروں طرف سے سیڑھیاں ہیں۔ سیڑھیوں کے اوپر پہنچ کر ایک چبوترہ بن گیا ہے جس کے چاروں کونوں پر چار بڑے بڑے کمرے ہیں۔ ان کے درمیان تقریباً تین تین گز چوڑے راستے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہیں۔ ان چاروں کمروں کے بیچ میں ایک گنبد ہے جو بہت بلند نہیں ہے۔ میں مشرق کی جانب سے چڑھا تھا۔ جب گنبد کے نیچے پہنچا اور اوپر کی طرف دیکھا تو اس میں پانچ غیر مادی انسانی پیکر جو نورانی تھے۔ اس طرح آئے جیسے فانوس میں تصویریں ہوتی ہیں۔ ان سب میں ایک زیادہ ممتاز تھا۔ میں حیرت سے دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ ان میں حرکت پیدا ہوئی اور روشنی کی طرح نیچے اتر کر جنوبی رُخ کر سیڑھیوں سے چلے گئے اس کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ مغربی جنوبی کمرے سے بہت سے آدمی جلدی جلدی نکل کر اس کے سامنے والے شمالی کمرے میں گھس رہے ہیں۔ کوئی کسی سے بولتا نہیں سب چپ ہیں، سب سر برہنہ ہیں اور جوان، سب کے سروں پر سیاہ گیسو ہیں اور چہروں پر سیاہ ڈاڑھیاں، ہر ایک کے جسم پر ایک ہی لباس ہے یعنی گردن سے پنڈلیوں تک سیاہ اطلس کی عبائیں جو کمروں پر ریشم کی ڈوریوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ یہاں کیا ہے؟ بولا کہ نماز با جماعت پڑھیں گے۔ میں نے کہا کہ میں بھی شریک ہو جاؤں اس نے کہا بے شک۔ سلام پھیرتے ہی وہ اسی طرح جلدی جلدی جنوبی کمرے میں جانے لگے جس طرح اس میں سے نکلے تھے۔ میری نگاہ کمرے سے نکلتے ہی گنبد کی طرف گئی اور میں نے دیکھا کہ وہ پانچوں شکلیں اپنی جگہ پر ہیں۔ میں نے ان نمازیوں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس ممتاز پیکر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟

اس نے کہا تم نہیں پہچانتے۔ یہ حضرت یوسفؑ ہیں۔ میں نے کہا ان کے بعد جواب دیا ابوبکرؓ۔ میں نے کہا پھر کون ہیں؟ بولا عمرؓ۔ میں حیران ہوا کہ یہ یوسفؑ کے ساتھ ابوبکرؓ و عمرؓ معلوم ہوتا ہے کہ یہ یوسفؑ ہمارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی کا دل کو یقین آگیا اور میں نے تعظیم کے ساتھ سلام کیا۔ آپ نے ایک شخص سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہ فلاں کا بیٹا فلاں آگیا ہے اس کی امانت اس کے حوالہ کر دو، وہ مسکراتا ہوا میری طرف آیا۔ پہلے ایک

کلام مجید دیا جس کو میں نے دائیں بغل میں دبایا۔ پھر سات رنگ کے شیشوں کی بنی ہوئی رحل جس کو بائیں بغل میں رکھا اس کے بعد قلم دان جس کو دائیں ہاتھ میں لیا۔ یہ چیزیں پاکر میرا دل خوشی سے معمور ہوگیا میں نے گردن جھکاکر شکریہ کا سلام کیا اور ان کو لیے ہوئے مغربی سیڑھیوں سے اتر کر چلا آیا۔

اس کے بعد سے روزانہ تلاوت میں فہم میں معنی کا نیا راستہ کھلنے لگا یعنی آیات کی تفاصیل خود آیات سے سمجھ میں آنے لگیں اور قرآنی حقائق کے چہرے سے نقاب اٹھنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ایک مدت مدید کے بعد دو حقیقتیں عین الیقین سامنے آگئیں۔

(۱) قرآن دین الٰہی کا کامل اور بے شائبہ مجموعہ ہے جو ہر زمان و مکان میں انسانی بصیرت کی تنویر اور اس کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔

(۲) قرآن مفصل کتاب ہے۔ جو اپنی تشریح میں سوائے عربی زبان کے مطلقاً کسی روایت یا انسانی خیال کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی ہر آیت بلکہ ہر لفظ کی تفسیر خود اسی میں ہے۔ اور اختلاف فہم کی صورت میں حقیقی مفہوم کے تعین اور فیصلہ کی وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

ان حقیقتوں کے ظہور سے قرآن اپنی پوری معجزانہ شکل میں میری بصیرت کے سامنے آگیا اور مجھے نظر آنے لگا کہ کیوں اس کی تعلیمات ہدایت رحمت محض شفاء لما فی الصدور بلکہ سراسر نجات ہے۔

اس نعمت عظمیٰ پر میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں جس نے قرآن نازل فرمایا اور اس کے سمجھنے کی توفیق دی اور اس دربار کا بھی جہاں سے یہ امانت مجھے ملی اور اپنے باپ کا بھی جس نے مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ پھر اس کو دل سوزی کے ساتھ پڑھایا اور اپنی نیم شبی مناجاتوں میں میری ہدایت کے لیے رو رو کر دعائیں مانگیں۔

انھیں دونوں باتوں کو سمجھانے کے لیے میں نے تعلیمات قرآن لکھ کر شائع کی جو اسلام میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یعنی قرآن کی تشریح خود قرآن سے اور اس کے کافی اور مکمل ہونے کی شہادت۔

یہ کتاب عقاید و اصول سے متعلق ہے۔ اب اسی لیجے پر میرے مخلص رفیق چودھری غلام احمد خاں پرویز بی۔ اے نے پورے قرآن کی آیات کو ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب اگر شائع ہوگئی تو قرآن کو قرآن سے سمجھنا نہ صرف آسان بلکہ دلکش مشغلہ ہوجائے گا۔ اور ترجموں اور تفسیروں سے یکسر بے نیازی ہوجائے گی۔ (بشکریہ نقوش آپ بیتی نمبر، لاہور)

جگن ناتھ آزاد

# غزل

دے فریب اور نہ دورِ ستم ایجاد مجھے
کہ اک اجڑی ہوئی محفل ہے ابھی یاد مجھے

جو سماں عمرِ رواں ساتھ لئے بیت گئی
وہ اب اے چشمِ تصور نہ دلا یاد مجھے

یہ الگ بات ہے میں نغمہ سرا ہو نہ سکوں
اب بھی کہتا ہے زمانہ تو چمن زاد مجھے

مجھ میں وہ پھول کہ اب جس کی تمنا یہ ہے
نو بہاروں کے زمانے نہ کریں یاد مجھے

میرے نغمے کا ہے مفہوم بہت اُن سے بلند
اور مشکل ہے کہ آتی نہیں فریاد مجھے

واپسی دورِ گزشتہ کی مرے بس میں نہیں
دوستو! اور زیادہ نہ کرو یاد مجھے

عشقِ زنداں سے تو انکار نہیں ہے لیکن
چین لینے جو نہ دے فطرتِ آزاد مجھے

شرابِ کہنہ

# نسیم

۱۸۱۱ء ---------- ۱۸۴۳ء

منشی دیاشنکر نسیم ابن پنڈت گنگا پرشاد کول، لکھنؤ کے ایک مشہور و معزز کشمیری پنڈتوں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اسی شہر میں پیدا ہوئے، صرف ۳۲ سال زندہ رہے، اور اتنی ہی تھوڑی سی عمر میں عزت اور شہرت حاصل کر کے راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔ دستور کے مطابق ابتدا میں اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی، بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ بیس سال کی عمر میں آتش کے شاگرد ہوئے۔ مشق اور مطالعے سے فارسی میں خاصی دستگاہ پیدا کر لی تھی نیز شعر و سخن میں بھی اپنے ہم عصروں میں قابلِ لحاظ سمجھے جانے لگے تھے۔

اردو مثنویوں میں قبولِ عام حاصل کرنے والی دو مثنویاں ہیں "سحر البیان" اور "گلزار نسیم" دراصل میر حسن ہی سے متاثر ہو کر یا اس کے جواب میں نسیم نے گل بکاؤلی کے مشہور قصے کو نظم کا جامہ پہنایا۔ پہلے یہ مثنوی نہایت طویل اور ضخیم تھی، استاد نے اختصار کا مشورہ دیا، ہنرمند شاگرد نے اس کو واقعی اتنا مختصر اور جامع کر دیا کہ آج تک سینکڑوں بار یہ مثنوی چھپی اور ہزاروں آدمیوں نے اسے پڑھا ہے۔ آج تک اس کی خوبیاں باقی اور لطف برقرار ہے اس کے بہت سے شعر ضرب المثل بن گئے ہیں۔

یوں تو نسیم نے غزلیں بھی کہی ہیں ۱۸۷۳ء میں "دیوان نسیم" بھی چھپ چکا ہے۔ مگر ان کی اصل شہرت اور مقبولیت کا سبب مثنوی گلزار نسیم ہے۔

جابجا منظر نگاری، بعض مناظر و واقعات کی عکاسی اور ترجمانی، اس کا ایجاز و اختصار، الفاظ کی برجستگی، محاورات، نادر تشبیہیں اور استعارے، رمز و کنائے، صنائع و بدائع اور بہت سی شاعرانہ خصوصیتیں اور التزامات اس کثرت اور حسنِ اہتمام سے اس مثنوی میں جمع کر دیے گئے ہیں کہ اپنی صنف کی ایک لاجواب بن گئی ہے۔ باوجود اس کے کہ اس میں تکلف اور تصنع سے بھی کام لیا گیا ہے۔ لیکن دوسری خوبیوں کے مقابلے میں ان کمیوں کا

زیادہ احساس نہیں ہوتا ہے۔

نسیم ایک بڑے متین شریف، باذوق، وضع دار اور بہت سی مشرقی قدروں کے آئینہ دار لوگوں میں سے تھے۔

# انتخاب

## تغزل

سمجھا ہے حق کو اپنی ہی جانب ہر ایک شخص
یہ چاند اس کے ساتھ چلا، جو جدھر گیا

گزرا جہاں سے میں، تو کہا سُن کے یار نے
قصّہ گیا، فساد گیا، دردِ سر گیا

---

رُوئے گُل رنگ پہ آخر خطِ سبز آ ہی گیا
ہے مثل جس سے ڈر رہے وہی آتا مُنہ پر

---

عشق کے رتبے کے آگے آسماں بھی پست ہے
سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

---

لائے اس بُت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

## مثنوی

جاگی مُرغ سحر کے غُل سے
اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے

دیکھا تو وہ گُل ہَوا ہُوا ہے
کچھ اور ہی گُل کھِلا ہوا ہے

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے

نرگس تو دکھا کدھر گیا گُل
سوسن تو بتا کدھر گیا گُل

سنبل مرا تازیانہ لانا
شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا

گھبرائیں خواصیں صورت بید
اک ایک سے پوچھنے لگی بھید

پتّا بھی پتے کو جب نہ پایا
کہنے لگیں کیا ہوا خدایا

جس کف میں وہ گُل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گُل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس　　　غفلت سے پھول پر پڑی اوس
گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا　　　غنچے کے کبھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
ادخار پڑا نہ تیرا چنگل　　　مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بستلا　　　خوش بو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
ہاتھوں کو ملا کہ ہیہات　　　خاتم بھی بدل گیا ہے بذات
یہ کہہ کے جنوں میں ہو غضبناک　　　خوں روئی، لباس کو کیا چاک
کتنی بس کہ غبار سے بھری وہ　　　آندھی سی اُٹھی ہوا ہوئی وہ
بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے　　　پتا نہیں حکم بِن ہلا ہے

سودائے الم ہے اب جو تحریر　　　حرفوں سے قلم ہے پا بہ زنجیر
کرتی تھی جو بھوک پیاس لب ہیں　　　آنسو پیتی تھی، کھا کے قسمیں
صورت میں خیال رہ گئی وہ　　　ہیئت میں مثال رہ گئی وہ

---

# نئی مطبوعات

| کتاب | مصنف | قیمت | ناشر |
|---|---|---|---|
| لکھنؤ کی پانچ راتیں | سردار جعفری | 3/50 | میرا اینڈ کمپنی، دہلی ۶ |
| مقدمہ شعر و شاعری | | -/85 | کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی ۶ |
| حدیثِ محبت | عزیز مخدومی | 2/50 | دار القران، دہلی ۶ |
| ایک گدھا نیفا میں | کرشن چندر | 4/- | پنجابی پستک بھنڈار، دہلی |
| جذبات و احساسات (شعری مجموعہ) | حکیم حیدر بیگ دہلوی | 3/50 | جامی پبلشنگ ہاؤس، بمبئی |
| سلمٰی (ناول) | سکندر اقبال | 10/- | کتابی دنیا، لکھنؤ |
| شجرِ حیات (افسانے) | نجم فضلی | 5/- | مکتبہ ماحول، کراچی |
| اس مملکت میں (ناولٹ) | 〃 | 2/- | 〃 〃 〃 |
| فانی اور ان کی شاعری | ڈاکٹر محمد حسن فاروقی | 2/50 | 〃 〃 〃 |

## زیرِ طبع

| کتاب | مصنف | ناشر |
|---|---|---|
| تحفۂ خلیل | جلال محمد خلیل الرحمٰن | خلیفہ بک ڈپو، رامپور |
| بہادر شاہ کا روزنامچہ | خواجہ حسن نظامی | خواجہ اولاد کتاب گھر، نئی دہلی ۱۳ |
| دلی کی جاں کنی | 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 |
| مزاحیہ شرح دیوانِ غالب | فرقت کاکوروی | ادارہ فروغِ اردو، لکھنؤ |

## بچوں کی مذہبی کتابیں

| کتاب | مصنف | قیمت | کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|---|---|---|
| ارکانِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | -/45 | سرکارِ دو عالم | محمد حسین حسان | 2/- |
| عقائدِ اسلام | 〃 〃 | -/50 | آں حضرت | الیاس احمد مجیبی | -/50 |
| پاک کہانیاں اول دوم | مقبول احمد سیوہاروی | 2/10 | چار یار | 〃 | 1/30 |
| مسلمان بیبیاں | اعجاز الحق قدوسی | -/75 | نبیوں کے قصے | خواجہ عبد الحئی فاروقی | -/80 |
| خلفاء اربعہ | خواجہ عبد الحئی فاروقی | 1/25 | ہمارے رسول | 〃 〃 | -/80 |
| رسولِ پاک | عبد الواحد سندھی | | ہمارے نبی | سید نواب علی رضوی | -/40 |

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## انشائے ماجد (اوّل)

(سن اشاعت دسمبر ۶۲ء)

مصنف: مولانا عبدالماجد دریابادی
صفحات: ۳۰۴　سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ مجلد
قیمت: پانچ روپے
ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

اردو نثر کی ترقی میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا حصہ بہت شان دار رہا ہے۔ فلسفہ۔ ترجمہ۔ تنقید و تبصرہ، انشا، اور سوانح سب ہی کو انھوں نے مالا مال کیا ہے۔ ان کے یہاں عالمانہ پیرایۂ بیان بھی ملتا ہے اور زبان کی شوخی و تیزی بھی۔ ادق الفاظ بھی موجود ہیں اور بول چال کی زبان بھی۔ غرض یہ کہ ہر جگہ ان کے قلم نے اپنے موضوع اور ماحول کی مناسبت سے ہی گل افشانی کی ہے اور اس خوبی کے ساتھ کہ ان کے طرزِ بیان کی انفرادیت اپنی جگہ بدستور قائم رہی ہے۔

"مقالات ماجد" کے عنوان سے اُن کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اب نظرِ ثانی اور ترمیم و اضافہ کے بعد اسے "انشائے ماجد (حصہ اوّل)" کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس حصے میں ایسے مضامین شامل ہیں جن کا تعلق زبان و ادب سے ہے۔ اس بارے میں مولانا نے فرمایا ہے کہ "بعض اُن میں سے نسبتہً حال کے ہیں اور بعض ۳۰، ۳۵ سال قبل کے۔"

خوشی کی بات یہ ہے کہ مولانا کے مضامین اب آسانی سے دست یاب ہو سکیں گے نظرِ ثانی کے بعد اس مجموعے کی لطافت و اہمیت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔ مقالات و صحافت کے میدان میں اب مولانا کا ہم عصر و ہم نوا کوئی موجود نہیں رہا۔ وہ تن تنہا اپنے دور کی یادگار ہیں۔ اس لیے ان کی نگارشات کا تحفظ ایک ادبی ذمہ داری ہے اور ان سے ہی نظرِ ثانی کرا لینا ایک سعادت۔ اردو ادب کے شائقین کو اس مردِ بزرگ کی سابقہ کاوشوں سے کما حقہٗ مستفید ہونے کا موقع ملنا چاہیے خدا کرے کہ ان کی جولانیٔ طبع بہار گل کھلاتی رہے۔

عبداللطیف بخش قادری

# انتخاب کلام راز یزدانی

مرتبہ: عابد رضا بیدار
ضخامت: ۳۲　سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: پچاس پیسے
ناشر: ادارۂ "نیا خواب" رام پور

اس کتابچہ میں جو دراصل جریدۂ "نیا خواب" کے ایک شمارۂ خصوصی کی حیثیت رکھتا ہے، راز کی غزلوں اور نظموں کے انتخاب کے علاوہ بابائے اُردو، رشید احمد صدیقی، نیاز فتح پوری، امتیاز علی عرشی اور اسلم خاں کی آراء کے ساتھ ساتھ خود عابد رضا بیدار کی قریباً چھ صفحات پر مشتمل ایک تحریر نیز حامد حسن قادری اور مشفق خواجہ کے مکتوبات شامل ہیں۔ حامد حسن قادری کے مکتوب الیہ راز یزدانی ہیں لیکن مشفق خواجہ کا مکتوب عابد رضا بیدار کے نام ہے جس میں تعزیت کے ساتھ راز کی شاعری کے متعلق بھی مختصراً اظہار خیال کیا گیا ہے۔

راز کی شاعری حقیقتاً رموز حیات و اسرار کائنات کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں وہ سب کچھ ہے جو ان کی زندگی میں تھا اور ہماری زندگیوں میں ہے۔ راز یزدانی کے متعلق عابد رضا بیدار کا یہ قول لائق تسلیم ہے کہ ان کی غزل پر سب سے گہرا اثر اصغر گونڈوی کے اسلوب سخن کا ہے نیز ان کے یہاں مومن کا طرز ادا اور غالب کا سا تفکر اور ناقدانہ انداز ملتا ہے۔

راز کی غزلوں میں بڑا تیکھا پن ہے اور یہ تیکھا پن خود ان کی زندگی، شخصیت اور ان کے ماحول کی دین ہے لیکن یہ ان کی فنکارانہ صناعی سے زیادہ شاعرانہ عالی ظرفی ہے کہ انھوں نے ہر زہراب اور تلخابہ کو پہلے اپنے دل کے جام میں سمویا ہے اور اس کی تلخیوں کو جس قدر ہو سکا ہے، کم کیا ہے تاکہ ان کی غزل، غزل رہ سکے۔ ان کی غزلوں میں دل بھی ہے اور دماغ بھی لیکن انھوں نے ہر موقع پر توازن اور تناسب کو برقرار رکھا ہے اور ان کی اسی ہنرمندی نے ان کی غزل گوئی کو حسین، عظیم اور وقیع بنا دیا ہے۔

کسی کے کلام کا انتخاب اس لحاظ سے بڑا نازک اور کٹھن کام ہوتا ہے کہ اس میں صاحب کلام کے زاویۂ فکر اور مرتب کی پسند، دونوں عناصر کو دخل ہوتا ہے جن کا خوش گوار امتزاج کسی انتخاب کو کامیاب بناتا ہے۔ چنانچہ خوشی کا مقام ہے کہ عابد رضا بیدار اس مرحلہ سے خوش اسلوبی کے ساتھ گزرے ہیں۔

مجموعہ کی کتابت و طباعت اور بہتر ہونی چاہیے تھی۔

سید حرمت الاکرام

# انتخاب غزلیات شاد عارفی

مرتبہ : عابد رضا بیدار
ضخامت : ۳۲ سائز $\frac{20\times30}{16}$
قیمت : پچاس پیسے
ناشر : ادارۂ "نیا خواب" رام پور

یہ انتخاب بھی عابد رضا بیدار کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور اسے بھی ادارۂ "نیا خواب" رام پور نے شائع کیا ہے۔ اس کتابچہ کے آخری چند صفحات ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور نیاز فتح پوری کی آراء کے علاوہ خود شاد عارفی کی مختصر تحریر کے حامل ہیں جس کے ساتھ سلطان اشرف کا مرتبہ ضمیمہ بھی منسلک ہے۔ شاد عارفی نے اس تحریر میں اپنے مختصر سوانح پیش کی ہے اور ضمناً یہ بھی لکھا ہے۔

"میرا اپنا ایک زاویہ فکر ہے۔ جو طنز و سیاست کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ "ندرت ادا" میرے نزدیک شعر کی جان ہے۔ اس لیے میں کسی بھی رنگ میں ندرت ادا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔"

اور بلاشبہ یہی ندرت ادا شاد عارفی کی شاعری کی جان بھی ہے۔ شاد نے انسانی معاشرہ ملکی رہنماؤں، سرمایہ داروں، مذہب کے اجارہ داروں نیز ہر اس فرد کو اپنے طنز کا ہدف بنایا جسے گمرہی میں مبتلا پایا لیکن یہ حقیقت اس سے زیادہ تلخ ہے کہ خود ان کی زندگی، ان کے تخلص پر تادم آخر طنز کرتی رہی۔

عروج زیدی کے قول کے مطابق "ان کا رشاد کا) فن بال سے باریک اور تیغ سے تیز تر ہے۔" چنانچہ شاد کی لغزش کسی اور کے لیے نقصان رساں ہو نہ ہو لیکن خود ان کے لیے خطرہ و ضرر کا باعث یقیناً ہو سکتی ہے۔ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے طنز میں گاہ گاہ مزاح کی چاشنی بھی آجاتی ہے اور ان پر اکبر الہ آبادی کے تتبع کا گمان گزرنے لگتا ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ ان کا لہجہ اپنا لہجہ اور ان کی آواز اپنی آواز ہے جس کی انفرادیت ہزاروں کے ہجوم میں پہچانی جا سکتی ہے البتہ اس لہجہ اور اس آواز میں تنقیدی کرختگی کی آمیزش یقیناً ہے۔

ان کی غزل پورے روایتی آداب و لوازم کی پابند نہیں اور نہ اس میں کلیتہً وہ عناصر ہیں جو غزل کے لیے مخصوص کر دیے گئے ہیں لیکن شاد کی غزل میں وسعت، حرارت اور صلابت لائی ہے۔ انھوں نے غزل سے نظم کا بھی کام لیا ہے اور اس کی نزاکتوں کو ٹھیس بھی لگائی ہے لیکن اس کو جلالت و توانائی بھی بخشی ہے۔ انھوں نے سودا، نظیر، [illegible] اور اکبر

ہے کسی نہ کسی معنی میں اثر ضرور قبول کیا ان کا کارنامہ محض اسی قدر نہیں ہے بلکہ انھوں نے ان اثرات کو یک جان وہم آہنگ کرکے نئے قالب میں ڈھالا اور اپنی لے کے لیے وہ بانکپن تلاش کیا جو ان کا اپنا سرمایہ ہے۔

مجموعہ کی کتابت اور بہتر ہونی چاہیے تھی۔　　سید حرمت الاکرام



# کشکول باطن حصہ دوم

مولفہ: مولانا عبدالباطن صاحب جون پوری
صفحات: ۱۰۴　سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ایک روپیہ ۱۲ پیسے
ناشر: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی

کتابیں سب لوگ پڑھتے ہیں، لیکن بہت کم لوگ انھیں ہضم کرپاتے ہیں پر جو لوگ ایسا کر لیتے ہیں وہ "صاحب کتاب" بھی بن جاتے ہیں۔ مولانا عبدالباطن صاحب جون پوری نے یہ سب کام کیے ہیں۔ اور اس کی مثال ان کی کتاب "کشکول باطن" ہے، یہ مجموعہ ہے ان نوٹس اور اقتباسات کا جو انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف کتابوں سے لیے ہیں، اور چوں کہ مطالعہ کا مرکز اکثر مذہبی کتابوں کا رہا ہے اس لیے اس کشکول میں مذہب و دین سے متعلق اکثر مضامین بہت ہی اختصار اور جامعیت کے ساتھ آگئے ہیں، اس مختصر سی کتاب میں صوفیا کے اقوال و مواعظ کے علاوہ بہت مفید حدیثوں کا ترجمہ اور ان پر بیانیہ اشارے بھی ہیں، چناں چہ بخاری شریف، مسلم شریف، مشکوۃ شریف، ترمذی شریف، مسند امام احمد، ابوداؤد شریف سے متعدد حدیثیں نقل کی گئی ہیں متقدمین صوفیا میں سے مشہور صوفی خاتون حضرت رابعہ بصریہ کا تذکرہ ہے، اقوال و مواعظ میں مولانا اشرف علی تھانوی کے بعض ملفوظات کا ذکر ہے۔ کتابوں سے اقتباسات اس طرح لیے گئے ہیں کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اساسی اصول کی اہمیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ چناں چہ توحید، ذکر و فکر، دعا و مناجات، اکل حلال، غربا پروری، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، نفاق کی برائی، عمل صالح، اور اس پر اخلاق نیت کے ساتھ جمے رہنے سے متعلق مفید اور مستند اقوال و احکامات خوب صورتی اور اختصار کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو محض خوش اعتقادی پر مبنی ہیں، اور جن کی سند مستند کتابوں میں یا سائنسی تحقیقات کے مطابق نہیں ملتی مثلاً چاند میں انسانوں کا پایا جانا، اور ان کا معجزہ

شق القمر سے متاثر ہو کر ایمان لانا اور اس ایمان پر اب تک باقی رہنا، یہاں تک جب موجودہ سائنسداں چاند میں پہونچیں گے تو ان لوگوں کے ایمان کو دیکھ کر خود بھی مشرف بہ اسلام ہو جائیں گے (صفحہ ۲۹) یا حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کے زمین کریدنے سے پتھر کا ظاہر ہونا اور اس میں سے پانی کے چشمہ کا بہہ نکلنا (صفحہ ۱۳) اس قسم کی باتیں اوّل تو تحقیق سے ثابت نہیں ہیں، پھر یہ بالکل ہی خلاف عقل ہیں، اور محض تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتی ہیں، مگر مؤلف نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ ہے وہ ضروری نہیں کہ مستند بھی ہو، کیوں کہ یہ توکشکول ہے، اور کشکول میں رطب و یابس ہر چیز ہوتی ہے۔ بہرحال کتاب مجموعی حیثیت سے اچھی ہے اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے خاص طور سے بہت مفید ہے۔

عبدالحلیم ندوی

---

# پاکستانی مطبوعات

یہ دلی ہے — سید یوسف بخاری — ۵/-
جماعت اسلامی اور اسلامی دستور — محمد سرور — ۲/۱۵
مولانا مودودی کی تحریک اسلامی — 〃 — ۴/۵۰
رات چور اور چاند — بلونت سنگھ — ۷/-
تعلید و اجتہاد — مولانا اشرف علی تھانوی — ۱/۱۲
روح تصوف — 〃 — ۳/۵۶
روبالی — عذرا جمال — ۷/۵۰
علم بیان — ناصرالدین محمد اسدالرحمٰن — ۲/۵۰
ابوجہل — ایم اسلم — ۸/-
اکسیر اعظم — فیروز سنز — ۱/۶۲
حیدر علی — 〃 — -/۶۲
سونے کی وادی — 〃 — ۱/-
زمین کے خزانے — 〃 — ۲/۲۵
خلفائے راشدین — 〃 — ۱/۷۵
غبارے میں پانچ ہفتے — جولزن ورن — ۱/۵۰
اسلامی افسانے — مقبول انور داودی — ۱/۵۰
انبیائے کرام — 〃 — ۱/۵۰
سیدالانبیاء — پروفیسر غلام ربانی — ۷۵/-
صحابیات کی زندگی — مرزا ادیب — ۷۵/-
ایک مسافر — 〃 — ۱/۵۰
ہمارے رہنما — محمد اقبال — -/۵۶
ننھی پروین — جلیل قدوائی — ۱/-

حکایات لقمان — سید شریف حسین انور — ۷۵/-
بچوں کے شکسپیر — کامل خلیل — ۲/-
رسول عربی — عبدالسلام خورشید — ۱/-
کلیات ساحر — ساحر لدھیانوی — ۴/-
آئین اسٹائن کی کہانی — رئیس احمد جعفری — ۴/-
الف — رئیس امروہوی — ۵/-
بچوں میں جذبہ عداوت — مترجم شاہد احمد دہلوی — ۱/۷۵
انتخاب معاش — 〃 — ۱/۷۵
والدین اور معلمین — 〃 — ۱/۷۵
خود شناسی — 〃 — ۱/۷۵
بچے کی جماعتی زندگی — 〃 — ۱/۷۵
بچوں کے کھیل — 〃 — ۱/۷۵
آپکے بچے کی وراثت — 〃 — ۱/۷۵
تم اور تمہارے مسائل — 〃 — ۱/۷۵
بچوں کے خوف — 〃 — ۱/۷۵
بچوں کی سیکھنے کی قابلیت بڑھانا — 〃 — ۱/۷۵
بچوں کے جذباتی مسائل — 〃 — ۱/۷۵
آپ کے بچے کی صحت — 〃 — ۱/۷۵
کامیاب باپ — 〃 — ۱/۷۵
بچے کی اخلاقی قدریں — 〃 — ۱/۷۵
بچوں کی دلچسپیاں — 〃 — ۱/۷۵
مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی — مترجم سید قاری عظیم

آپ دوست بن جائیں مترجم سید وقار عظیم ۱/۷۵
بیماری کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو " ۱/۷۵
بچوں کی بدتمیزیاں " ۱/۷۵
انسانی مشین مترجم مولانا صلاح الدین احمد ۱/۷۵
نٹ کھٹ ہاتھی بچہ مترجم سید نسیم ہمدانی ۱/۷۵

شخصیت کا مطالعہ مترجم عبدالرؤف ۱/۷۵
بچوں کو سمجھنے میں نفسیاتی امتحانوں کی اہمیت
مترجم علی ناصر زیدی ۱/۷۵
تمہارا روپیہ اور اس سے متعلقہ مسائل مترجم سید سبط حسن ۱/۷۵
تاریخ بھی مزے کی چیز ہے عبدالمجید سالک ۲/-

# اُردو کا کلاسیکی ادب

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| مذہب عشق | از | نہال چند لاہوری | مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی | ۲/- |
| قواعد اُردو | " | مشہور بہ رسالہ گل کرسٹ | " " " | ۲/- |
| بہار دانش | " | مرزا جان طپش | " " " | ۳/- |
| نورتن | " | محمد بخش مہجور | " " " | ۲/۷۵ |
| یادگار غالب | " | خواجہ الطاف حسین حالی | " " " | ۹/- |
| دیوان درد | | حالات زندگی اور کلام پر بسوط تبصرہ | " " " | ۳/۵۰ |
| سروش سخن | " | سید محمد فخر الدین حسین سخن | " " " | ۵/- |
| آرائش محفل | " | میر شیر علی افسوس | " کلب علی خاں فائق | ۸/- |
| مہتاب داغ | | نواب میرزا خاں داغ دہلوی | " سید سبط حسن | ۴/۵۰ |
| ابن الوقت | | ڈپٹی نذیر احمد | " " " | ۳/۵۰ |
| مرقع لیلیٰ مجنوں | " | مرزا ہادی رسوا | " عشرت رحمانی | ۳/۵۰ |
| وکرم اروسی | " | مہاکوی کالی داس | ترجمہ " | ۱/۷۵ |
| فردوس بریں | | عبدالحلیم شرر | مرتبہ وقار عظیم | ۲/- |
| جوہر اخلاق | " | جیمز فرانسس کارکرن | " پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر | ۱/۵۰ |
| موعظۂ حسنہ | | ڈپٹی نذیر احمد کے سبق آموز خطوط کا مجموعہ | مقدمہ پروفیسر افتخار احمد صدیقی | ۴/- |
| فسانۂ مبتلا | | ڈپٹی نذیر احمد | مرتبہ " " | ۴/۵۰ |
| امراؤ جان ادا | از | مرزا رسوا لکھنوی | " ظہیر فتح پوری | ۵/- |
| سوانح مولانا روم | " | شبلی نعمانی | " سید عابد علی عابد | ۵/۵۰ |

| کتاب | | مصنف | | مرتب | قیمت |
|---|---|---|---|---|---|
| حیات سعدی | از | خواجہ الطاف حسین حالی | مرتبہ | شیخ محمد اسماعیل پانی پتی | ۲/۵۰ |
| مسافران لندن | 〃 | سر سید احمد خاں | 〃 | 〃 〃 〃 〃 | ۳/- |
| اخلاق ہندی | 〃 | میر بہادر علی حسینی | 〃 | کارکنان مجلس ترقی ادب | ۳/- |
| توتا کہانی | 〃 | حیدر علی بخش حیدری | 〃 | 〃 〃 〃 〃 | ۲/۵۰ |
| قصص ہند | 〃 | محمد حسین آزاد | 〃 | 〃 〃 〃 〃 | ۲/- |
| خرد افروز | 〃 | حفیظ الدین احمد | 〃 | 〃 〃 〃 〃 | ۴/۵۰ |
| رسوم ہند | 〃 | پیارے لال آشوب کپتان فلوجے، ہالرائیڈ | 〃 | 〃 〃 〃 〃 | ۳/۵۰ |
| مقالات سرسید | 〃 | سر سید احمد خاں (۱۳ حصے) | 〃 | شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی | ۵۳/۷۵ |
| جامع الحکایات ہندی | 〃 | شیخ صالح محمد عثمانی | 〃 | پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر | ۳/- |

# پاکستانی رسائل

| رسالہ | شمارہ | قیمت | رسالہ | شمارہ | قیمت |
|---|---|---|---|---|---|
| نقوش | پطرس نمبر | ۷/- | نگار | خدا نمبر | ۳/- |
| 〃 | شوکت نمبر | ۷/- | 〃 | نگار کے تذکروں کا تذکرہ نمبر | ۴/- |
| 〃 | لاہور نمبر | ۱۵/- | 〃 | نیاز نمبر کامل | ۹/- |
| 〃 | آپ بیتی نمبر | ۲۰/- | سویرا | نمبر ۲۷ | ۲/- |
| افکار | افسانہ نمبر (تازہ) | ۳/- | 〃 | نمبر ۲۸ | ۴/- |
| 〃 | عام شمارہ نمبر ۱۴۷ | ۱/- | 〃 | نمبر ۳۲ | ۳/- |
| 〃 | 〃 نمبر ۱۵۱ | ۱/- | نقش | مارچ ۶۱ء | ۱/- |
| 〃 | حفیظ نمبر | ۷/- | 〃 | فروری ۶۱ء | ۱/- |
| 〃 | تازہ شمارہ | ۱/- | 〃 | اپریل ۶۱ء | ۱/- |
| ساقی | جوش نمبر | ۶/- | اردو نامہ | جنوری تا مارچ ۶۳ء | ۱/- |
| نگار | ہندی شاعری نمبر | ۴/- | 〃 | اکتوبر تا دسمبر ۶۲ء | ۱/- |
| 〃 | نظیر اکبرآبادی | ۳/- | 〃 | جنوری تا مارچ ۶۴ء | ۱/- |
| 〃 | اقبال نمبر | ۳/- | 〃 | تازہ شمارہ | ۱/- |
| | مصحفی نمبر | ۲/- | | | |

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ۔ ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی ۳

# ادبی خبریں

## سہ لسانی فارمولہ

مرکزی حکومت ہندی بولنے والی ریاستوں میں سہ لسانی فارمولے کو بروئے کار لانے کے لیے امداد دینے پر غور کر رہی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ غیر ہندی بولنے والی ریاستیں بھی اس فارمولے کو نافذ کر رہی ہیں لیکن ہندی بولنے والی ریاستیں اس کے نفاذ میں پیچھے رہ گئی ہیں۔ ان ریاستوں کا کہنا ہے کہ وہ ہندی، انگریزی اور سنسکرت پڑھا کر فارمولے کو نافذ کر رہی ہیں۔ مرکز نے ان کی یہ تجویز اس بنیاد پر مسترد کر دی ہے کہ سنسکرت کو فارمولے میں تیسری زبان کی حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ نئی تجاویز کے تحت مرکز، ہندی بولنے والی ریاستوں کے اساتذہ کی تربیت، ان کی تنخواہوں اور درسی کتب کے اخراجات دینے کے لیے بھی تیار ہے۔

## ادیبوں کو سرکاری انعامات

مرکزی وزارت تعلیم نے ہندوستان کی بارہ زبانوں کے ۲۷ ادیبوں کو ایک ایک ہزار روپے کے انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ انعام ایک ادبی مقابلے کے نتیجے میں دیے جا رہے ہیں۔ اُردو کی مندرجہ ذیل کتابیں انعام کی مستحق قرار پائی ہیں۔

قومی جھنڈے کی کہانی ——— ابراہیم فکری

ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے ——— اطہر پرویز

## کرشن چندر پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری

الہ آباد یونیورسٹی کے مسٹر احمد حسین کو ان کے تحقیقی مقالے "کرشن چندر" اس کی حیات اور تصانیف" پر الہ آباد یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے۔


کتاب نما

| سالانہ ایک روپیہ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ | فی پرچہ دس پیسے |
|---|---|---|

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

# ماہنامہ کتاب نمائی دہلی

منیجنگ ایڈیٹر
غلام ربانی تاباں

شمارہ نمبر ۹ | ستمبر ۱۹۶۴ء | جلد نمبر ۵

## اشاریہ

ہمیں خوشی ہے کہ مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والی معیاری اور سستی کتابوں کے نئے سلسلے کی پہلی کتاب "باغ و بہار" آج کل طباعت کی آخری منزلیں طے کر رہی ہے اور اب بہت جلد منظر عام پر آنے والی ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی ذکر کیا تھا، اس نئے سلسلے میں ان کتابوں کو پیش کیا جائے گا جو ہمارے ادب میں مسلمہ حیثیت رکھتی ہیں اور جو زبان و ادب کے لحاظ سے شاہکار مانی جاتی ہیں اور جن کے بغیر نہ کوئی اچھی لائبریری مکمل ہو سکتی ہے اور نہ زبان و ادب کے طالب علم اس سے بے نیاز رہ سکتے ہیں۔ مکتبہ جامعہ نے ان کتابوں کی ترتیب و تصحیح میں اس اصول کو بنیاد بنایا ہے کہ ایسی کتابوں کا متن مفید ترین اشاعت پر مبنی ہو اور ان کتابوں کے اوّلین ایڈیشن یا بصورت دیگر قابل ذکر اشاعتوں کو پیش نظر رکھا جائے اور قدیم سے قدیم نسخوں کی مدد سے ان کو مرتب کیا جائے۔ اسی اصول کی بنیاد پر ۱۸۰۳ء میں پہلی بار کلکتے سے شائع ہونے والے میر امّن کے شاہکار "باغ و بہار" کو شائع کیا گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری یہ پہلی کتاب ارباب ذوق کی پسندیدگی کی سند حاصل کرے گی اور عمومی طور پر اس سلسلے کو ہر جگہ پسند کیا جائے گا۔

مکتبہ جامعہ کے بہی خواہ اور کرم فرما یہ سن کر یقیناً خوش ہوں گے کہ مکتبہ جامعہ کا اب اپنا ایک پریس (مطبع) بھی قائم ہو گیا ہے۔ مکتبہ جامعہ کا یہ پریس لبرٹی آرٹ پریس (LIBERTI ART PRESS) کے نام سے موسوم ہے اور بالمقابل پٹودی ہاؤس، فیض بازار، دریا گنج، دہلی میں واقع ہے۔ اس پریس کے لیے ایک عمدہ آٹومیٹک آفسٹ مشین بھی حاصل کر لی گئی ہے۔ کل امید ہے یہ پریس ستمبر کے آخر تک اپنا کام شروع کر سکے گا۔

رشید احمد صدیقی

# آشفتہ بیانی میری

میری تحریروں میں یہ نقص بتایا جاتا ہے کہ ان میں "علی گڑھ" بہت ہوتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ جو علی گڑھ سے کم یا بالکل واقف نہیں ہوتے ان کو ان مضامین یا اس طرح کی باتوں سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس حرکت سے بعض احباب مجھ سے چڑھنے بھی لگے ہیں۔ ان سب سے مجھے بھی ایک شکایت ہے، وہ یہ کہ وہ خود علی گڑھ سے کیوں نہیں واقف ہیں! اُردو جاننا اور علی گڑھ سے واقف نہ ہونا بجائے خود کسی فتور کی علامت ہے۔ اُردو کا نام علی گڑھ بھی ہے۔

کسی اجنبی سے ملاقات ہوتی ہے اور اس کے طور طریقوں سے خوش ہوتا ہوں تو اکثر پوچھ لیتا ہوں کہ وہ کبھی علی گڑھ کا طالب علم رہا ہے یا نہیں۔ ہوتا ہے تو اس کے خوش اوقات خوش مذاق ہونے پر تعجب نہیں ہوتا ورنہ افسوس ہوتا ہے کہ وہ اس نعمت سے بھی کیوں محروم رہا۔ اس سے یہ جتانا مقصود نہیں کہ علی گڑھ کا ہر پڑھا لکھا ہر خوبی سے متصف ہوتا ہے اور جو علی گڑھ کا نہیں ہوتا وہ ان خوبیوں سے ہوتا ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علی گڑھ کا ایک خاص رنگ، رکھ رکھاؤ یا ٹھپا ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز یا متاثر کرتا ہے۔ اس ٹھپے کے بھی اقسام ہیں، بعض پسندیدہ بعض ناپسندیدہ۔ علی گڑھ کوئی جنت یا جہنم نہیں ہے جہاں صرف منتخب لوگوں کے قیام و طعام کا بندوبست رہتا ہو، وہ تو اسی دنیا جیسی دنیا ہے جہاں اپنی جنت یا جہنم بنانے کی ہر شخص کو آزادی ہوتی ہے محض علی گڑھ کا ہونا کسی شخص کے معقول ہونے کی دلیل نہیں، جس طرح محض مسلمان ہونا کسی کے معقول و معتبر ہونے کا ثبوت نہیں!

علی گڑھ میگزین کے "علی گڑھ نمبر"[1] میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ علی گڑھ

---

[1] جو حال ہی میں شائع ہوا ہے اور جس کا دوسرا ایڈیشن بعد نظر ثانی عنقریب یونیورسٹی سے شائع ہوگا۔

کیا ہے اور کیوں ہے۔ اس نمبر کے شائع ہونے سے مجھے یہ فائدہ پہنچا کہ بہت سی باتیں بھلانے بتانے سے بچ گیا، جس کو مجھ سے کہیں بہتر طور پر دوسرے عزیزوں اور بزرگوں نے واضح کر دیا۔ ان مقالات کی روشنی میں میرے تاثرات اور تجربات کے سمجھنے میں آسانی ہوگی اور غالباً دلچسپی بھی۔ زیر نظر صفحات میں جو کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا وہ علی گڑھ کے بارے میں ایسے دیرینا اور مسلسل تاثرات ہیں جواب میرے لیے تجربے کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس طرح ممکن ہے ان میں "واقعیت" کی کمی ہو لیکن اس کو کیا کروں بعض اوقات مجھے اپنے تاثرات اپنے تجربات سے زیادہ عزیز اور زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔ یوں بھی مخلصانہ خامی کو میکانکی، خوبی پر کبھی کبھی ترجیح دیتے رہنا چاہیے۔ یہ بات ان سطور کے پڑھنے والوں کے لیے قابل وقعت ہو یا نہ ہو ان سطور کے لکھنے والے کے لیے بہت اہم رہی ہے۔

جن باتوں کو جس طرح بیان کرنا چاہتا ہوں معلوم نہیں اس میں کامیابی ہوگی بھی یا نہیں۔ اس وقت کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے میرا حال وکٹر ہوگیو[1] کے مشہور ناول "دی ہنچ بیک آف نوتردام" کے عجیب الخلقت کریہہ منظر کبڑے کازی مادو کا سا ہو جو مدت العمر نوتردام گرجے کا گھنٹہ بجانے پر مامور رہا اور بجاتے بجاتے اس پر ایسی وارفتگی طاری ہوتی تھی جیسے وہ نوتردام میں یا نوتردام اس میں پیوست ہو گیا ہو! ممکن ہے میں علی گڑھ کے نوتردام کا کبڑا بن گیا ہوں!

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ میری پسند ناپسند، رہن سہن، گفتار و کردار اور فکر و نظر جسے بحیثیت "مجموعی شخصیت" کہہ سکتے ہیں، سب کی سب علی گڑھ میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر یا تشکیل کے لیے بہت کچھ خام مواد اپنے گھر اور اسکول سے لیا تھا۔ لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت اور صورت و معنی علی گڑھ نے دیے۔

---

[1] The Hunck Back of notre-Dame Victor Hugo

[2] Quasnmado یہ فرانسیسی زبان کا ناول ہے۔ فرانسیسی تلفظ میں اس کا نام "وکٹر ہیوگو کا "نوتردام دپاری یعنی پیرس کا گرجا گھر NoTre Dame Patis by Victor Hugo اس کا ہیرو ایک کبڑا ہے جس کا نام کازی مادو (Quasimado) ہے جو خود کو نوتردام (یعنی گرجا گھر) میں جذب کر دیتا ہے اور اپنی الگ ہستی نہیں مانتا اس ناول کی بنا پر انگریزی میں ایک فلم بھی بنا ہے جس کا نام "دی ہنچ بیک آف نوتردام" یعنی نوتردام کا کبڑا، بنا ہے۔

اگر میں علی گڑھ میں نہ آتا اور میری صلاحیتوں کا سابقہ اس کسر و انکسار سے نہ ہوتا جو علی گڑھ کہلاتا ہے تو مجھے اندیشہ ہے وہ صلاحیتیں (کل نہیں تو اکثر) مفید ہونے کے بجائے میرے اور دوسروں کے لیے مضر ثابت ہوتیں۔ اب تک میں نے نہ کبھی محسوس کیا نہ کسی نے بتایا کہ مجھ پر علی گڑھ کا جو اثر ہوا وہ فی الجملہ میرے یا دوسروں کے لیے نامبارک ثابت ہوا۔ البتہ علی گڑھ نے جتنا فائدہ مجھے پہنچایا، اس سے یقیناً بہت کم میں اسے پہنچا سکا۔

مجھے اپنی کمزوریوں کا اعتراف ہے اور اس کے جواز میں کسی طرح یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ایسا کون ہے جس میں کمزوریاں نہیں ہوتیں! لیکن یہ علی گڑھ کی دی ہوئی نہیں ہیں۔ میں ان کو ساتھ لایا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ شاید علی گڑھ کی پیدا کی ہوئی مجھ میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔ اگر ہے تو اس کو بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے جب تک آدمی رتبے میں بہت بڑا نہ ہو جائے کمزوریوں کے اقرار کرنے میں نہ اس کا فائدہ ہے نہ دوسروں کا۔ پولیس کی دست اندازی یا ملاؤں کی دست درازی کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔

بہت دنوں کی بات ہے، گو بڑھاپے کی وجہ سے کل کی بات معلوم ہوتی ہے، جب طالب علمی سے معلمی کے حدود میں داخل ہوا تھا۔ میں نے اپنی ایک کتاب "طنزیات و مضحکات" کا انتساب علی گڑھ کے نام ان الفاظ میں کیا تھا: "اپنے کالج کے نام جس کے فیضان نے کسی دوسرے کے فیضان کا محتاج نہ رکھا" حال ہی میں ایک اہم موقع پر جہاں فضلائے عظام کا اجتماع تھا جس میں علی گڑھ اور باہر کے حضرات بھی شامل تھے، سوال کیا گیا کہ میں نے لکھنے کا انداز کہاں اور کیوں کر پایا۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے، بے اختیار زبان پر یہ فقرہ آیا: "علی گڑھ نے دیا"، تفصیل کسی نے نہ پوچھی۔ مطمئن سب ہو گئے!

ایڈیٹر "علی گڑھ میگزین" کا مضمون کے لیے تقاضا انتہا کو پہنچ گیا اور میں بھی بے حسی یا بے غیرتی کی آخری حد تک پہنچ گیا تو ذہن میں یہ بات آئی کہ کسی دوسرے موضوع پر لکھنے کے بجائے اسی امر کو واضح کرنے کی کوشش کیوں نہ کروں کہ علی گڑھ نے مجھے کیا دیا اور کیسے دیا!

پھر یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ شاید مجھ پر یہ الزام رکھا جائے کہ میں اپنا پروپیگنڈا (PROPaganda) کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ میرا پروپیگنڈا (PROPaganda) دوسرے کیا کم کرتے ہیں کہ میں خود کرنے لگوں۔ پھر عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں پروپیگنڈا (PROPaganda) نہیں کرتے، توبہ و استغفار کرتے ہیں

یا عقد ثانی و ثالث۔ مجھے اب تک ان میں سے ایک کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ ممکن ہے آئندہ بھی نہ ہو۔ اس لیے کہ کچھ اس طرح کا اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں توبہ و استغفار اور عقد ثانی و ثالث لازم و ملزوم تو نہیں ہیں ؟

ایک بات کا اور خیال آتا ہے۔ وہ یہ کہ علی گڑھ نیز اپنے بارے میں اکثر لکھتا رہا ہوں کبھی اپنی عادت سے بے اختیار ہو کر کبھی دوستوں اور عزیزوں کے تقاضے سے برافروختہ ہو کر۔ نادانستہ طور پر بھی وہی باتیں یہاں دہرائی گئیں تو ممکن ہے ناظرین پر گراں گزریں لیکن اتنی فرصت نہیں اور جی بھی نہیں چاہتا کہ پچھلی تحریروں میں اس طرح کے حالات اور واقعات اس خیال سے تلاش کرتا پھروں کہ ان کو یہاں دہرانے سے بچوں! ضمناً یہاں اپنی ایک کمزوری کا بھی اعتراف کر لینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اب تک جتنے مضامین لکھ چکا ہوں وہ سب میری نظر سے گر چکے ہیں۔ اگر کوئی ان کا ذکر خیر کرتا ہے، لیکن مجھ سے طاقت ور ہوتا ہے تو درگزر سے کام لیتا ہوں، کمزور ہوتا ہے تو اقلاً اس کو مار ڈالنے کا جی چاہتا ہے! اسی بنا پر میں اپنے مطبوعہ مضامین دوبارہ پڑھنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اپنے چھپے ہوئے مضامین بہ طیب خاطر شاید ہی میں نے دوبارہ پڑھے ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں ایسے لوگ ناپید نہیں ہیں جو اپنے کس مپرس رشتہ داروں یا ہم وطنوں سے رتبے یا روپے کے اعتبار سے اونچے ہو جاتے ہیں تو ان سے تمام عمر منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔

اور فرض کر لیجیے کسی معذوری کی بنا پر میں اس حقیقت کو تفصیل سے نہ بیان کر سکوں کہ علی گڑھ کسی اور کے لیے نہیں تو خود علی گڑھ والوں کے لیے ادب اور زندگی کے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صالح و صحت مند لائحہ عمل رکھتا ہے اور اس اعتبار سے ادب اور زندگی کا اس کا ایک مخصوص اور مسلمہ اسلوب بھی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی نہ کوئی علی گڑھ کا ہو خواہ باہر کا کبھی نہ کبھی اس حقیقت کو ثابت کر سکے گا جس کی وضاحت کی ایک کمزور اور ناتمام کوشش آج میں ان صفحات میں کر رہا ہوں۔

---

رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کا زمانہ اسکول میں بڑے لطف کا گزرا۔ اچھے ساتھی، ان سے اچھے اُستاد اور سب سے اچھے اپنے ماں باپ بھائی بہن پھر دوستوں کے ماں باپ بھائی بہن ——— سبھی تو مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ان سب کی محبت نے دل میں اپنی وقعت کچھ

اس طرح سے روشن کردی تھی اور دوسروں کی عزت و خدمت کرنے کا ایسا حوصلہ پیدا کردیا تھا کہ تمام عمر کسی حال میں ادنیٰ درجے کی حرکت کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ البتہ ریاضی اور اس کی ذریات "الجبرا، اقلیدس اور مساحت" ایسے تھے جن سے تمام عمر دوستی تو درکنار کسی شرط پر مفاہمت تک نہ ہوسکی۔ ان سبھوں نے مجھے اور میرے دوستوں کو ایسا رسوا کیا کہ ع

انگلیاں دور سے اٹھتی تھیں کہ وہ آتے ہیں

ہم تین چار دوست ایک ہی بینچ (Bench) پر ہر درجے میں سالہا سال بیٹھتے آئے۔ ریاضیات میں ہم سب کے حاصل کردہ نمبر جوڑ دیے جاتے جب بھی پاس مارکس Pass Marks تک رسائی نہ ہوتی! امتحانات میں ہم سب کے نمبر دوسرے مضامین میں بہت اچھے آتے تھے، اچھے کھلاڑی ہونے کا بھی لحاظ کیا جاتا، اس لیے ترقی دے دی جاتی۔ ہم کو اس کی سخت کوفت تھی کہ دوسرے مضامین میں تو اکثر تیس چالیس فی صدی تک ہماری باتیں کتابی باتوں کے مقابلے میں مان لی جاتی تھیں، ریاضیات میں آخر کیا سرخاب کا پر لگا تھا کہ ایک شوشہ، ایک صفر تک کا ہیر پھیر ہماری خاطر گوارا نہیں کیا جاتا تھا! اس زمانے میں اقوام متحدہ (یونائیٹڈ نیشنز) United Nations قسم کا کوئی ادارہ نہ تھا ورنہ ہم اس مسئلے کو وہاں ضرور لے جاتے، کوئی فیصلہ ہو پاتا یا نہیں، مشاعرہ تو ہوتا رہتا۔

انٹرنس (Entrance) میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول جون پور سے کیا۔ اس عہد کے بورڈنگ ہاؤس کی زندگی آج کل کی زندگی سے بہت مختلف تھی۔ خاص طور پر جون پور کے اس بورڈنگ ہاؤس کی جہاں نہ خاص قسم کی کوئی نگرانی کی جاتی تھی، نہ قواعد و ضوابط کی ایسی کچھ پابندی تھی۔ عموماً ہر سینیر (Senior) لڑکا جونیر (Junior) لڑکے کا نگراں ہوتا۔ یہ بڑی کڑی نگرانی تھی جس سے کسی کو مفر نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر لڑکے کے نگراں، خواہ وہ جونیر ہو یا سینیر، کسی لڑکے کے دور یا قریب کے وہ رشتے دار ہوتے جن میں سے اکثر کسی نہ کسی کام سے شہر آتے ہوتے اور بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوتے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم ان کا کہنا نہ مانے یا ان کی موجودگی میں اس سے کسی قسم کی لاپرواہی یا بے راہ روی سرزد ہو جائے۔

یہ لوگ قدیم تہذیب اور وضع داری کا نمونہ ہوتے اور اسلاف کے حالات اس

شفقت اور اس دل چسپ انداز سے سناتے اور اخلاق و تہذیب کے حدود میں رہنے کی نصیحت اس پیرائے میں کرتے کہ لڑکوں پر بڑا اچھا اور گہرا اثر پڑتا۔ اسکول یا بورڈنگ ہاؤس کے حکام ان رشتے داروں سے تعرض کرنا درکنار ان کا خیر مقدم کرتے اس لیے وہ جانتے تھے کہ طلبا پر ان رشتے داروں کا اثر سرکاری نگرانی سے کہیں زیادہ بہتر پڑتا ہے۔

جون پور تاریخی شہر ہے وہاں شاہان شرقی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ کئی جید مسجدیں، مزارات اور مقبرے، ایک عالی شان قلعہ، عید گاہ، پل، پختہ سرائے اور کتنے سارے کھنڈر شاہی زمانے کے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دریائے گومتی وسط شہر سے گزرتا ہے جس پر شاہی زمانے کا بڑا مضبوط پل ہے برسات میں بالضرور طغیانی آتی ہے۔ یہ زمانہ شہر میں تردد اور تفریح دونوں کا ہوتا ہے۔ شہر سے متصل دریا کے کنارے شاہان شرقی کا ویران قلعہ ہے، کتنا اونچا، مستحکم اور شان دار۔ پل کے ایک سرے پر پبلک لائبریری کی دو منزلہ عمارت ہے جس کی دیوار کے ایک رخ پر دریا کا اتار چڑھاؤ ظاہر کرنے کے لیے نمبر لگا دیے گئے ہیں۔ اس لائبریری میں شہر کے ثقات و اشراف، اتنا کتابیں یا اخبار پڑھنے کے لیے نہیں جتنا شام کو مل بیٹھنے کے لیے جمع ہوتے، شعروادب کی باتیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے قلعہ اور دریا کی سیر کرتے اور کبھی کبھی دور و نزدیک بکھری ہوئی مسمار عمارتوں اور کھنڈروں کی یاد میں تھوڑی دیر کے لیے گم ہو جاتے۔

جن لوگوں نے جون پور کا قلعہ اور مسجدیں نہیں دیکھی ہیں وہ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ یہ کتنی ٹھوس، کوہ پیکر اور پرشکوہ عمارتیں ہیں۔ دہلی اور آگرے کی مغلیہ عہد کی عمارتوں میں حسن، نفاست، نزاکت اور پرکاری زیادہ ہے اور ان باتوں میں ان کا جواب دور دور نہیں، لیکن جو سطوت و جلال جون پور کی مسجدوں اور آثار قدیمہ میں نظر آتا ہے وہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہ شان مجھے لاہور کی شاہی مسجد میں بھی نظر آئی۔ ان مسجدوں کے اندرونی صدر دروازے کی طرف بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی، جیسے یہ ہم کو پیس ڈالیں گی یا نگل جائیں گی۔ یہاں نماز پڑھنے میں خاص طرح کا انشراح و افتخار محسوس ہوتا ہے، جیسے ہم واقعی خدائے برتر و توانا کے سامنے حاضر ہوں۔

جون پور کی یہ پرانی شاہی عمارتیں اس درجہ پاس پاس واقع ہیں کہ تقریباً ہر روز ان کے دیکھنے کا اتفاق ہو جاتا تھا۔ کبھی دن میں کئی بار جیسے ان کا دیکھنا زندگی کے روزمرہ

کے معمولات میں داخل ہوگیا ہو۔ اس زمانے میں جون پور میں ایسے کھنڈر اور ایسے خاندان بھی کثرت سے موجود تھے جو اس شہر کی گزشتہ عظمت اور فضیلت کی بے اختیار و بار بار یاد دلاتے رہتے تھے۔ ۱۹۱۳ء یا ۱۴ء میں شیعہ کانفرنس کا ایک بڑا شاندار جلسہ جون پور کے شاہی قلعہ کے اندر منعقد ہوا تھا۔ تصور کی نگاہ میں حضرت صفی مرحوم اپنی مشہور نظم بڑے دل نشین اور ولولہ انگیز لہجے میں سناتے نظر آتے ہیں۔

جون پور اے مولد سلطان عادل شیر شاہ
تیرے آثار قدیمہ تیری عظمت پر گواہ

میں نے یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے جون پور واقعتاً اپنی عظمت دیرینہ کے ساتھ ہمارے ارد گرد آہستہ آہستہ ابھر رہا ہو!

اب سوچتا ہوں اس زمانے کا جون پور علم و فضل اور شاعری و شرافت کی قدیم روایات کے اعتبار سے کتنا قابل قدر خطہ تھا۔ بیشتر مسلمان گھرانے ایسے تھے جو کسی نہ کسی اعتبار سے اپنی ایک حیثیت رکھتے تھے۔ رؤسا علما اور فضلا کے علاوہ عوام کا طبقہ تھا جس کے افراد پہلوانی کرتے تھے، پنجہ لڑاتے تھے، بنیچہ باندھتے تھے، علم اٹھاتے تھے۔ طبل بجاتے، سوز خوانی اور ماتم کرتے۔ فیرنی اور کباب بیچتے تھے۔ بیٹر لڑاتے اور کبوتر اڑاتے تھے۔ بایں ہمہ سوسائٹی میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، کرتے کچھ ہوں بیٹھتے سب کے برابر تھے۔ نجابت اور شرافت کا اس زمانے میں کتنا لحاظ رکھا جاتا تھا۔

ہر خاندان میں خواہ کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی شاعر مرثیہ خوان خوش نویس، پہلوان، پتنگ باز، داستان گو ہوتا۔ بزرگوں کے زمانے کی ایک بیاض ہوتی جس پر خاندان ہی کے کسی اگلے پچھلے سر برآوردہ شاعر کا کلام محفوظ ہوتا جسے صاحب خانہ گھر پر مجلس منعقد کر کے بڑے فخر سے اور فن کے جملہ آداب ملحوظ رکھ کر سناتا۔ اس کلام کو نسلاً بعد نسل گھر ہی کا کوئی کاتب بیاض پر خوش خط نقل کرتا۔ اس بیاض میں جہاں تہاں کچھ مجرب دوائیں اور دعائیں افراد خاندان کی شادی، ولادت، وفات وغیرہ کی تاریخیں۔ مہاجن کے قرض اور سود سے متعلق یادداشت بھی درج ہوتی! ■■

(رشید احمد صدیقی کی کتاب آشفتہ بیانی میری سے اقتباس)

مظہر جمیل

# غزل

ہم نے دیکھا ہے اُجالے سے اندھیرا ہونا　　آنکھ رکھ کر ہمیں آتا نہیں اندھا ہونا

وہ کسی اور کا کیا ہوگا جو اپنا نہ ہوا　　پہلے اے عشق سکھا دے ہمیں اپنا ہونا

اُس کو کیا حق ہے کہ قطرے سے سمندر ہالگے　　جس نے قطرے کو سکھایا نہیں دریا ہونا

آرزوؤں کا یہ عالم ہے تو اے عشق سلام　　تجھ سے مشکل ہے علاجِ غمِ دُنیا ہونا

وائے برحالِ محبت کہ محبت کہلائے　　ہو کے سنگین کسی شوق کا سودا ہونا

ہے کہیں اس کے لئے گوشۂ خاموش پناہ؟　　جس کو خلوت میں میسر نہیں تنہا ہونا

آپ کی قیس مزاجی سے مجھے ڈر ہے جمیل!
دیکھیے کس کے مقدر میں ہے لیلیٰ ہونا

اُپندر ناتھ اشک

# کالے صاحب

ڈی۔ ایم کی کوٹھی سے باہر نکل کر شری واستو نے رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ آٹھ بجے تھے۔ اس کے پاس پورا ایک گھنٹا تھا چپراسی سے معلوم ہوا تھا کہ صاحب نو بجے واپس آ جائیں گے کیوں نہ وہ گیان کو الہ آباد میں اپنی آمد کی خوش خبری سُناتا آئے۔ ایک پنتھ دو کاج پر ہمیشہ اس کا اعتقاد رہا ہے۔ بلکہ اگر کسی پنتھ میں دو کے بدلے چار کاج ہوں، تو وہ ان سب کو ساتھ نمٹانے سے کبھی نہ چوکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ چھ سات سال قبل تیس چالیس روپلے ماہوار کے کلرک سے ترقی کر کے وہ اس قلیل عرصے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ڈپٹی کلکٹر ہونے کے بعد اپنی چستی و چالاکی کی بدولت وہ چھوٹے غیر اہم اضلاع کو پھاندتا ہوا الہ آباد جیسے اہم اور بڑے ضلع میں تعینات ہو گیا تھا۔ آج ہی صبح اس نے الہ آباد میں قدم رکھا تھا اور آج ہی وہ اپنے افسر کے یہاں حاضری دینے جا پہنچا تھا۔ لیکن ڈی ایم لکھنؤ سے دورے کے سلسلے میں آنے والے کسی منسٹر کی خدمت میں حاضری دینے گئے ہوئے تھے اس لیے شری واستو کے پاس ایک گھنٹا خالی تھا۔ گیان اس کا بچپن کا دوست تھا۔ ایلن گنج میں رہتا تھا۔ اور یونی ورسٹی میں لیکچرر تھا۔ یہ سوچ کر کہ وہ ابھی گھر پر ہی ہو گا۔ شری واستو نے اس فاضل وقت میں اسی کے یہاں ہو آنے کا فیصلہ کیا۔ کچہری کے پاس سے گزر کر وہ سڑک پر آ کھڑا ہوا۔ ایک روز اسی کچہری کا بڑا حاکم بنے گا۔ یہ خیال آتے ہی فخر سے اس کی ایڑیاں قدرے اُٹھ گئیں اور اس کے ہاتھ بش شرٹ کے اکڑے ہوئے کالروں پر ہوتے ہوئے دامن پر آ کر رک گئے اور پنجوں پر ایک دو بار زور دیتے ہوئے اس نے آگے پیچھے سے بش شرٹ کو درست کیا۔ تبھی اس کی نظر سامنے بارہ دری کے قریب دو رکشا والوں پر پڑی جو غالباً اسی کے بارے میں بحث کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے "رکشیا" اس نے صاحبی انداز سے گلے میں الفاظ کو قدرے اینٹھتے ہوئے آواز دی۔

"جی حضور!"

اور دونوں رکشا اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

"کیوں بھائی گھنٹے کے حساب سے چلو گے؟"

"کہاں جائیں گے؟" پہلے رکشا والے نے پوچھا۔

"کہیں بھی جائیں!"

"کیا گھنٹا ملے گا؟"

"جو بھی ریٹ ہوگا۔"

"روپیہ گھنٹا لیں گے۔"

"دس آنے ملیں گے۔"

"اجی آیئے حضور۔ آپ اِدھر آیئے۔" دوسرے رکشا والے نے ہانک لگائی۔

"ہاں ہاں، تم لے آؤ۔"

اور دوسرے رکشا کے برابر آتے ہی شری واستو اُچک کر اس پر بیٹھ گیا بش شرٹ کو دونوں طرف سے ذرا کھینچ کر اس نے درست کیا اور پتلون کو قدرے اوپر اٹھا لیا تاکہ اس کی کریز خراب نہ ہو جائے وہ پیچھے کی طرف پیٹھ لگا کر آرام سے نہیں بیٹھا۔ اسے خوف تھا کہ بش شرٹ مسل نہ جائے۔ ڈی، ایم سے ملنے تک وہ اسی طرح خوش پوش اَپ ٹو ڈیٹ بنا رہنا چاہتا تھا۔ رکشا پر وہ اس طرح اکڑا بیٹھا تھا گویا ڈی، ایم سے مصافحہ کر کے ابھی کرسی پر بیٹھا ہو۔ سیدھا، اکڑا ہوا اور چاق و چوبند۔

رکشا والا خاکی سوٹ پہنے تھا۔ سوٹ بہت میلا بھی نہ تھا۔ شکل سے وہ بھی عام رکشا والا نہ معلوم ہوتا تھا۔ الہ آباد کے رکشے والوں میں دیہاتیوں کی کثرت ہوتی ہے فصل کا موسم نہ ہو اور کام سے فرصت ہو تو قرب و جوار کے دیہاتی اپنے لحیم شحیم جسم پر کھادی کی بنڈی اور کمر میں انگوچھا باندھے پوٹلی میں ایک وقت کا راشن لیے الہ آباد کی جانب چل پڑتے ہیں۔ شام کو پہنچتے ہیں۔ رات کے لیے رکشا لیتے ہیں اور سواری سے کرایہ لے کر ہی دوسرے وقت کا ستو خریدتے ہیں۔ انہی رکشا والے دیہاتیوں کی سہولت کے لیے بہت سے پنواڑیوں نے پان، بیڑی سگریٹ کے ساتھ ستو کے تھال بھی سجا رکھے ہیں۔ جن کے چھوٹے چھوٹے اہرام میں ہری مرچیں کھنسی ہوئی عجیب بہار دیتی ہیں۔ یہ دیہاتی رکشا والے رکشا چلاتے چلاتے جب زیادہ تھک

ہیں تو سیر آدھ سیر ستو لے کر دوکان دار ہی کی تھالی میں گوندھ کر لونداسا بنالیتے ہیں اور ہاتھ پر رکھ کر ہنگ مرچ کی مدد سے حلق سے اتار کر قریب کے کسی نل سے دو گھونٹ پی لیتے ہیں کہتے ہیں گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ اس گیدڑ اور ان دیہاتیوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ دن دن بھر اور اکثر دن اور رات بھر رکشا چلا کر جہاں وہ سال سال بھر کا لگان کما کر لے جاتے ہیں وہاں پھیپھڑوں کو بھی دق کے لیے تیار کر لے جاتے ہیں۔

دوسرے رکشا والے الہ آباد ہی کے ایسے شہری مزدور ہیں جو دوسری جنگ عظیم کے بعد بے کار ہو گئے ہیں۔ رکشا چلاتے چلاتے ان کی پسلیاں نکل آئی ہیں۔ سِل ان کی آنکھوں میں جھانکتا ہے پھر بھی وہ گرانی کے اس دور میں بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے رکشا کھینچنے پر مجبور ہیں۔

شری واستو الہ آباد ہی کا رہنے والا تھا وہ ان دونوں طرح کے رکشا والوں سے بخوبی واقف تھا۔ لیکن اس کا یہ رکشا والا اسے ان دونوں سے جُدا نظر آیا۔ ادھر رکشا والوں کی ایک تیسری قسم بھی نظر آنے لگی ہے۔ رونالڈ کولمن کی طرح باریک سی مونچھیں رکھے، فوجی پینٹ یا نیکر یا صرف ٹوپی پہنے، جنگ سے فرصت پائے۔ بے کار فوجی رکشا چلانے لگے ہیں۔ رکشا چلاتے وقت ان کے سر کا ترچھا پن، سائیکل کی گدّی پر بیٹھے ہوئے ان کی کمر کی اکڑ اور پیڈل گھماتے ہوئے باہر کی طرف گھٹنوں کا پھیلاؤ پہلی ہی نظر میں ان کے فوجی ہونے کا پتا دے دیتا ہے۔ ہونٹوں کے داہنے یا بائیں گوشے میں بیڑی دبائے تیسری جنگِ عظیم کے خواب دیکھتے۔ مصر، ایران، اٹلی جرمنی وہاں کی آزاد فضا اور گوری گوری لڑکیوں کے تصوّر میں غرق وہ دندناتے ہوئے رکشا چلائے جاتے ہیں۔ آزادی نے انھیں گڑگڑانا بھلا کر احساس خودی سے سر اٹھانا سکھا دیا ہے چوں کہ بیشتر نیم تعلیم یافتہ ہیں اس لیے خودی کی حدود کہاں اکڑ پن سے جا ملتی ہیں۔ یہ نہیں جانتے مول بھاؤ زیادہ نہیں کرتے اور سواری کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں گویا وہ مالِ غنیمت میں پائے ہوئے دشمن کے شہری ہوں۔

یہ رکشا والا اگرچہ فوجی وردی پہنے ہوئے تھا لیکن اس میں نہ وہ فوجیوں کی سی اکڑ تھی، نہ اس کے چہرے پر دوسرے فوجیوں کی مانند خشک آٹے کا تناؤ تھا اس کے برعکس وہاں گندھی ہوئی لوئی کی سی نرمی اور لچک تھی۔

"کیوں جی تم فوج میں کام کرتے تھے؟" شری واستو نے اکڑے ہوئے بیٹھے بیٹھے اکتا کر جسم کو قدرے ڈھیلا چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

رکشا والے نے رکشا چلاتے چلاتے زرا پیچھے کی طرف دیکھا۔

"نہیں صاحب۔ فوج میں ہم کیا کام کرتے!" یہ کہتے کہتے اس کے لبوں پر طنز آمیز پُر حقارت تبسم دوڑ گیا۔ جس میں ہلکے درد کی جھلک بھی شری واستو کی آنکھوں سے چھپی نہ رہی۔ وہ تبسم گویا کہہ رہا تھا کہ فوج کی ملازمت جیسا اگرا ہوا کام ہم کیوں کرتے۔

"تو کیا رکشا چلاتے ہو؟"——— شری واستو کا مطلب تھا کہ کیا چار چھے رکشے رکھ کر ان کی آمدنی سے گزر کرتے ہو۔

رکشا والا ہنسا "اجی صاحب کہاں۔ یہ تو رکشا بھی اپنا نہیں۔ کرائے پر لے کر چلاتے ہیں۔"

شری واستو کو اس کی آواز میں شرافت کا کافی عنصر دکھائی دیا۔ اسے اس شریف رکشا والے کے ساتھ کچھ ہمدردی ہوئی تو ایسا جان لیوا کام کیوں کرتے ہو؟" اس نے کہا۔ "رکشا چلانے سے تو پھیپھڑوں پر بڑا زور پڑتا ہے۔ دن رات ہل اور پھاوڑا چلانے والے دیہاتی تو اسے کھینچ سکتے ہیں۔ تمھارے جیسے شہریوں کے بس کا یہ کام نہیں۔"

"جی ہم کیا اپنی خوشی سے چلاتے ہیں۔ بیوی ہے۔ تین چار بچّے ہیں۔ ماں ہے دو بیوہ بہنیں ہیں۔ اتنے بڑے کنبے کا بار اکیلے ہمیں پر ہے۔"

"تم کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے۔"

"ہم کو کوئی دوسرا کام آتا نہیں صاحب۔"

"تو کیا تم ہمیشہ سے رکشا چلاتے ہو۔"

"جی صاحب۔ جب سے ملک کو آزادی ملی ہے۔" وہ خاموشی سے چند لمحے رکشا چلاتا رہا۔ پھر ماتھا ٹھونکتے ہوئے بولا۔ "انگریز یہاں سے گئے۔ کالے صاحب آئے کہ ہماری قسمت پھوٹی۔ دیسی صاحبوں کو نہ ہمارے کام کی سمجھ نہ پرکھ۔ نہ ہم ان کے کام کے نہ وہ ہمارے۔ ہم نے تو درخواست دی تھی کہ ہمیں کوئی دوسرا کام نہیں آتا۔ ہمیں گورے صاحبوں کے ساتھ ولایت بھیج دیجیے۔ پر ہماری کسی نے نہیں سُنی۔"

"تو کیا کرتے تھے تم؟"

"ہم کمشنر ڈِک صاحب کے ہاں کام کرتے تھے۔ پچاس روپیہ مہینا پاتے تھے۔ رہنے کے لیے دو کمرے تھے۔ کپڑے صاحب دیتے تھے۔ معاف کیجیے گا........ اور رکشا والا بات کرتے

کرتے ذرا جھکا۔

"نہیں۔ جی نہیں۔ کہو" شری واستو نے پھول کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ جو بش شرٹ آپ نے پہن رکھی ہے" رکشا والا نے پیچھے مڑ کر بڑے ادب سے کہا "ایسی تو صاحب کے یہاں ہم پہنا کرتے تھے۔"

شری واستو پھر ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیٹھ بھی پیچھے لگ گئی اور سوٹ کے مسلے جانے کا بھی اسے خیال نہ رہا۔

"انگریزوں کے راج میں جو موج تھی وہ اب کہاں" رکشا والا کہتا گیا "دن تیوہار پر انعام ملتے تھے ہمارے ہی نہیں بیوی بچوں تک کے کپڑے بن جاتے تھے۔ اب بتائیے اتنا ہم کہاں سے پائیں۔ کیسے بیوی بچوں کا پورا کریں۔ لاچار ہو کر رکشا چلاتے ہیں۔ خون سکھاتے ہیں۔ کسی دن اسی طرح ٹرک جائیں گے۔"

"پر آخر بات کیا ہے۔ تم کسی دیسی صاحب کے ہاں کام کیوں نہیں کرتے۔ کمشنر کی جگہ کمشنر ہے اور کلکٹر کی جگہ کلکٹر۔"

رکشا والے نے رکشا چلاتے چلاتے پھر پیچھے کی طرف دیکھا "دیسی صاحب ہمیں کیا کھا کر رکھیں گے۔" اس نے کہا۔ اور اس کے لبوں پر وہی پر حقارت طنز آمیز تبسم پھیل گیا۔

"کیا کرتے تھے تم کمشنر ڈک کے یہاں؟" شری واستو نے تجسس آمیز جھلاہٹ سے پوچھا "کک تھے؟"

"جی نہیں خانساماں گیری ہم سے نہیں ہوتی۔"

"تو کیا تھے۔ بیرا تھے؟"

"جی ہاں۔ بیرا تھے۔"

شری واستو پھر اکڑ کر بیٹھ گیا "تو اس میں کیا بات ہے تم دوسری جگہ نوکری کر سکتے ہو۔ ہمارے ہی یہاں ایک بیرا ہے۔"

"جی نہیں۔ ویسے بیرا ہم نہیں تھے۔ ہم کھانا وانا لانے کا کام نہیں کرتے تھے۔ ہم صاحب کے کپڑے دیکھتے تھے۔"

"ہاں۔ ہاں کپڑے وپڑے دیکھتے ہوگے۔ بوٹ وٹ صاف کرتے ہوگے۔"

"جی نہیں۔ بوٹ تو بھنگی صاف کرتا تھا۔ ہم صرف کپڑے دیکھتے تھے۔"

"کیا دیکھتے تھے سارا دن کپڑوں کا؟"

"اب صاحب آپ سے کیا بتائیں۔ آپ سمجھیں گے نہیں؟" رکشا والا نے ذرا سا مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "انگریزوں کی بڑی باتیں تھیں۔ ایک وقت ایک سوٹ پہنتے تھے رات کا الگ، دفتر کا الگ، دن کے آرام کا الگ، سیر سپاٹے کا الگ، پھر ڈنر سوٹ، گولف سوٹ، پولو سوٹ، شکار سوٹ۔ ان کو ٹھیک جگہ پر رکھنا، دھوبی کو دینا، لینا۔ صاحب کو پہنانا۔ یہی کام تھا ہمارا۔ دیسی صاحب کیا سمجھیں اور پرکھیں ہمارا کام؟ دن رات، مہینوں برسوں ایک ہی سوٹ گھسائے جاتے ہیں۔ یہی صاحب جو اس کوٹھی میں رہتے ہیں۔ کبھی دیکھا ہے ان کو ...... میں نے ایک بڑی کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی ایسا سوٹ پہنتے ہیں جو معلوم ہوتا ہے کالج کے دفت کا سنبھالے ہوئے ہیں۔ جہاں دفتر لگاتے ہیں وہاں بال روم تھا۔ سنیچر کی رات کو کیا کیا رونقیں ہوتی تھیں۔ اور باغیچہ دیکھا آپ نے۔ اس کی کیا درگت ہوئی ہے۔ کبھی انگریز صاحب کے زمانے میں اس کی بہار دیکھتے۔ وہی باغیچہ کیا۔ یہ ساری سول لائن بڑی انگریز صاحبوں کے نام کو رو رہی ہے۔ اتنے بڑے بڑے بنگلے، اتنے بڑے بڑے باغیچے، ارانڈ کے سر کی طرح منڈے دکھائی دیتے ہیں؟"

مسٹر واستو کو اس رکشا والے کی حقارت آمیز گفتگو اور ہندوستانی رہن سہن کے متعلق اس کے خیالات نہایت واہیات معلوم ہوئے اگرچہ وہ خود انگریزی ٹھاٹ باٹ سے رہنا اور سوٹ بوٹ پہننا پسند کرتا تھا لیکن اس وقت اسے انگریزی تمدن سے متعلق ہر چیز اور ہر بات سے نفرت ہو گئی۔ اس لاعلم کو ذرا سا "باعلم" بنانے کے خیال سے اس نے کہا۔ "ان کے اور اپنے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے میں بڑا فرق ہے۔ وہ لوگ گوشت مچھلی کھانا، شراب پینا برا نہیں سمجھتے۔ گائے اور سور کا گوشت کھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کو چھونا بھی پاپ ہے۔ ان کی عورتیں ناچتی ہیں۔ ہمارے یہاں ......"

"کچھ نہیں جناب" رکشا والے نے اس کی بات کاٹ کر اور رکشا کے پیڈل پر اپنے جوش میں مزید زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگوں کا دیس غلاموں کا دیس ہے۔ غریب ہونے سے ہم نے غریبی کو جنت بنا دیا ہے پیسے والے ہو کر بھی ہم عادت سے غریب بنے رہتے ہیں، روپیہ بینکوں میں جمع رکھتے ہیں۔ اور دال روٹی پر صبر کرتے ہیں۔ ہم کو ہمارا صاحب بتاتا تھا کہ ہندوستان جب آزاد تھا تو لوگ خوب کھاتے پیتے، ناچتے، گاتے اور عیش مناتے تھے

نہ بیہودہ تھا نہ کھانے پینے پر یہ پابندی تھی۔ ہمارا صاحب کہا کرتا تھا کہ پیسے کا فائدہ اسے خرچ کرنے میں ہے۔ بینک میں جمع کرنے میں نہیں۔ روپیہ خرچ ہوتا ہے تو ملک کے کاری گر، مزدور دوکان دار سب کام پاتے ہیں نہیں تو بے کاری بڑھتی ہے۔ ہمارا صاحب سال کے سال فرنیچر اور دروازے کھڑکیوں پر روغن کراتا تھا۔ چھ مہینے میں وائٹ واش کراتا تھا۔ دو مالی، دو بیرے، خانساماں، دھوبی، بھنگی۔ اس کے یہاں نوکر تھے۔ پھر اس کے دم سے ڈبل روٹی والے انڈے والے، کرسی میز والے اور نہ جانے کون کون بھی روزی پاتے تھے۔

سٹری واستو کے دل میں ایک شعلہ سا لپکا، جی چاہا کہ اٹھ کر صاحب کے اس کتے کی گدّی پر زور کا ایک گھونسا دے۔ لیکن رکشا کافی تیز چلا رہا تھا۔ آخر اس نے اپنا غصہ اپنے پیش رو گورے افسروں پر اتارا۔

"ان سالوں کا کیا ہے۔ جنتا کو لوٹتے اور موج اڑاتے تھے۔"

"جنتا کو یہ کیا کم لوٹتے ہیں" رکشا والے نے پلٹ کر نہایت مسکین طنز آمیز ہنسی کے ساتھ کہا۔ "چھوٹے سے لے کر بڑے افسر تک سب کھاتے ہیں۔ وہاں تو بڑے افسر کچھ لحاظ کرتے تھے۔ یہاں تو آپا دھاپی مچی ہے۔ بس لینا جانتے ہیں۔ دینا نہیں جانتے۔ انگریز لیتا تھا تو دس آدمیوں کا پیٹ پالتا تھا۔ یہ کھاتے ہیں تو جمع کرتے ہیں۔ کھائیں اڑائیں بھی کیا۔ عادت بھی ہو۔ وہی دھوتی کرتا پہنے اندر باہر سب جگہ بنے رہتے ہیں۔ پندرھویں، بیسویں، مہینے دو مہینے پر حجامت بناتے ہیں۔ نائی، دھوبی، بیرا، خانساماں کیا پالیں گے۔"

سٹری واستو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ لیکن خاموش رہا کہ اس کمینے کے منھ کیا لگے۔

"دور کیوں جائیے" رکشا والا اپنی رو میں کہتا گیا۔ "رکشے تانگے والوں ہی کو لیجیے۔ بڑے سے بڑا سیٹھ رکشا کرے گا تو مول بھاؤ کرنا نہ بھولے گا۔ یہیں ایلن گنج میں ایک آنریری مجسٹریٹ رہتے ہیں۔ بڑے آدمی ہیں۔ چوک میں ان کا پریس بھی چلتا ہے۔ ہمیشہ یہاں اڈے پر آ کھڑے ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایک ہی سواری کے پیسے دینے پڑیں۔ دوسری سواری نہ ہو تو آدھ آدھ گھنٹے کھڑے رہتے ہیں۔ انگریز معمولی فوجی بھی ہوا تو کبھی مول بھاؤ نہ کرتا تھا۔ پھر جیب میں روپیہ ہوا تو روپیہ دے دیا۔ اور دو روپئے ہوئے تو دو دے دیئے۔ ایک بار ہمارے صاحب کی موٹر بگڑ گئی تھی۔ یہیں ایلن گنج سے [illegible] تک جانے میں پانچ روپے کا نوٹ اس نے رکشے والے کو دے دیا تھا۔

گجانن کا گھر آگیا تھا۔ مسٹر واستو اُچک کر اُٹھا لیکن وہاں جانے پر معلوم ہوا کہ وہ بے نہیں۔ اپنا کارڈ چھوڑ کر مسٹر واستو مڑا اور رکشا میں سوار ہوتے ہوئے اس نے رکشا والے سے کہا کہ جلدی لے چلے۔

کچہری کے سامنے اُترتے وقت اس نے گھڑی دیکھی۔ ایک گھنٹا دس منٹ ہوئے تھے۔ دوسرا وقت ہوتا تو وہ دس آنے گھنٹے کے حساب سے بارہ آنے سے زیادہ نہ دیتا۔ لیکن اس رکشا والے کو بارہ آنے دینے میں اسے کچھ ہچکچاہٹ ہوئی۔ صاحبوں کی قبر پر لات مارتے ہوئے اس نے کہا، "ایک گھنٹے سے کچھ ہی منٹ زیادہ ہوتے ہیں۔ دو گھنٹے لگائیں تو ایک روپیہ چار آنے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ لو دو روپیہ۔ چودہ آنے ہماری طرف سے انعام سمجھ لو۔

رکشا والے نے تقریباً فوجی طریقے سے سلام کیا۔ اور مسٹر واستو فخر سے ایڑیوں کو ذرا اٹھاتا ہوا۔ ڈی، ایم کی کوٹھی کی طرف چلا۔

---

"کیوں کیا ملا؟"

پہلے رکشا والے نے جو ابھی تک اڈّے پر کھڑا تھا زور سے پوچھا۔

"دو روپے"

"دو روپے؟"

"ہاں دو روپے۔ کسی دیسی صاحب سے میں نے کبھی کم لیا جو اس سے لیتا۔ سالے ان کالے صاحبوں سے نمٹنا میں ہی جانتا ہوں۔

آخری جملے کی بھنک مسٹر واستو کے کانوں میں پڑ گئی۔ اس کی اٹھی ہوئی ایڑیاں بیٹھ گئیں جسم کا تناؤ اور رفتار کی اکڑ قدرے کم ہوگئی۔ اور وہ عام انسانوں کی طرح چلتا ڈی، ایم کے بنگلے میں داخل ہوگیا۔ ■■

یہ افسانہ اُپیندر ناتھ اشک کی کتاب "کالے صاحب" سے لیا گیا۔ اس مجموعے میں اشک صاحب کے آٹھ منتخب افسانے شامل ہیں جن میں مختلف گھریلو، سیاسی، سماجی اور رومانی مسائل کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ قیمت ۲/۵۰

## شعرائے کہنہ

# امیر مینائی

## ۱۸۲۸ء ______ ۱۹۰۰ء

امیر احمد نام، امیر تخلص لکھنؤ میں پیدا ہوئے، نسب کا سلسلہ بہت قریب کے واسطوں سے حضرت شاہ مینا (جن کا مزار لکھنؤ میں مرجع خاص و عام ہے) سے ملتا ہے اسی بنا پر مینائی جزو تخلص ہے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم و تکمیل مفتی سعد اللہ اور علمائے فرنگی محل (لکھنؤ) سے کی۔ طب، جفر اور نجوم سے بھی واقف تھے۔ شروع ہی سے نہایت ذکی، بڑے محنتی اور جفاکش رہے۔ ہوش سنبھالا تو لکھنؤ کی فضا میں شاعری گونج رہی تھی۔ آتش و ناسخ کے مناقشے، انیس و دبیر کے معرکے، دن رات کے ادبی مباحثے اور مشاعرے۔ بچپن ہی سے یہ بھی شعر و سخن کی طرف مائل ہو گئے۔ اور نہایت کاوش و خلوص کے ساتھ اس فن کے رموز و نکات سے آگاہی و مہارت حاصل کرنے لگے۔

منشی مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد ہوئے مگر اپنے مطالعے، ذہانت اور مختلف صلاحیتوں کی بدولت بہت جلد استاد سے زیادہ مقبول اور مشہور ہو گئے۔ ۱۸۵۲ء میں نواب واجد علی شاہ کے دربار اور مزاج میں رسائی اور رسوخ حاصل کیا۔ دو کتابیں (ارشاد السلطان اور ہدایۃ السلطان) لکھ کر پیش کیں۔ عزت و توقیر میں اضافہ ہوا، خلعتِ فاخرہ سے نوازے گئے۔ ۱۸۵۷ء آ گیا۔

پہلے دلی اجڑی تھی تو بادشاہت ختم ہوئی تھی، لکھنؤ کی باری آئی تو نوابی رخصت ہوئی۔ حسنِ اتفاق کہ دونوں جگہ کے شاعروں اور ادیبوں کے سرپرست اور قدرداں نواب یوسف علی خاں والیِ رامپور کا ستارہ چمکا۔ بہتوں کے دن پھرے امیر بھی رام پور پہنچے۔ نواب کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔ ۴۲ برس تک بڑے اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ گزار کر ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد گئے۔ خاصی مان دان ہوئی۔ چند مہینے زندہ رہے۔ پھر دکن کی خاک کا پیوند ہو گئے۔

امیر صورت اور سیرت دونوں لحاظ سے نہایت متین، ملنسار، متشرع، متقی اور قابلِ احترام

بندگوں میں سے تھے۔ خاکساری اور دوست داری میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ہجو گوئی ناز یبا اور خلافِ تہذیب الفاظ یا اندازِ گفتگو سے ہمیشہ اپنے آپ کو الگ رکھا۔ معاصرانہ چشمکوں سے بے تعلق اور لکھنؤ، دلی کے جھگڑوں سے آزاد رہنے کی کوشش کی صداقت کے قائل اور حق پرستی کی طرف مائل رہے۔

شاعری کے علاوہ تصنیف و تالیف کے مشاغل میں زندگی بھر مصروف رہے۔ نظم و نثر ملا کر ان کی کتابوں کی کل تعداد اکیس تک پہنچتی ہے۔ بیشتر اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے تھے مضمون آفرینی، نازک خیالی اور زبان و فن پر یکساں دست رس اُن کی شاعری کی امتیازی خوبیاں ہیں۔ لُطف یہ کہ امیرؔ کی یہ صفتیں اور صلاحیتیں عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور سنورتی رہیں۔ سینکڑوں شاگرد تھے جن میں محسنؔ، ریاضؔ، جلیلؔ، مضطرؔ اور صفدرؔ کا مرتبہ اور شہرت اُستادی کی حد تک پہنچتا ہے۔

"مراۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق" کے علاوہ اُن کا ایک عظیم علمی کارنامہ "امیر اللغات" بھی ہے جس کی صرف دو جلدیں (الف ممدودہ اور الف مقصورہ) چھپ سکیں۔ اسکیم کے مطابق اگر اس کی آٹھ جلدیں مکمل ہو گئی ہوتیں تو اُردو زبان کا اس سے زیادہ مستند اور منضبط کوئی دوسرا لُغت نہ ہوتا۔

## انتخاب:

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

جب کہا اُس سے شبِ غم کوئی غمخوار نہ تھا
درد نے اُٹھ کے کہا "کیا یہ گنہگار نہ تھا؟"

مُرغانِ باغ تم کو مبارک ہو سیرِ گل
کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

کرتا میں دردمند طبیبوں سے کیا رجوع
جس نے دیا تھا درد بڑا وہ حکیم تھا

صورت تری دکھا کے کہوں گا میں روزِ حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چُرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

دیکھا اے درد جُدا ہو نہ دلِ مضطر سے
اور اُلجھے گا یہ بیمار جو تنہا ہوگا

آگ جو دل میں لگی تھی وہ بجھائی نہ گئی
اور کیا تجھ سے بھلا اے دیدۂ گریاں ہوگا

ہاتھ رکھ کر میرے سینے پہ جگر تھام لیا — تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

ترے بندوں سے کرتے ہیں یہ بت دعویٰ خدائی کا
تماشا دیکھتا ہوں تیری شانِ کبریائی کا

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے — تب نظر آتی ہے اِک مصرعِ تر کی صورت

ہاتھ گلچیں کے کیے باغ میں کانٹوں نے فگار — خوب ہی پھوٹے ترے دل کے بھی چھالے بلبل

دھیان صیاد کا، گلچیں کا خطر، خوفِ خزاں — ہو بلا ایک تو سر سے اُسے ٹالے بلبل

وہ اور وعدہ وصل کا، قاصد نہیں نہیں! — سچ سچ بتا یہ لفظ اُنہیں کی زباں کے ہیں؟

نہ کر اے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو — اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

کیا رنگ جہاں کے ہو رہے ہیں — دو ہنستے ہیں چار رو رہے ہیں

آئے گی نہ پھر کے عمرِ رفتہ — ہم مفت میں جان کھو رہے ہیں

اربابِ کمال چل بسے سب — سو میں ایک دو رہے ہیں

پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے — گناہ گار یہ کہہ دے گناہ گار ہوں میں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ — اے اسیرانِ قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر — چیخ اُٹھا ہر بے گنہ، میں بھی گنہ گاروں میں ہوں

اُلفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو — ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے — اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لئے — ٹوٹتی ہیں بجلیاں اُن کے لئے

ساری دُنیا کے ہیں وہ میرے سوا — میں نے دُنیا چھوڑ دی جن کے لئے

وصل کا دن اور اتنا مختصر — دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

# تصانیف شمس العلماء خواجہ حسن نظامیؒ

| کتاب | قیمت |
| --- | --- |
| ترتیلی ترجمہ قرآن مجید | ۲۰/- |
| مسلمانوں کی دعائیں | ۱/- |
| فیوچر آف اسلام (اسلام کا مستقبل) از حضرت اکبر الہ آبادی | ۳/- |
| فاطمی دعوت اسلام | ۳/- |
| میلادنامہ اور رسول بیتی | ۲/۵۰ |
| محرم نامہ | ۳/- |
| یزید نامہ | ۲/۵۰ |
| گیارھویں نامہ (ذکر غوث پاکؒ) | ۱/- |
| طمانچہ برخسار یزید (تاریخی ناول) | ۲/۵۰ |
| غزنوی جہاد | -/۵۰ |
| تاریخ سلاطین عباسیہ (اول و دوم) | ۲/۵۰ |
| محمودی حملوں کے اسباب (از مولوی غلام قاسم خاں) | ۴۲/۴۲ |
| تاریخ فرعون | ۵/- |
| پانی پت کی آخری لڑائی | ۱/- |
| حکومت اورنگ زیب کی اصلی تاریخ (از نواب مرزا یار جنگ) | ۱/- |
| فتوحات اسلام (اردو ترجمہ) (از ایڈورڈ گبن) | ۱/- |
| خان جہاں خاں لودی (از مولوی اکبر شاہ خاں) | -/۷۵ |
| خواص خاں ولی " | -/۷۵ |
| نظامی بنسری (تاریخ الاولیاء) | ۶/۵۰ |
| تذکرہ حضرت امیر خسروؒ (پرنس قدسی نظامی) | -/۷۵ |
| طب کی تاریخ | ۱/- |
| بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ | ۲/۵۰ |
| اتالیق خطوط نویسی | ۱/۲۵ |
| بیوی کی تعلیم | ۲/- |
| اولاد کی شادی | ۲/- |
| تعلیم اسرار تصوف | -/۷۵ |
| اعمال حزب البحر (اول و دوم) | ۳/- |
| مرشد کو سجدۂ تعظیم | ۱/- |
| سفرنامہ مصر و شام و حجاز | ۲/۵۰ |
| سفرنامہ افغانستان | ۴/- |
| سفرنامہ پاکستان | ۲/- |
| جگ بیتی کہانیاں | ۱/۵۰ |
| کائنات بیتی (انشائیے) | ۱/- |
| لڑائی کا گھر " | -/۵۰ |
| خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامیؒ | ۱/۷۵ |
| خط و کتابت (اکبر الہ آبادی اور مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد) حواشی خواجہ حسن نظامیؒ | ۱/- |
| بیگمات کے آنسو (افسانے) | ۲/- |
| دلی کی آخری شمع (از مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی) | ۱/۵۰ |
| پریم سنگم (فارسی کلام) علامہ اقبال و کشن پرشاد | ۱/- |
| پروفیسر کیرو کی حیرت انگیز پیشینگوئیاں | ۱/۲۵ |
| سی پارۂ دل اول و دوم | ۸/- |

یہ کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار جامع مسجد دہلی سے مل سکتی ہیں

# پیامِ تعلیم

## (ایک تبصرہ)

کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج اور مرحوم دہلی کالج کے بعد اُردو کی خدمت کرنے کا سب سے زیادہ شرف جامعہ ملیہ کو حاصل ہوا۔ مکتبہ جامعہ جو اس کا ایک ذیلی ادارہ ہے کے ذریعہ اُس نے عوام کو ملک کے بہترین اور تعمیری ادب سے روشناس کرایا اور یہ ادارہ اس نیک کام میں اب بھی تن من دھن سے مصروف ہے۔ ماہنامہ "کتاب نما" کے ذریعہ ہم اُن مطبوعات سے باخبر رہتے ہیں جو وقتاً فوقتاً اس ادارہ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوتی رہتی ہیں۔ "پیامِ تعلیم" اسی ادارہ سے نکلنے والا بچوں کا رسالہ ہے، یہ پرچہ ۱۹۲۶ء میں جاری ہوا تھا لیکن گزشتہ ۸ سال سے بند رہا اور یہ پھر جاری ہو گیا ہے اور اُمید ہے کہ مسلسل نکلتا رہے گا۔

ان آٹھ سالوں میں اُردو کے بہت سے بچوں کے پرچے نکلے لیکن اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے جو مقبولیت اور امتیاز "پیامِ تعلیم" کو حاصل تھا وہ کسی پرچہ کو نہ حاصل ہو سکا اور اس کی کمی برابر محسوس کی جاتی رہی۔ مقامِ مسرت ہے کہ اس کے احیاء سے وہ کمی دور ہو گئی۔

اس رسالہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دوسرے بچوں کے رسالوں کی طرح سے محض تفریح کا سامان نہیں مہیا کرتا بلکہ اُن کی کردار سازی میں معاون ہوتا ہے۔ اس میں جن حضرات کے مضامین شائع ہوتے ہیں وہ بچوں کی نفسیات اور اُن کے تعلیمی مسائل سے بخوبی واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ ایک خاص مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر اور ایک خاص نقطۂ نظر سے لکھتے ہیں محض بچوں کو ہنسانے کے لیے نہیں۔

ماہنامہ "پیامِ تعلیم" کے زیرِ نظر شمارے میں ڈاکٹر سید عابد حسین، مولانا عبدالسلام، جناب محمد حفیظ الدین اور سید محمد ٹونکی جیسے بلند پایہ استادوں اور ماہرینِ تعلیم کے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں بچوں کے لئے دلچسپی کا سامان بھی ہے اور در پردہ اُن کے کردار کی تعمیر کی کوشش بھی۔

اس پرچہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کچھ صفحے بچوں کی کوشش کے لیے وقف ہیں، اس عنوان سے بچوں کے کسی مخصوص موضوع پر لکھی ہوئی نظمیں شامل ہیں اگر اس کوشش

[illegible]

دے سکیں گے جنھیں شعر گوئی سے رغبت نہیں اس کے علاوہ ان کو نثر نگاری کی مناسبت بھی مل جائے گی۔
پرچے کے شروع میں اس کے از سرِ نو اجرا پر ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب،
پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی کے پیغامات شامل ہیں۔
(ہماری زبان ۸ راگست ۶۴ء)

## ہندوپاک کی لائبریریوں۔ ریڈنگ روموں اور دار المطالعوں کے منتظمین سے اپیل

ہندوپاک میں اردو زبان وادب کی ترویج وترقی اور سدھار کے لیے اُردو دوستوں کو مختلف راہیں تلاش کرنا پڑیں گی۔ آج صورت حال یہ ہے کہ رسالے اور کتابیں چھاپنے والے ان کا سی کا حلقہ نہیں جانتے اور جو خریدار ہیں انھیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ کون کون سے مطبوعات کب بازار میں آگئیں یہی وجہ ہے کہ ناشرین کے یہاں کتابوں اور رسالوں کی ردّی کے انبار لگتے چلے جاتے ہیں۔ اچھے سے اچھا رسالہ جلد ہی دم توڑ دیتا ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب دیمک کی نذر ہو جاتی ہے۔

اردو زبان میں آج ایک ایسی ڈائرکٹری کی بہت سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے جس میں اردو کے رسالے اور کتابیں خریدنے والے اداروں کے بارے میں تفصیلی معلومات درج ہوں تاکہ اس ڈائرکٹری کو دیکھ کر رسالے اور کتابیں چھاپنے والے اداروں کو بیک نظر معلوم ہو جائے کہ اُن کے مال کی کھپت کہاں ہے اور وہ ان اداروں کو وقتاً فوقتاً اپنی مطبوعات کے بارے میں اطلاع دے سکیں۔ اسی طرح خریدار اور ناشر کے درمیان ایک ربط اور رشتے پیدا ہو جانے سے دونوں کو بڑی سہولتیں میسّر آجائیں گی۔ اس خیال کے پیش نظر ہم لائبریریوں اور دار المطالعوں کی ایک ڈائرکٹری مرتب کر رہے ہیں ان اداروں کے منتظمین سے درخواست ہے کہ ہمیں جلد از جلد مندرجہ ذیل معلومات فراہم کریں تاکہ ایک مفید کتاب کی تکمیل ہو سکے۔

(۱) نام لائبریری، دار المطالعہ، ریڈنگ روم (بہتر ہو اگر یہاں پتے کی مہر لگائی جائے)
(۲) کب سے قائم ہے؟ (۳) جو رسالے اور اخبار خریدے جاتے ہیں ان کے نام (۴) جو رسالے اور اخبار اعزازی مفت آتے ہیں ان کے نام (۵) کتابوں کی کل تعداد (۶) حکومت یا میونسپلٹی سے کوئی امداد ملتی ہے؟ کتنی؟ (۷) پتا (۸) نام و دستخط لائبریرین۔

ہمارا پتہ: مکتبہ کار پبلیکیشنز پھلواری رام پور (یوپی)

نوٹ: ... درخواست ہے کہ ... شائع کر کے اپنے صفحات پر جگہ دیں تاکہ ...

# نئی مطبوعات

خلش (مجموعہ کلام) سیفی پریمی ۲/- سیفی پریمی نئی دہلی ۲۹
ادب اور زندگی (ادب) مجنوں گورکھپوری ۵/- اُردو گھر علی گڑھ
تیس مار خاں (بچوں کا ناول) شاہد علی خاں ۷۵/- " "
ایٹم کیا ہے (معلومات) ترجمہ اطہر پرویز ۶۵/ " "
نیا تیرتھ " " ۱/- " "
مطالعہ حضرت غمگین دہلوی (ادب) محمد یونس خالدی ۳/- انجمن ترقی اُردو علی گڑھ
انتخاب کلام جمیل مظہری جمیل مظہری ۷۵/- " " "
" " تلوک چند محروم تلوک چند محروم ۷۵/- " " "
" " ریاض خیرآبادی ریاض خیرآبادی ۷۵/- " " "
جگر کی غزلیہ شاعری (تنقید) اشفاق علی خاں ۳/۵۰ مجلس ادب و ثقافت علی گڑھ
بند کواڑ (افسانے) نریندر لوتھر ۲/- مکتبہ تحریک دہلی
بھوکی آنکھیں (ناول) سادھنا پرتاپی ۳/- دہلی ساہتیہ سدن دہلی
گل و سنگ (نظم) خضر برنی ۲/۵۰ جمال پریس، دہلی ۶
بجلی کا حیرت انگیز موجد نکولا ٹیلا مترجم آر۔ ایس بھاردواج ۱/- حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی
دوڈرو ولسن " ٹی ایس نرولا ۱/- " "
گردباد (ناول) مظہر الحق علوی ۱۰/- نسیم بکڈپو لکھنؤ
پرایا دھن " نسیم انہونوی ۸/- " "
نقارے " کرشن چندر ۵/- دیپک پبلشرز جالندھر
پنڈت جواہر لال نہرو (سوانح) ضیا عظیم آبادی ۲/- الماس بکڈپو لکھنؤ
وہ کون تھی (ناول) پی۔ ایل چندن ۲/- نرمل پبلشنگ ہاؤس فریدآباد
شامتِ اعمال (مزاحیہ کلام) دلاور فگار ۳/- فنکاران جدید بدایوں
حقانی قوالی مولانا خواجہ حسن محذی مُغنت انجمن اصلاح حفاظ المسلمین
قصیدہ چودھویں صدی " " " احمد عمر بلڈنگ [illegible] بمبئی

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## اوپر کی منزل

مصنف: کرتار سنگھ دُگل
صفحات ۲۰۴۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت چار روپے
سن اشاعت: مارچ ۶۴ء   ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

کرتار سنگھ دُگل نے بڑے استقلال سے ساتھ ڈرامے لکھے ہیں۔ "دیا بجھ گیا" سے "اوپر کی منزل" تک پہنچنے میں گو ان کو خاصی مدّت لگی مگر اس زمانے میں اُنھوں نے اسلوب اور ٹکنیک کے لحاظ سے جو تجربے کیے ہیں وہ کامیاب ہیں۔ اُن کے کردار آہستہ آہستہ مگر بڑی معصومیت سے گناہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ ہر طرف گمان ہوتا ہے کہ شیطان غالب آ گیا لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ اوپر کی منزل پر پہنچ کر ایسا لگتا ہے جیسے شیطان کو نیچا دکھا دیا گیا۔ انسان کا احترام اور انسانیت پر اعتماد جس کو کامل طور پر ہو جاتا ہے وہ اسی انداز سے سوچتا ہے اور اسی قسم کے کردار پیش کرتا ہے۔

دُگل کے کردار جب کسی گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں تو وہ ایک غیر متعلق آدمی بن کر اُن کا جائزہ لیتا ہے اور پھر کہہ اُٹھتا ہے۔ "کلی کی پتی پر پڑی چھینٹ، میں تجھے لاکھ پانیوں سے دھولوں گا۔" کرداروں کو اس مقام سے دیکھنے کے لیے خود بلند ہونے کی ضرورت ہوتی ہے اور زندگی کے تجربوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

مجموعے میں کل دس ڈرامے ہیں جن کو پڑھ کر گھٹن کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے اوپر کی منزل کی ساری کھڑکیاں کھول دی گئی ہیں اور وہاں سے حدنگاہ تک ایک جیتی جاگتی دُنیا نظر آ رہی ہے۔ اس دُنیا میں آنکھوں والے اندھے بھی ہیں اور ایسی بے نور آنکھیں بھی ہیں جو گناہ کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کا محاصرہ کر لیتی ہیں۔

قریب قریب تمام ڈراموں کا پلاٹ بے کیف زندگیوں سے اُبھرتا ہے کبھی کبھی ایسا

محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس بے کیفی نے زندگی میں جمود پیدا کر دیا۔ پھر اس جمود کا احساس کچھ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تبدیلی اور عمل کا یہ جذبہ عموماً اور پہلے تو غلط راہوں پر لے جاتا ہے۔ مگر جلد ہی احساس ہونے لگتا ہے اور پھر آدمی تدارک اور تلافی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

ہیجان اور پروپگنڈا اگر مقصود نہیں تو متعدد ڈرامے اسٹیج سے قابل بھی ہیں۔ اُردو ادب کو ڈراموں کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے اور کرتار سنگھ دُگل اچھے ڈرامے لکھ کر ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بھی "اوپر کی منزل" آج کی اچھی سے اچھی کتابوں کے مقابلے میں رکھی جا سکتی ہے ——— اور اس کا سہرا مکتبہ جامعہ کے سر ہے

رشید نعمانی

## اپنے وطن میں اجنبی

مصنف: مالک رام آنند
ناشر: کلدیپ بک سینٹر بچہ ڈنگہ جموں
سنِ اشاعت: ۱۹۷۴ء
سائز: $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت چھ روپئے

ایک غمِ عشق اور غمِ روزگار کا مارا دہلی سے بمبئی پہنچتا ہے۔ اس کے احساس داور اک سے قلم بند کرنے سے "اپنے وطن میں اجنبی" کا تار و پود تیار ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں کوئی کردار بھرپور طریقے سے اُبھر کر سامنے نہیں آتا بلکہ ایک معاشرے کی تصویر اُجاگر ہوتی ہے۔ اس طرح مالک رام آنند نے دیس کے بڑے شہروں کی کھوکھلی زندگی کو بے نقاب کرتے ہوئے عوام کی زبوں حالی کی طرف توجہ دلانا چاہی ہے۔ یہ موضوع نیا نہ سہی، پھر بھی اپنے اندر کافی وسعت رکھتا ہے۔

مالک رام آنند کا اندازِ بیان پیچیدہ ہے۔ وہ عبارت آرائی کے شائق اور طلسمِ الفاظ کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ ناول کا آغاز یوں ہوتا ہے: "میں نغمہ ہوں، میں نے زندگی کا نوحہ ہر عنوان سے بیان کیا۔ ہر لے میں لچک کر میں نے جھومر شاخوں کو جھولے جھلائے ہیں، ہر پتے پر شبنم کی طرح گر گر اپنے نقوش اُجاگر کیے ہیں، ہر شگوفے ہر پھول پر مسکراہٹ بن کر حسن بن کر، تتلی بن کر چہکتا رہا۔ رقص کرتا رہا۔ شبِ تیرہ و تار، تنہائیوں کے جنگل میں میری ہی ہیئت کی پرچھائیں ایک کرن کا روپ دھارن کر کے ہر [illegible]

جاتے ہیں۔ یہی اُن کا مخصوص طرزِ ادا ہے۔

زبان کے معاملے میں وہ قطعی غیر محتاط نظر آتے ہیں۔ مثلاً "آپ کا اسمائے گرامی" (صفحہ ۸) "کتنا شاندار گھاس ہے" (صفحہ ۱۱۲) "دورانہ انداز" (صفحہ ۱۳۲) "تمہارے کومل ہونٹوں پر ایک الفاظ آیا۔" (صفحہ ۱۳۲) "کتنی ہی تاروں" (صفحہ ۷۰) "سڑک عبور کر لو" (صفحہ ۲۰۱) "بارش ٹپ ٹپ برس رہی ہے" (صفحہ ۳۰۲) "اپنے ہی پا آبلہ پر جھک گئی" (صفحہ ۱۵۱) "حسن سے معیار کو دیکھ کر کون اپنے منہ میں اُنگلی نہیں ڈالتا۔" (صفحہ ۹۵) اس نوعیت کی بے راہروی کے علاوہ اُنھوں نے بلا تکلف پنجابی زبان کی ترکیب سے بھی جملے استعمال کیے ہیں جس کی اُردو زبان ابھی متحمل نہیں ہو سکی ہے۔ مثلاً "میں نے کہاں جانا تھا" (صفحہ ۲) "میں نے کسی کا کچھ نہیں دینا" (صفحہ ۶۸) "میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا" (صفحہ ۸۹) "آپ لوگ یہ کس طرح کہہ دیتے ہو" (صفحہ ۲۷) اگر ہمارے ادیب زبان کے معاملے میں ایسی بے نیازی برتنے لگے تو پھر ــــــــ "کجا ماند مسلمانی"۔

کتابت و طباعت گھٹیا ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

## افکار و مسائل

مصنف: پروفیسر سید احتشام حسین
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ ۱۵۸ صفحات قیمت ساڑھے چار روپے
سن اشاعت: اپریل ۶۰ء ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

پروفیسر سید احتشام حسین اُردو کے اُن چند ناقدوں میں سے ہیں جن کی ذات سے جدید اُردو ادب کی آبرو قائم ہے۔ شبلی اور حالی کے بعد تنقید پر کوئی معیاری اور جامع کتاب جو نئے تقاضوں کو پورا کر سکے اب تک لکھی نہیں جا سکی ہے۔ لیکن احتشام صاحب اُن چند ممتاز اور مخصوص لوگوں میں سے ہیں جن کے تنقیدی مضامین کے مجموعے اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب موصوف کے مضامین کا ساتواں مجموعہ ہے جس میں بقول مصنف "شعر و ادب کے محض فنی پہلو پیش نظر نہیں ہیں بلکہ اُن کی سماجی اور تہذیبی قدروں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

(۳) تاثرات۔ پہلے حصے میں پانچ مضامین ہیں۔ تہذیب کے تقاضے، تہذیبی اختلاط۔ قومی ادب کا مسئلہ، مسلمان اور ہندی، فرقہ پرستی اور ادب۔ یہ پانچوں مضامین اس مجموعے کی جان ہیں۔ دوسرے حصے میں دس مضامین ہیں جو زبان، ادب اور تنقید سے متعلق ہیں۔ مثلاً زبان اور تہذیب، صحت زبان کا مسئلہ یا حالی اور ان کا عہد، مسعود حسن اور اس کے نقاد، اردو ادب میں بچوں کا ادب، یا اکبر کی شاعری موثرات اور محرکات۔ گنگو دان، مہدی افادی وغیرہ۔ تیسرے حصے میں بھی دس مضمون ہیں جن میں سے قدیم ہندوستانی مصوری، یورپی مصوری، تلسی داس۔ ایک تعارف اور اردو میں دوسری زبانوں کا افسانوی ادب اہم اور قابل مطالعہ ہیں۔ احتشام صاحب کے دوسرے مجموعوں کے مقابلے میں یہ مجموعہ مجھے کچھ ہلکا نظر آیا۔ بعض مضامین زیادہ تفصیل اور توجہ کے محتاج تھے۔ مثلاً "اردو میں بچوں کا ادب" یا "اردو میں دوسری زبانوں کا افسانوی ادب"۔ لیکن ان معمولی خامیوں سے قطع نظر یہ مجموعہ فکر انگیز مضامین کا حامل ہے، اور اس کتاب کے ناشر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ انھیں یکجا شائع کر کے اردو میں ایک اچھے مجموعہ کا اضافہ کیا ہے۔

عبداللطیف اعظمی

## نزہتِ دل

شاعر: سید محمد صدیق قہر
صفحات ۲۶۴۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت چار روپے
ناشر: اے آر تلیبائی اینڈ سنز۔ ۸۰ پاٹیا مینشن بمبئی ۳

اس مجموعہ کا سرسری سا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف "ادب برائے اخلاق کے علمبرداروں میں سے ہیں۔ جناب قاضی اطہر مبارک پوری نے "نزہتِ دل" کی حدیث میں مصنف اور شعری مجموعہ کا مختصر مگر ایک طرح سے جامع تعارف کرا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں سرزمین کوکن میں اردو ادب کی شمع کو موجودہ دور کی مخالف ہواؤں سے محفوظ اور روشن رکھنا ایک "کوہ کنی" سے کم نہیں ہے۔ اس لیے ہم مصنف کو تہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔

قہر صاحب نے اس مجموعہ میں حمد و نعت کے ساتھ کچھ غزلیں اور نظمیں بھی شائع کی ہیں مگر سب پر ان کے "اسلامی مزاج" کی چھاپ لگی ہوئی ہے اور شاید یہی ان کا طرۂ امتیاز

بھی ہے۔ اور پھر انداز کی اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا ؂

ایک آتا ہے ایک جاتا ہے　　　　اس کو کہتے ہیں گردشِ ایام

دو شعر اور ملاحظہ فرمائیے :

اُن کی محفل میں مرا دل کھو گیا　　　　یہ بھی ہونا چاہیئے تھا ہو گیا

جستجو ہی دلیلِ راہ بنی　　　　دَیر ہوتے ہوئے حرم پہنچے

نظموں کو دیکھ کر اس خیال کی اور تصدیق ہو جاتی ہے کہ موصوف ادب برائے اخلاق کے نظریہ پر سختی سے کاربند ہیں۔ اس لیے بجا طور پر یہ اُمید کی جاتی ہے کہ ان حلقوں میں اس مجموعہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا جو اخلاقی قدروں کے علمبردار ہیں۔ اور مغربی نظریات اور سائنسی ترقیات سے اپنے دامن کو پاک وصاف رکھنا چاہتے ہیں۔

ظلِ عباس عباسی

# کچھ پاکستانی ناول افسانے

| کتاب | مصنف | قیمت | کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|---|---|---|
| ایک داغ نہاں اور | ایم ذکا انصاری | ۳/۵۰ | بالو خاں | نفیس الدین احمد | ۶/۵۰ |
| اُجالا | قیسی رامپوری | ۷/۵۰ | پردیسی | صابرا نجم | ۱/۵۰ |
| ارمانوں کی بستی | مجاہد لکھنوی | ۵/۵۰ | پراسرار تہ خانہ | عارف حجازی | ۲/۵۰ |
| ابلیس | الیاس سیتاپوری | ۵/۵۰ | پشیمانی | عذرا جمال | ۶/- |
| اور تار ٹوٹ گیا | خالد چودھری | ۳/۳۷ | پچاس ہزار عورتیں | رئیس احمد جعفری | ۵/- |
| اجنبی | بشیر چشتی | ۳/- | پیچ و خم | ادا شیرازی | ۲/- |
| انقلاب | راحت آرا بیگم | ۱/۷۵ | پراسرار ساز | محمد جلیل الرحمٰن | -/۷۵ |
| انتظارِ سحر | سلیم چودھری | ۳/- | تیر نیم کش | خلیل احمد | ۴/- |
| اچھی صورت بری نگاہ | ریاض ارشد | ۳/- | تلاشِ سکون | خواجہ عبدالوحید | ۳/- |
| امتیاز | خواجہ ناصر عباس | ۳/- | ٹھنڈی آگ | | ۳/- |
| ایک مجاہد ایک شہید | مائل ملیح آبادی | ۴/۵۰ | ثمرۂ دیانت | قاضی عزیز الدین | ۴/- |
| انیقہ | ابن حیات | ۴/۲۵ | ثمینہ | الیاس سیتاپوری | ۶/۵۰ |
| اونٹ رے اونٹ | لالہ یعقوب | ۲/۵۰ | جلوے | آغا اشرف | ۱/۸۷ |
| آگ | ابراہیم موج | ۲/- | جزا | ابن حیات | ۴/- |
| اسرارِ حرم | اعجاز الرحمٰن | ۴/- | جنگلی | آرزو چودھری | ۴/۵۰ |
| انصاف | تیرتھ رام فیروزپوری | ۲/۵۰ | جدائی | رئیس احمد جعفری | ۶/۷۵ |
| بھڑکتے شعلے | عزیز آفاقی | ۱/۷۵ | چراغِ محفل | عادل رشید | ۴/۵۰ |
| بنت الہوس | اشرف درانی | ۴/۵۰ | حاتم کی کہانی طائی کی زبانی | فرید رضوان | ۳/۷۵ |
| بہرام کی گرفتاری | ظفر عمر | ۲/۲۵ | حادثے | ظفر عالمگیر | ۳/- |
| بدنظر | لطیف گل | ۴/- | چیلنج | قیسی رامپوری | ۷/۵۰ |
| باہمی | ظہور الحسن ڈار | ۲/- | خطاکار | وحشی محمود آبادی | ۶/- |
| بے کلی | عذرا جمال | ۶/۷۵ | خونی شیطان | تیرتھ رام فیروزپوری | ۴/۵۰ |

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

# تعلیم

## اُردو املا کا آسان طریقہ، عبدالغفار مدھولی

مدھولی صاحب جامعہ ملیہ کے بہت پرانے استاد ہیں۔ انھوں نے سالہا سال کے تجربے کے بعد اس کتاب میں اردو سکھانے کے گُر قاعدے اور اصول نہایت سادہ اور آسان زبان میں بتائے ہیں۔ قیمت ۱۔۷۵/-

## زندگی کا رُخ یا بچہ اور اس کی زندگی، سید انصاری

بچے کے نفسی کیفیتوں کو سمجھنا اور اس کی زندگی کے صحیح رُخ کو معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کتاب میں زندگی کے ان ہی پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اُستاد کو کس طرح کام شروع کرنا چاہیے۔ قیمت ۲/-

## تعلیم دینے کا فن، مصنف گلبرٹ ہگٹ، مترجم ڈاکٹر منوہر سہائے انور

یہ کتاب تعلیم دینے کے ان طریقوں سے وابستہ ہے جن کے ذریعے کوئی بھی مضمون زیادہ اچھی طرح پڑھایا جا سکے۔ اس میں جو تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ تعلیم دینے کے عملی تجربے کی روشنی میں پیش کی گئی ہیں۔ قیمت ۲/۵۰

## مدرسہ ابتدائی کی کہانی (حصہ اوّل) عبدالغفار مدھولی

مدھولی صاحب نے جامعہ ملیہ کے مدرسہ ابتدائی میں تقریباً ۳۰ برس کام کیا ہے۔ یہ کتاب اسی زمانے کی جدوجہد اور تجربے کی کہانی ہے۔ یہ کہانی استادوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن بچے بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ قیمت ۲/-

## کھیل کے ذریعے تعلیم

تعلیم جدید کے ذریعے میں کھیل کے ذریعے تعلیم (Play Method) کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ اُستاد محض کتابوں کے مطالعے سے اس کا استعمال جماعتوں میں کرا سکتے ہیں۔ مدھولی صاحب نے جامعہ ملیہ میں سالہا سال کے تجربے کے بعد انھیں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ کھیل کے ذریعے تعلیم اوّل (پہلی جماعت کے لیے) قیمت ۲/-

〃 دوم (دوسری اور تیسری جماعت کے لیے) قیمت ۱/-

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

# ادبی خبریں

مرتبہ ظل عباس عباسی

**اردو اخبارات کی تعداد** اخبارات کے رجسٹرار نے جو سالانہ رپورٹ شائع کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں اردو اخبارات کی تعداد ہندی کے بعد دوسری سب زبانوں سے زیادہ ہے۔

**اردو انسائیکلوپیڈیا** پنجاب یونیورسٹی لاہور نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اردو) کی دوسری جلد کا پہلا فراسہ شائع کر دیا ہے۔ جس میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ تک مقالے موجود ہیں جو بہت ہی مفید اور معلوماتی ہیں دوسرا فراسہ زیر طبع ہے۔

**اردو یونیورسٹی** بہار کونسل میں سنسکرت یونیورسٹی قائم کرنے کے بل کی حمایت کرتے ہوئے شری رام لکھن پانڈے (کانگریس) نے کہا کہ اگر اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو ہمیں اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے ایک اور ممبر شری کیلاش سنگھ نے اعتراف کیا کہ اردو کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا جا رہا ہے۔

**اردو مصنف کی سوانح عمری** حکومت کشمیر نے اردو کے مشہور مصنف اور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کی سوانح عمری کی اشاعت کے لئے دو ہزار روپئے کا عطیہ دیا ہے، یہ سوانح حیات موصوف کی ۶۰ ویں سالگرہ کے موقع پر پیش کی جائے گی۔

**کشمیری زبان کا پہلا اخبار** معلوم ہوا ہے کہ کشمیر سے کشمیری زبان میں ایک اخبار جاری ہونے والا ہے جو ابتدا میں ہفت روزہ رہے گا مگر بعد میں اسے روزنامہ میں تبدیل کیا جا سکے گا۔ اس سے پہلے کشمیری زبان میں کوئی اخبار نہ تھا۔



پرنٹر و پبلشر سید احمد ولی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لئے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مینجنگ ایڈیٹر
غلام ربانی تاباں

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۵ | اکتوبر سنہ ۱۹۶۴ء | شمارہ نمبر ۱۰

# اشاریہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سالانہ تعلیمی میلہ جس کے رنگا رنگ اور دلچسپ پروگراموں میں جامعہ کے بچے اور بوڑھے سب ہی شریک ہوتے ہیں، اپنی سابقہ روایات کے مطابق اس سال اکتوبر کی ۳۰۔ ۳۱ اور نومبر کی یکم تاریخوں کو ہو رہا ہے۔ اس تین دن کے میلے میں، جس میں جامعہ کے سب ہی شعبے کسی نہ کسی شکل میں حصہ لیتے ہیں، مکتبہ جامعہ کا بھی ایک شوروم اور ایک اسٹال ہوتا ہے اور اس کے علاوہ مکتبہ جامعہ کی طرف سے "فن اور فن کار" کے نام سے ایک ادبی سمپوزیم کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس سال کچھ زائد مصروفیات ہونے کے باوجود اس بار بھی یہ سمپوزیم منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس ادبی پروگرام کی تفصیل ہم کتاب نما کے اگلے شمارے میں شائع کریں گے۔

مکتبہ جامعہ کے پریس (لبرٹی آرٹ پریس) کے لئے بمبئی سے جو خودکار آفسٹ مشین آئی تھی وہ پریس میں نصب کر دی گئی ہے۔ امید ہے یکم اکتوبر سے پریس میں چھپائی کا کام شروع ہو جائے گا۔

جناب مکیش اکبرآبادی کی تحقیقی کتاب "نقد اقبال" کا ترمیم و اضافہ کے بعد نیا ایڈیشن مکتبہ جامعہ سے شائع ہو گیا ہے۔ جناب آل احمد سرور کی مشہور کتاب "تنقید کیا ہے" بھی اکتوبر کے پہلے ہفتے میں تیار ہو رہی ہے۔ مکتبہ جامعہ کی ایک اور نئی تحقیقی کتاب "اردو مرثیے" بھی، جو جناب سید سفارش حسین رضوی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، بہت جلد شائع ہو رہی ہے۔

جمیل جالبی

# نیا ادب اور تہذیبی اکائی

جب میں عہدِ حاضر کے اردو ادب اور ادیبوں کا خیال کرتا ہوں تو معاً مجھے اس بڑے سے غبارے کا دھیان آتا ہے جس کی ہوا نکل گئی ہو اور وہ میلی کچیلی دھجی کی مانند کسی بچے کے ہاتھ میں لٹک رہا ہو۔ اب اس غبارے کا استعمال صرف یہ ہے کہ بچے اپنے منہ سے چھوٹے چھوٹے غبارے بنائیں اور ہاتھ پر رکھ کر پٹاخ سے پھوڑیں تاکہ گھر والے چونک جائیں اور بچے مزا لیں۔ گزشتہ چار پانچ سال سے اردو ادب کے ادیب یہی کھیل کھیل رہے ہیں۔ اردو ادب کو دیکھیے تو فقرہ بازی کی ہوا سے ننھے ننھے غبارے بنا کر پٹاخ پٹاخ کی آواز سے سنسنی پھیلائی جا رہی ہے اور اس عمل کو نئے ادب کا نام دیا جا رہا ہے۔ ادب سے سنجیدگی غائب ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادیبوں کے سامنے فکر و ادب کا کوئی سنجیدہ مسئلہ باقی نہیں رہا ہے۔ ادیب کو آج یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کس کے لیے لکھ رہا ہے اور کیا لکھ رہا ہے زیادہ سے زیادہ اب اس کے سامنے وہ دوسرے لکھنے والے ہیں جو ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے اس کی تحریریں پڑھتے اور ردعمل بہم پہنچاتے ہیں اس لئے ادب سے متعلق جتنی تحریریں نظر آتی ہیں ان میں ایک ادیب دوسرے ادیب سے مخاطب ہے اور سنجیدہ مسائل کی جگہ ادبی سیاست نے لے لی ہے۔ ایسی بے ضرورت باتیں جو صرف قہوہ خانوں میں کی جاتی تھیں عام طور پر ادبی رسالوں میں نظر آ رہی ہیں۔ شہرت کی خاطر عہدِ حاضر کے ادیب نئی نئی شکلیں بنا کر سامنے آ رہے ہیں تاکہ ان کی عجیب و غریب شکلوں کو دیکھ کر لوگ ان کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ وہ کام جو پہلے سڑک کے کنارے مجمع لگانے والے مداری کرتے تھے اب ڈگڈگی بجا کر ہمارے ادیب کر رہے ہیں۔ اسی کو دیکھ کر کچھ سنجیدہ ادیب، ادب کی موت کا اعلان کر کے خاموش ہو گئے ہیں ــــ آخر جب یہی چیز ادب ٹھہرے تو ادب کے علاوہ کوئی اور

مفید کام کیوں نہ کیا جائے۔ ادب پڑھنے کے بجائے کرکٹ میچ کی کومنٹری کیوں نہ سنی جائے۔ جاسوسی، فلمی رسالے کیوں نہ پڑھے جائیں اور تاش کے کھیل سے فرصت کا وقت کیوں نہ گزارا جائے۔ پہلے ادب اس لیے پڑھا جاتا تھا کہ معاشرہ ادب کے ذریعے خود کو تلاش کرتا تھا اور فرد ادب کے ذریعے خود کو تخلیق کرنے کا کام لیتا تھا۔ اسی لیے کتابیں خریدنا، کتابیں پڑھنا خوش مذاقی کی بات تھی۔ جب ادب انسانی فکر و شعور کو کچھ نہ دے رہا ہو تو آخر ادب کیوں پڑھا جائے۔ اب تک ادب کا کام، شعوری طور سے بھی اور غیر شعوری طور سے بھی یہی رہا ہے کہ وہ زندگی سے خام مواد لے کر ایک ایسی دنیا تخلیق کرے جس کے معنی و اقدار ایک طرف ادیب کے اوریجنل تجربے کو دوام بخشیں اور دوسری طرف زندگی میں خیر کا اضافہ کر کے خود زندگی کو تازہ دم کر دے۔ لیکن یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب ادیب ادب سے سنجیدہ ہو اور زندگی سے اس کا پورا تعلق ہو۔ جو کچھ معاشرے میں ہو رہا ہے، جو کچھ معاشرے پر گزر رہی ہے، جو کچھ چھپی ہوئی خواہشات فرد کے اندر موجود ہیں نہ صرف ادیب ان سے واقف ہو بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہو یا کم از کم جاننے کے لیے بے چین ہو کہ آخر معاشرے نے زیادہ مقدار میں نیند کی گولیاں کیوں کھائی ہیں؟ آگاہی اور بصیرت کے اسی عمل کے ذریعے ادیبوں نے ہمیشہ احساس، جذبے اور فکر کو ایک ایسی شکل میں، ایسی ترتیب کے ساتھ، پیش کیا ہے جو شکل اور ترتیب خود فطرت کے پاس بھی موجود نہیں تھی۔ سچا ادب ہمیشہ معاشرے کے ساتھ بھی چلا ہے اور اسے ساتھ لے کر بھی چلا ہے۔ اس کا اظہار بھی کیا ہے اور اسے بدلا بھی ہے۔ اس زاویے سے اس دور کے ادب کو دیکھیے تو یوں محسوس ہو گا کہ آگاہی و بصیرت کا عمل ہمارے ہاں بند ہو گیا ہے اور وہی ادب کامیاب ہے جو کثیر الاشاعت اخباروں کے مقبول کالموں کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ حیات و کائنات کے مسائل کا علاج صرف و محض فقرے بازی کے تعویذ گنڈوں سے کیا جا رہا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ہمارے پاس سوچنے اور کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا ہے ذہنی طور پہ بے کاریِ محض کے اس ڈھا دینے والے احساس کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ ہماری نسل، اس نسل کی کہ جو زندہ تھی، صرف بھوت ہے۔

اس صورتِ حال کا شعور حاصل کر کے آپ مجھ سے یہ سوال پوچھنے میں یقیناً حق بجانب ہوں گے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب دراصل جدید ادب کا بنیادی

کرنا گمراہی کا وہ عمل ہے جو ہمیں کہیں نہ پہنچا سکے گا۔ ایک ایسے دور میں جب ادب شعور
انسانی کو کچھ نہ دے رہا ہو اور اس کی حیثیت صرف بھوسی چوکر کی سی ہو کر رہ گئی ہو
تخلیقی مسائل کو ادب میں تلاش کرنے کے بجائے خود زندگی اور معاشرتی نظام خیال
واقدار میں تلاش کرنا چاہیے جن سے ہماری زندگی عبارت ہے غور کیجیے کہ کیا ہمارے
لیے زندگی میں اور زندگی کے کوئی معنی باقی رہ گئے ہیں؟ جب زندگی خود اس طور پر
بے معنویت کا شکار ہو گئی ہو، جب زندگی میں کوئی جہت اور کوئی مقصد باقی نہ رہا
ہو تو آخر ادب میں کہاں اور کیسے معنی نظر آئیں گے ——— زندگی کی یہی بے معنویت
ہماری نسل کو تخلیقی سطح پر اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہی ہے اور ہماری نسل کے
ادیب برف کے تودوں کے پل بنا کر اپنی تخلیقی زندگی کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ کیا یہ صورت
بذاتِ خود تشویش ناک نہیں ہے۔

اگر ادب اور زندگی کے تعلق پر ہم ایمان رکھتے ہیں تو یہ بات آسانی سے سمجھ
میں آسکتی ہے کہ اگر معاشرہ زوال پذیر ہے، اگر معاشرے کے پاس اقدار و خیال کا
صحت مند نظام باقی نہیں رہا ہے تو اس معاشرے کا ادب بھی بے جان ہوگا۔ اس
لیے کہ ایک صحت مند معاشرے میں زندگی کی ہر سطح پر ادیب کے پاس کہنے کے لیے کچھ
نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ ہمارا اپنا معاشرہ قدم قدم پر تضاد کے بحران میں مبتلا ہے۔ خیال و عمل
میں کسی قسم کا ربط نہیں ہے۔ مروجہ اقدار اور تصورِ حقیقت پر ہم ایمان نہیں رکھتے ہمارا نظام
خیال اتنا کھوکھلا ہو چکا ہے کہ اب وہ تخلیقی عمل میں کسی قسم کا ساتھ نہیں دے رہا ہے،
آج تہذیبی و معاشرتی سطح پر اقدار و اخلاق کا کوئی ایسا زندہ نظام ہمارے پاس نہیں
ہے جس پر ہم مثبت طریقے سے زندگی کا کوئی نیا قلعہ تعمیر کر سکیں۔ اسی وجہ سے سارا
معاشرہ منتشر ہے۔ چیزوں کے رشتے بکھر گئے ہیں۔ جمی جمائی اقدار ٹوٹ پھوٹ کر ایک
ڈھیر کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ خیالات اور عقائد کا وہ نظام، جس پر صدیوں سے
ہم یقین رکھتے چلے آئے تھے اور جو ایک تہذیبی اکائی کی حیثیت سے ہمارے شعور میں زندہ
تھا، اب بے معنی اور از کار رفتہ نظر آنے لگا ہے۔ سارے معاشرے میں اب کوئی چیز
اپنی اصل شکل میں نظر نہیں آتی۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ اصل نہیں ہے اور جو چیز اصل ہے
وہ نظر نہیں آتی۔ تضاد نے ساری زندگی کو گھیر لیا ہے اور عدم تحفظ کے احساس

کو شدید تر بنا کر زندگی سے کام کرنے کی گرم جوشی ہی کو ختم کر دیا ہے۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جب معاشرہ اس درجہ بدحال ہو اور خود زندگی میں اہم واقعات پیش نہ آ رہے ہوں تو آخر ادب میں کہاں سے آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نسل کے ادیب صرف خود کو دُہرانے اور گلی سڑی ہڈیوں کو چوس چوس کر مزے کا احساس دلانے کا کام کر رہے ہیں زندگی کی ہر سطح پر تخلیق کی آگ سرد پڑ گئی ہے اور خیال کا ارتقا بند ہو گیا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو اور معاشرتی و تہذیبی اقدار وقت کے ساتھ چلنے یا وقت کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہوں تو ادب میں معنی کہاں سے آئیں گے؟ آج کے ادب اور ادیب کا یہ بنیادی مسئلہ ہے۔

جب میں سوچتے سوچتے یہاں تک پہنچا تو ایک سوال میرے ضمیر میں کانٹے کی طرح کھٹکا کہ جب ادب کے زوال اور تخلیق کی آگ سرد پڑ جانے کے اسباب ہم معاشرے میں تلاش کر رہے ہیں تو آخر میرؔ و سوداؔ کا معاشرہ بھی تو زوال پذیر معاشرہ تھا۔ اس دور میں یہ کیسے ممکن ہوا کہ اردو شاعری نے عظمت کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیا۔ اگر معاشرے کی زوال پذیری ہمارے دور کے ادب کو بے جان اور بے معنی بنائے ہوئے ہے تو میرؔ و سوداؔ کے زوال پذیر معاشرے نے اپنے دور کے ادب کو بے جان کیوں نہیں بنایا؟ یہ یقیناً ایک اہم سوال ہے لیکن اس کا جواب اتنا دشوار نہیں ہے جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ میرؔ و سوداؔ کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف فتنے چاروں طرف سر اٹھا رہے ہیں لیکن ان کا اثر کلچر کی بنیادوں اور تہذیبی اداروں کو شدت کے ساتھ متاثر نہیں کر رہا ہے۔ کلچر کا خارجی ڈھانچا اور مروجہ اقدار پر معاشرے کا ایمان اسی طرح باقی ہے۔ ایک شہر اجڑتا ہے دوسرا شہر بستا ہے لیکن کلچر کا خارجی اور داخلی ڈھانچہ بنیادی طور پر وہی رہتا ہے تصورِ حقیقت کے اعتبار سے کلچر کا اندرونی استحکام اسی طرح باقی ہے اور بیرونی حملوں اور اندرونی فتنوں کے باوجود انقلاب کا کوئی گہرا تہذیبی اثر نہیں ہے۔ میرؔ و سوداؔ کا یہ دور تہذیبی و معاشرتی اعتبار سے انقلابی دور ہرگز نہیں ہے۔ اس کی پشت پر صدیوں پرانے تہذیبی ادارے اسی استحکام کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ سارا معاشرہ ان پر ایمان رکھتا ہے اور بحران کے باوجود معاشرہ ان اداروں کو بدلنے یا خود بدل جانے کے امکان پر نہیں سوچ رہا ہے اس لیے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں تہذیبی

سطح پر انقلاب آرہا ہو۔ جہاں نظام اقدار پر سے ایمان اٹھ رہا ہو اور ساتھ ساتھ معاشرہ اندر سے بدل کر اپنے تصور حقیقت کو بدلنے کی سوچ رہا ہو عظیم ادب کی پیدائش یقیناً ممکن نہیں رہتی۔ جب ایسا دور آتا ہے تو بڑے ادب کی پیدائش بند ہو جاتی ہے اور ادب سے صرف روں روں کی آواز آنے لگتی ہے۔

اس کی مزید وضاحت کے لیے یورپ کے کلاسیکی ادب کی مثال لیجیے۔ دانتے کی شاعری میں نشاۃ الثانیہ کے آثار نظر آتے ہیں یا ورجل کی شاعری میں ایک بہتر دنیا کی خواہش کا احساس ملتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم نہ دانتے کو اور نہ ورجل کو انقلابی شاعر کہہ سکتے ہیں وہ تو ان تہذیبی اداروں پر یقین کامل رکھتے ہوئے ادب تخلیق کر رہے ہیں جنھیں صدیوں سے وہ اور ان کی قوم کے افراد جانتے ہیں۔ ان ادوار میں سلطنت روما اور کیتھولک چرچ کا معاشرتی نظام، جس نے ان ادوار کو تصورِ حقیقت کا ایک زندہ نظام دیا تھا۔ زوال آمادہ ضرور ہے لیکن اس زوال آمادگی کے باوجود ان دونوں شاعروں کی فکر کی نوعیت یہ ہے کہ وہ انھیں پورے طور پر ایک تہذیبی اکائی کی حیثیت سے قبول کیے ہوئے ہیں۔ اگر ان کے شعور میں تہذیبی اکائی کے تعلق سے یہ استحکام باقی نہ رہتا اور ان کا ایمان ان اداروں اور اقدار پر سے اٹھ جاتا اور وہ ایک ایسے دور میں زندہ ہوتے جسے جدید اصطلاح میں انقلاب کا نام دیا جاتا ہے تو وہ تخلیقی سطح پر یہ کام انجام نہیں دے سکتے تھے جو انھوں نے اپنے اپنے دور میں دیا۔ ایک ایسے دور میں جب شدید قسم کا انقلاب معاشرے کو منتشر کر رہا ہو۔ اس کے تہذیبی اداروں کو بدل رہا ہو۔ مروجہ نظام خیال اپنے معنی کھو رہا ہو تو ادیب کے لیے کوئی کارنامہ انجام دینا ایک دشوار تر امر بن جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے میرؔ و سوداؔ کے دور کو دیکھیے تو حیرانی دور ہو جاتی ہے اس معاشرے میں انقلاب کا تصور ذہنی طور پر صرف سطحی بحران تک محدود ہے۔ سارے تہذیبی ادارے اسی طرح جوں کے توں برقرار ہیں۔ تاریخی عمل بنیادی طور پر معاشرے کے اندر وہ انقلاب پیدا نہیں کر رہا ہے جو تہذیبی اداروں کو اکھاڑ پھینکتا ہے اور نتیجے کے طور پر تخلیقی عمل کو مجروح کرتا ہے۔ تخلیق کی آگ کے لیے معاشرتی و تہذیبی سطح پر بنیادی اداروں پر ایمان کا سالم و قائم ہونا ازبس ضروری ہے۔ میرؔ و سوداؔ کا اپنے معاشرے، اس کی اقدار اور نظام خیال سے زندہ اور مربوط

رشتہ باقی ہے اور اسی لیے تہذیبی زوال کے آثار کے باوجود وہ تخلیقی سطح پر وہ کام انجام دے رہے ہیں جو ہمارے اپنے دور میں ممکن نہیں ہے۔

ہمارے اپنے معاشرے کا معاملہ میرؔ و سوداؔ کے دور سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے تہذیبی ادارے اب دم توڑ رہے ہیں۔ اقدار اور نظام خیال، یہاں تک کہ عقائد بھی اب ہمارے لیے وہ معنی نہیں رکھتے جو آج سے پندرہ بیس سال پہلے تک رکھتے تھے۔ مادی و صنعتی ترقی طویل المیعاد تصور تہذیب کو بدل رہی ہے۔ سائنس کے اثرات ذہن انسانی کو انتہائی تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ آج ہم تہذیبی سطح پر اندر سے ٹوٹ گئے ہیں۔ ——— اب ایسے میں جب زندگی کی ہر سطح پر انقلاب ہمارے عقائد، خیال، احساس اور جمے جمائے نظام کو ڈھا رہے ہوں تو اچھے اور بڑے ادب کی خواہش اس بچے کی خواہش سے کم نہیں ہے جو اس بات پر ضد کر رہا ہے کہ مجھے چندا ماموں لا دو۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہماری نسل ذہانت کے اعتبار سے اپنے اسلاف سے ایک درجہ آگے ہے۔ سنجیدہ ادیبوں میں محنت، توجہ اور لگن کے ساتھ کام کرنے کی خواہش بھی موجود ہے۔ ہم نے پڑھنے لکھنے کو، اپنے اسلاف کی طرح، اوڑھنا بچھونا بھی بنایا ہے لیکن اس کے باوجود ہم ادب میں وہ کارنامے انجام نہیں دے رہے ہیں جو ہمارے اسلاف نے دیے تھے۔ اس کی وجہ اگر تلاش کی جائے تو صرف یہ ہے کہ ہماری نسل تاریخ کی بے رحمی کا شکار ہے۔ ہم تاریخ کے ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے ہیں جہاں بہت کوشش کے باوجود ہم بہت کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے دور کی تاریخ نے اندرونی انقلاب کی قوتوں کو اتنا تیز کر دیا ہے کہ وہ ہمیں تنکے کی طرح بہا دیتی ہیں۔ یہ ہماری نسل کا مقدر ہے اور اسے قبول کر کے ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ اکثر مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہماری نسل اپنے مقدر کو قبول کر کے زیادہ سے زیادہ یہ کام کر سکتی ہے کہ وہ آنے والی نسل کے لیے خام مواد بن جائے جس پر کوئی میرؔ، کوئی انیسؔ، کوئی غالبؔ، کوئی اقبالؔ اپنی عظمت کی بنیاد قائم کر سکے۔ اسی بات کو محسوس کر کے ایڈمنڈ ولسن نے کہا تھا کہ اس ادیب کو جو طویل عرصے تک زندہ رہنے والا ادب تخلیق کرنا چاہتا ہے اپنے سعد ستاروں کا شکر گزار ہونا چاہیے اگر اس وقت کوئی شدید قسم کا انقلاب اس کے اپنے ملک، اور اپنے دور میں نہیں آرہا ہے اگر معاشرہ تغیر عظیم سے بکھر رہا ہے تو شاید وہ لکھنے کے قابل ہی نہیں رہے گا۔

برخلاف اس کے وہ شخص جو معاشرتی و تہذیبی تاریخ کے ایک ایسے دور میں پیدا ہوا ہو جہاں معاشرتی و تاریخی رجحان ایک ایسے نقطے پر جمع ہو گئے ہوں کہ کوئی شخص آئے اور ان کو ترتیب دے کر ایک شکل میں پیش کر دے جینئس کہلاتا ہے۔ اسی لیے ہربرٹ اسپینسر کا کہنا ہے کہ اس سے قبل عظیم لوگ معاشرے کی تشکیل کریں ضروری ہے کہ معاشرہ ان کی تشکیل کر چکا ہو تخلیقی سطح پر کوئی کارنامہ دراصل تہذیبی عناصر کے ایک نئے کیمیاوی امتزاج کا نام ہے یا پھر موجودہ کلچر میں نئے عناصر کی جذبات پذیری کا نام ہے۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکلا کہ کوئی ایجاد، انکشاف یا ادب و فن کا کوئی کارنامہ اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک کلچر نے خیال و مواد کے سارے عناصر کو اس قابل نہ بنا دیا ہو کہ ان کا کیمیاوی امتزاج ممکن ہو سکے۔ پتھر کے دور میں اسٹیم انجن کی ایجاد ہرگز ممکن نہیں تھی۔ اگر وہ سارے عناصر جو بارش کا سبب بنتے ہیں یکجا ہو گئے ہیں تو بارش ضرور ہوگی۔ ہر چیز اس وقت تک تخلیقی سطح پر زندہ رہتی ہے جب تک معاشرہ اور اس کا نظام خیال زندہ اور صحت مند رہتا ہے۔ اگر معاشرہ صحت مند نہیں ہے تو اس معاشرے کا ادب نہ صرف ادب بلکہ ہر تخلیقی سرگرمی زوال پذیر ہوگی۔ اس لیے اگر آج ہمارے ادب کے پودے مرجھا گئے ہیں تو اس کے اسباب کی تلاش ہمیں اپنے معاشرے اور اپنے نظام خیال میں کرنا ہوگی۔

اب ایسے میں ایک امکانی صورت یہ ہے کہ کوئی ایسا دیو قامت 'مفکر ادیب' پیدا ہو جو اپنی مختصر سی زندگی میں دو بڑے ادیبوں کا کام انجام دے۔ ایک کام یہ کہ وہ نئے اقدار و معانی کے پودے اپنے معاشرے کی سرزمین میں لگائے اور دوسرے یہ کہ انھیں اتنا پروان بھی چڑھا دے کہ وہ پھل دینے لگیں اور معاشرہ ان پیڑوں پر لگے ہوئے پھلوں کا ذائقہ چکھ سکے۔ جب تک یہ نہ ہوگا تخلیقی قوت صرف 'ہیجان' کی شکل میں زندہ رہے گی۔ اور سارا معاشرہ اسی ہیجان سے اپنی ذہنی بھوک آسودہ کر کے مٹی کے ڈھیلوں کو ادب کا نام دیتا رہے گا۔

تخلیق کی سطح پر یہ صورتِ حال بہت تشویش ناک ہے لیکن جہاں ادیبوں نے سوچنے کا کام بند کر دیا ہو۔ جہاں ادیب خود اندھے اور بہرے ہو گئے ہوں۔ جہاں ادیب مسائل سے زیادہ مصلحتوں میں دلچسپی لینے لگے ہوں۔ جہاں ذہنی بزدلی اور سمجھوتوں نے فکر کے سوتے خشک کر دیے ہوں وہاں ہماری نسل خام مواد بن جانے کا کام بھی انجام نہیں

دے سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نسل کے ادیبوں پر تنہائی عذاب بن کر نازل ہوئی ہے۔ ہماری آرزوئیں گونگی ہیں۔ وصل میں رنگ اڑ گیا ہے اور آج ہم تنہائی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ اور بھری دنیا میں تنہا نظر آتے ہیں۔ کیا ہم یہ نہیں کر سکتے کہ جو کچھ دیکھ رہے ہیں اسے معاشرے کو بھی دکھا دیں۔ جو کچھ محسوس کر رہے ہیں اسے معاشرے کو بھی محسوس کرا دیں ——— آج اردو ادب کو ہر کاروں اور گورکنوں کے بجائے جری سورماؤں کی ضرورت ہے۔ ایسے جری سورما جو زندہ رہ کر موت کا تجربہ کرنا جانتے ہوں۔ جو میر یا اقبال کی ڈیڑھ درجن خصوصیات گنوانے، روایتی انداز میں غزلیں نظمیں کہنے یا بندھے ٹکے موضوعات افسانے ناول لکھنے کے بجائے عہد حاضر کے مسائل پر سوچنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ جو عہد حاضر کے طوفانی دھاروں اور ہلکی ہلکی پھوار دونوں سے باخبر ہوں۔ جو روایت کو اپنا کر روایت کو توڑنے کی قوت بھی رکھتے ہوں۔ جو معاشرے کو فکری مسائل میں شریک کر کے اسے تبدیلی کا نیا شعور دینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہوں اور شاید جدید عہد حاضر کے اردو ادب اور ادیبوں کا یہی سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ ■■

---

(باقی صـ۲۲ کا)

پنکھوں کی بھن بھن ——— اس نے دیکھا، میزوں پر پیپر ویٹس کے نیچے دبے ہوئے کاغذ بھرے دھیرے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ چوں چوا دھر کئی دنوں سے اکھڑی اکھڑی سی تھی، یکبارگی کھٹ سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اس نے اطمینان کی ایک لمبی سی سانس لی۔ اور سوچنے لگا۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد میں کتنے دن جی سکوں گا۔ کیوں کہ پھر تو چھٹی منسوخ کرنے کا کوئی سوال بھی نہ ہوگا۔" (بشکریہ "تلاش" دہلی)

---

(باقی صـ۲۳ کا)

| | | | |
|---|---|---|---|
| آسمان روشن ہے (ناول) | کرشن چندر | -/۳ | ایشیا پبلشرز، دہلی |
| جستجو (تنقید) | سید مجاہد حسین حسینی | 2/50 | |
| جگر مرادآبادی اور ان کی شاعری | فرمان فتح پوری | | مشتاق بک ڈپو، کراچی |
| کتب خانے ایک تاریخی جائزہ | انیس خورشید | | " " " |
| اردو میں تنقید (اضافہ شدہ) | ڈاکٹر محمد احسن فاروقی | | " " " |

سیفی پریمی

# غزل

وہ گاہ گاہ ترا التفات کیا کہنا
بھلا دیا ہے غمِ کائنات کیا کہنا

مری نگاہ کو جنت بنا دیا تو نے
ترے شباب کو جانِ حیات کیا کہنا

رہِ نگاہ میں کونین کی حقیقت کیا
تری نظر ہے مری کائنات کیا کہنا

مچل رہے ہیں تصور میں حسن کے جلوے
تڑپ رہی ہے جدائی کی رات کیا کہنا

ہر ایک غم سے بچایا غمِ محبت نے
یہ جاں نواز طریقِ نجات کیا کہنا

نظر کے سامنے تیرا بدن تھا آئینہ
وہ بے پناہ تجلی کی رات کیا کہنا

تمھیں سکون ہے لیکن مجھے سکوں نہیں
حیاتِ عشق کی تو واردات کیا کہنا

تری نگاہ نے الفت کا ساز چھیڑ دیا
حیات بن گئی اصلِ حیات کیا کہنا

کسی کی تلخ کلامی کا ذکر کیا سیفی
ہر ایک بات ہے شاخِ نبات کیا کہنا

**یہ غزل**

سیفی صاحب کے مجموعۂ کلام 'خلش' سے لی گئی جو اس ماہ پہلی بار شائع ہوا ہے۔ 'خلش' غزلوں کا مجموعہ ہے جس کو کسی قامتِ کافر کے تذکرے نے بادہ رس و رنگ بنا دیا ہے۔ 'خلش' میں زلف برہم کا دل فریب عالم بھی ہے اور آئینۂ جمال کی سحر آفریں لہریں بھی۔ 'خلش' داخلی کیفیات کے ساتھ خارجی حقائق کی اثر انگیز ترجمانی بھی کرتی ہے سیفی صاحب کا یہ مجموعۂ کلام مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے مل سکتا ہے۔ قیمت: ۲/۰۰

اقبال مجید

# بڑا بابو

پانچ بجے اسٹیبلشمنٹ سیکشن کے بڑے سے ہال میں فائلیں پھٹا پھٹ بند ہونا شروع ہو جاتیں۔ کرسیاں پیچھے کھسکائی جاتیں اور دن بھر کے تھکے ہارے کلرک بھرّا مار کر اس بڑے سے کمرے کے باہر نکل پڑتے، اور پھر ان کا قافلہ دفتر کی سائیکل اسٹینڈ کی طرف رینگنا شروع کر دیتا۔ اس وقت اس وسیع کمرے میں خالی خالی میزوں اور کرسیوں کے بیچ بھن بھن کرتے ہوئے بجلی کے پنکھوں کی اکیلی اور مسلسل آوازوں کے درمیان پیپر ویٹس کے نیچے دبے ہوئے کاغذوں کی پھڑ پھڑاہٹ کے پس منظر میں وہ کیکڑے کی طرح اپنے سوکھے سوکھے ہاتھ پیروں کو سکوڑے اپنی کرسی پر دونوں پیر رکھ کر بڑے انہماک سے فائل پر کچھ لکھنے میں مصروف رہتا۔

دن کے شروع حصے میں وہ اپنی کرسی پر بہت کم بیٹھتا، دفتر ہمیشہ گھبرایا گھبرایا سا پہنچتا اور پھر کھڑے کھڑے ہی فائلوں کے فیتے کھولتا، کاغذات کو الٹا سیدھا پڑھتا بڑبڑاتا کڑھتا، چپراسیوں کی حرام خوریوں پر چیختا اور یہ کیفیت تقریباً لنچ ٹائم تک اس پر طاری رہتی۔ وہ اتنی تیزی سے اس درمیان کام کرتا کہ آدھی سے زیادہ میز بالکل صاف ہو جاتی اور اس کے بعد جب وہ ذرا آرام سے کرسی پر بیٹھ کر پیٹھ لگاتا تو اس وقت اُسے یہ احساس ہوتا کہ وہ اپنے سیکشن کا بڑا بابو ہے اور ہال میں بیٹھنے والے گیارہ کلرکوں کا ہیڈ۔ وہ بادشاہوں کی متانت کے ساتھ چاروں طرف نظریں دوڑاتا اور سامنے کھڑے ہوئے چپراسی کو آواز دیتا۔

"شہزادے!"

"جی بڑے بابو!"

"دیکھو ان لوگوں کو باہر نکالو۔ اگر کل سے یہاں بھیڑ لگی ہوئی دیکھی تو تمھاری گردن

ناپوں گا۔ یہ اسٹیبلشمنٹ سیکشن ہے کہ چوراہا۔ سب یہیں مٹرگشتی کرتے ہیں۔" یہ بات وہ چپراسی سے پچاسوں بار کہہ چکا تھا۔ چپراسی بھی پچاسوں بار لوگوں کو منع کر چکا تھا لیکن ایک دو روز امن رہتا اور پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔

پچھلے بارہ سال سے وہ اس کمرے کی دیواروں پر طرح طرح کی کمپنیوں کے کیلنڈروں کو لٹکتے، سجتے اور اُترتے دیکھ چکا تھا۔ ایک بار لنچ کے وقت چائے کے دوران ایک کلرک نے اس سے پوچھا تھا، کہ وہ ملازمت کے کتنے سال گزار چکا ہے تو وہ اپنی گنجی چاند کھجاتے ہوئے مسکرایا تھا اور بولا تھا۔

"شہزادے! سال واں جان کر کیا کروگے۔ بس یہ سمجھ لو کہ اب تک دفتر کے صرف اسی سیکشن کے کاغذوں پر آٹھ دس گیلن روشنائی اپنے قلم کی نب سے بہا چکا ہوں۔"

کلرک یہ سن کر اچھل پڑا۔ جس پر اسے غصہ آگیا اور وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"اس میں حیرت کی کونسی بات ہے۔ بھیا دس سال اور ایک مہینہ تو ہیڈ کلرکی کرتے ہوئے ہوگیا۔ ریکارڈ روم کے کاغذوں کی کم سے کم چالیس من ردی میں شاید ہی کوئی ایسا کاغذ نکلے جس پر میں نے نوٹنگ نہ کی ہو۔"

"ارے واہ دادا!" کلرک رعب میں آکر بولا "تب ہی تو سارا دفتر تمھیں دادا کہہ کر پکارتا ہے۔"

"اما، سب میرے ہاتھ کے سکھائے ہوئے لونڈے ہیں۔" یکبارگی اسے جوش آگیا۔ میں کہتا ہوں انھوں نے سروس بھر میں جتنے الفاظ لکھے ہوں گے اس سے زیادہ تو قلم کی نبیں گھس کر پھینک چکا ہوں۔ ایک دو نہیں، پچیس سال سے یہی چکر چل رہا ہے شہزادے۔"

کلرک کا نام شہزادے نہیں تھا۔ دفتر میں کسی کا نام شہزادے نہیں تھا، لیکن بڑا بابو ہر ایک چپراسی اور ہر ایک کلرک کو شہزادے کہہ کر پکارتا تھا۔ جو اس کے سامنے پڑ جاتا وہ اس کو شہزادے کہہ کر پکارتا۔ اکثر اس کے اس تخاطب پر ایک وقت میں دو آدمی اس کی طرف متوجہ ہو جاتے، تو پھر وہ ان کے کپڑوں سے تفریق کرتا "تمھیں نہیں، نیلی قمیض والے شہزادے کو پکار رہا ہوں۔" خدا جانے یہ لفظ شہزادہ اس کے دماغ میں کیوں گھس گیا تھا۔

لیکن جب سے نیا صاحب آیا تھا اور بڑے بابو کے ساتھ تابڑ توڑ دفتری افسر کی ناراضگی کے کئی واقعات ہو چکے تھے۔ تب سے وہ بہت خاموش اور فکرمند رہنے لگا تھا۔ کئی بار اس نے لوگوں سے کہا کہ وہ اب طویل رخصت لے کر گھر پر آرام کرنا چاہتا ہے۔ ایک روز وہ صرف پانچ منٹ دیر سے پہنچا تو اس کے سامنے رجسٹر پر سرخ نشان بنا دیا گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ نوکری میں پہلی بار اس کے نام کے سامنے یہ نشان بنا تھا۔ اس نے مارے غصے کے اس روز کام نہیں کیا۔ دو مہینے کی چھٹی کی درخواست لکھی اور صاحب کی میز پر رکھ آیا۔ پھر یہ ہوا کہ ایک ٹائپ کیا ہوا مضمون جب صاحب کی دستخط کے لیے اس نے پیش کیا تو اس میں دو غلطیاں نکل آئیں۔ "دیکھیے، اس طرح کام نہیں چلے گا۔" صاحب اس پر غرّایا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ کچھ دیکھتے بھالتے نہیں۔ اسے پھر سے ٹائپ کرائیے۔" صاحب نے وہ کاغذ اس کے منہ کی طرف اچھال دیا۔ وہ خاموش رہا۔ دوسرے دن اس نے افسر سے اپنی چھٹی کی درخواست پر بات کی اور اس کے کمرے سے نکل کر کینٹین میں آ بیٹھا۔ لوگوں نے اسے آپے سے باہر دیکھ کر پوچھ کچھ کی تو بولا۔

"کل کے لونڈے افسر بن گئے ہیں اپنے کو کیا ہے، نوکری کرنا ہے، ایسا کرو ایسا کریں گے، ویسا کرو ویسا کریں گے۔ لیکن بھیا اس طرح بہت دنوں نہیں چلے گی۔ عورت الگ طعنے دے دے کر کھائے جا رہی ہے۔ کہتی ہے صبح شام جب دیکھو دفتر دفتر۔ تمھاری طرح کوئی نوکری کے کارن گھر میں آگ نہیں لگا دیتا ——"

اور پھر ایک دن یہی ہوا۔ بڑے بابو کی چھٹی منظور ہو گئی اور وہ دو ماہ کی رخصت پر گھر بیٹھ رہا۔

اس کی چھٹی کا پہلا دن اس کی بیوی بچّوں کے لیے بڑا ہنگامی دن ثابت ہوا۔ چھٹی لے کر جب وہ رات اپنے بستر پر لیٹا تو اس نے سوچا تھا کہ وہ سویرے دن چڑھے تک سوئے گا۔ لیکن سویرے حسبِ عادت اس کی آنکھ کھل گئی۔ چائے پینے کے بعد وہ آرام سے بیٹھا۔ اس کے پاس پورے دو مہینے خالی پڑے تھے۔ وہ جس طرح چاہتا پوری آزادی کے ساتھ انھیں استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو آواز دے کر اپنے پاس بٹھایا۔ اس کو اپنے لمبے چوڑے پروگرام سے آگاہ کیا اور ان سارے کاموں کی

ایک فہرست ترتیب دی۔ جو فرصت نہ ہونے کے سبب التوا میں پڑے ہوئے تھے۔ اس نے رات کو لیٹتے وقت ایک لمبا چوڑا پروگرام بنایا تھا۔

پہلے دن تو وہ ایک جانگیا اور بنیان پہن کر گھر کے سارے کمروں کی چھتوں اور کونوں میں لگے ہوئے جالے صاف کرتا رہا۔ دن میں سوا نو بجے کے قریب اسے بھوک لگ اٹھی۔ وہ کئی برس سے دفتر جانے سے پون گھنٹہ پہلے کھانا کھالینے کا عادی تھا، لہٰذا صفائی و فائی چھوڑ چھاڑ کر وہ باورچی خانے میں گھس گیا۔ اس کی بیوی نے کھانا نکال کر دیا تو وہ اس پر ٹوٹ پڑا۔ بیوی اسے کچھ دیر دیکھتی رہی۔ وہ جلتے جلتے نوالے جلدی جلدی حلق سے اتار رہا تھا۔ آخر وہ بول اٹھی۔

"اب آج کونسا دفتر کی دیر ہو رہی ہے جو ریل گاڑی چھوڑے ہوئے ہو۔ ٹھیک سے کھاؤ نا" اور اسے جیسے ایک دم سے بریک لگ گیا۔ بات تو ٹھیک تھی لیکن چند لمحوں بعد اس کی رفتار پھر اپنی اصلی حالت پر آ گئی۔ جالے والے صاف کرنے کے بعد وہ اپنا ٹرنک اٹھا لایا اور انگنائی میں لا کر ڈال دیا۔ اپنے گرم کپڑے دھوپ میں ڈالے۔ دوسرے صندوق کو کھولا۔ جو کاغذات سے بھرا تھا۔ دو تین گھنٹوں تک وہ ان کاغذات کو الٹتا پلٹتا رہا۔ پرانے خط، کیش میمو، بل کی رسیدیں اور ردّی کاغذات پڑھ پڑھ کر پھاڑتا رہا۔ جب وہ اٹھا تو ردّی کاغذوں کا ایک ڈھیر سا لگ گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے کمرے کی چیزوں کو قرینے سے لگایا۔ سارے فرش کو پانی سے دھویا گنیش جی کی مورتی کو براسو سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ بچوں کے کئی میلے کپڑے بھی اس نے دھو کر پھیلا دیئے۔ حالاں کہ اس کی بیوی نے کافی احتجاج کیا۔

دوسرے دن بھی وہ گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بے حد مشغول رہا۔ دن کا کھانا کھانے کے بعد اس نے گھر بھر کے پرانے جوتے، چپلیں جمع کیں۔ اور ان کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ بڑے لڑکے کے جوتے کے تلے نے دانت نکال دیئے تھے کسی کی چپل کا فیتہ الگ ہو گیا تھا کسی کی ایڑی گھس گئی تھی۔ کسی کا پٹہ اکھڑ گیا تھا۔ اس نے سب کو تھیلے میں رکھا اور انھیں ٹھکوانے چلا گیا۔ واپس آ کر اس نے پالش کی ڈبیاں اور برش سنبھالے اور ایک سرے سے سب کے جوتوں پر پالش کی۔ شام کو مطب کے وقت

[illegible]

مدت سے گلے میں گھینگھے کی شکایت تھی۔ اس ڈاکٹر نے اسے ایک دن کی خوراک دے کر آٹھ دن کی چھٹی کر دی۔

تیسرے دن وہ اپنے بیوی بچوں کو ان کے عزیزوں سے ملانے لے گیا۔ اس کی بڑی سالی نے متعدد بار اس کے گھر نہ آنے کی شکایت کی تھی، لہٰذا وہ شام اس نے بچوں کے ساتھ بڑی سالی کے یہاں گزاری، اگلے دن اس کی بیوی نے دبی زبان سے بازار چلنے کو کہا تو وہ سب کو لے کر اس شام بڑی شان سے نکلا۔ اس نے دو ہی بجے سے بچوں کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ سب کے بال کٹوائے گئے تھے سب کو نہلایا گیا تھا اور سب نے ہی اپنا اچھے سے اچھا جوڑا نکال کر پہنا تھا۔ اس شام اس نے بچوں کے ساتھ قلفی ملائی کھائی اور پڑوس کے سینما ہال میں کوئی دھارمک فلم دیکھا۔ غرض کہ شروع کا ایک ہفتہ آندھی طوفان کی طرح گزر گیا اور اسے کسی کمی کا احساس ہی نہ ہوا۔ ان دنوں وہ بہت خوش خوش رہا، لیکن ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ اُسے ایک عجیب انکشاف ہوا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق ساڑھے نو بجے کھانا وانا کھا چکا تو پلنگ پر آ کر لیٹ گیا اور اُن کاموں پر غور کرتا رہا جو فرصت نہ ہونے کی وجہ سے ادھورے پڑے تھے۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ سارے کام پچھلے چار دنوں میں ہی مکمل ہو چکے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ کم سے کم ایک ماہ اسے ان کاموں کو ختم کرنے میں لگ جائے گا، اس نے پچھلے چھ سال سے کوئی چھٹی نہیں لی تھی۔ اس کی ساری چھٹیاں یوں ہی پڑی تھیں۔ لیکن اب افسر سے الجھنے کے بعد اسے کئی بار یہ محسوس ہوا کہ وہ بہت تھک چکا ہے۔ اسے کچھ عرصہ آرام کی ضرورت ہے۔ لہٰذا یہ سوچ کر اسے بڑا سکون ہوا کہ چلو گھر کے کام ختم ہو گئے تو کیا ہوا، کم سے کم وہ کچھ عرصے دفتر کے جنجال سے تو بچا رہے گا ——— اگلا دن اس نے چارپائی پر پڑے پڑے گزار دیا۔ بغیر کسی کام کے۔ آخر کو وقت کاٹنے کے لیے اس نے ایک راستہ اور نکالا۔ وہ تار بابو کے بڑے لڑکے سے ملا۔ اور ان سے ہندی کے کچھ رسالے اور ناولیں مانگ لایا لیکن کتاب کا ایک آدھ صفحہ پڑھنے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ پسینہ سے تربتر ہے۔ وہ جھنجھلا کر کتاب الگ ڈال دیتا۔

"بڑی گرمی ہے" وہ بھیگے ہوئے بدن سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہتا۔

"دفتر میں پنکھے کے نیچے بیٹھتے تھے، خس کی ہوا کھاتے تھے۔" اس کی بیوی مسکرا کر کہتی اور اُسے یکبارگی اپنے کانوں میں بڑے سے ہال کے پنکھوں کی لگاتار بھن بھن کی آواز سنائی دینے لگتی۔ ایک لمحہ کے لیے ٹائپ مشینوں کی کھٹ کھٹ، کاغذوں کی کھڑکھڑاہٹ، کلرکوں کی چہلیں، چپراسیوں کے متحرک جسم اس کی آنکھوں کے سامنے پورا دفتر گھوم جاتا۔

"بڑے بابو! آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔"

"بڑے بابو۔ کیا کاغذ ابھی دستخط ہو کر نہیں لوٹے؟"

"بڑے بابو، بڑے بابو۔ اس کے کانوں میں صدائیں گونجیں ——— پھر کینٹین کا ہنگامہ اسے یاد آیا۔ گرم گرم پکوڑیاں اور گلاسوں میں جلتی ہوئی چائے۔ چھولے کی پلیٹیں، برفی کی قتلیاں، کلرکوں کا شور و غل۔ اس نے ان خیالوں کو جھٹک کر کروٹ لی۔ اس نے سوچا اب اسے کچھ دن آرام کرنا ہے، اپنے گھر بار کو دیکھنا ہے۔ اس کی بیوی نے ایک بار اُسے یوں خالی خالی لیٹے دیکھا تو اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور بولی۔

"جب چھٹی ہی لی ہے تو ایک دو گھنٹہ ذرا بچوں کو ہی دیکھ لیا کرو۔ امتحان سر پر کھڑا ہے۔"

یہ بات خود اس کو بھی کھٹک رہی تھی۔ بڑے لڑکے کا ایک سال خراب بھی ہو چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ روزانہ چاروں بچوں کو لے کر بیٹھا کرے گا۔ شام کو چراغ جلتے ہی اس نے ہانک لگائی۔

"چلو سب اپنے بستے لے کر میرے پاس آؤ۔"

اس کے تین بڑے لڑکے کچھ دیر بعد اپنا سامان لے کر اس کے پاس آگئے، لیکن چوتھا جو چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا، نہیں آیا ——— وہ اس پر برس پڑا۔ لیکن وہ ماں کے کمرے میں ایک کونے میں دُبکا کھڑا رہا۔ آخر کو ماں نے آکر بتایا کہ اس کی ہندی کی کتاب کھو گئی ہے۔ اور وہ مارے ڈر کے کونے میں کھڑا رو رہا ہے یہ سن کر اس نے پھر سب ہی کے بستوں کی تلاشی لینا شروع کی اور کتابوں کاپیوں کی جانچ کرنے لگا۔ کتابیں نچی کھچی، کچھ صفحے موجود کچھ غائب، کاپیوں کے کوَر الگ، اور روشنائی کے دھبّوں سے آراستہ۔ شاید اس طویل عرصہ میں پہلی بار بچّوں کے بستے دیکھنے کا موقع

ملا تھا۔ اسے بے حد غصہ آیا۔ لیکن اس نے سن رکھا تھا کہ بچوں کو غصے سے نہیں، پیار سے سمجھانا چاہیے۔ اس نے ان سب کو کتابیں، کاپیاں رکھنے کے طریقے بتاتے اور پڑھائی شروع کر دی۔ پڑھائی کا پہلا دن تو کسی نہ کسی طرح سے گزر گیا۔ لیکن پھر پیار سے سمجھانے والی بات دھری رہ گئی۔ جب لاکھ پیار اور محبت سے بتانے پر بھی بچوں کی سمجھ میں بات نہ آئی اور اس کے سوالوں کے خاطر خواہ جواب وہ نہ پاتے اور وہ ہزار بار سی' اے' ٹی کیٹ، کیٹ معنی بلّی بتا کر بھی کیٹ معنی چوہا سنتا تو آپے سے باہر ہو جاتا۔ انھیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ ڈالتا اور پھر وہ کہرام مچتا کہ ماں سے نہ دیکھا جاتا۔ آخر کو ایک دن وہ کہہ اٹھی۔

"بس بس پڑھا چکے تم ——— زرا میں تو جان پیٹ ڈالتے ہو، تم کیا پڑھاؤ گے ان کے بھاگ میں ہوگا تو آپ ہی پڑھ لیں گے۔"

"ارے پڑھیں سالے یا نہ پڑھیں۔ میں اپنا خون نہیں جلاؤں گا ان کے پیچھے۔ دماغ میں تو گوبر بھرا ہے، پڑھیں گے کیا خاک۔ اور پھر اس روز سے یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا لیکن ابھی تو اس کے چھٹی کے دن شروع ہی ہوئے تھے۔ ابھی تو ڈیڑھ مہینے سے بھی زیادہ کا عرصہ خالی پڑا تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

دوسرے دن وہ ٹھیک ساڑھے نو بجے کھانا وانا کھا کر اپنے کمرے میں آیا اور جلدی جلدی کپڑے پہننے لگا۔ بیوی نے پوچھا تو بولا۔

"زرا دو ایک دوستوں سے مل آؤں۔ تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔" گھر سے نکل کر وہ ٹھیک دس بجے اپنے پرانے دوست ورما کے دفتر پہنچ گیا۔ ورما بھی ہیڈ کلرک تھا اور دونوں میں خوب پٹتی تھی ——— ورما نے اسے دیکھ کر چپراسی سے کرسی منگائی اور اپنے ہی پاس بٹھا لیا۔

اس نے کمرے کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کلرک اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے تھے۔ ایک کونے سے ٹائپ کی آواز آرہی تھی۔ اس کے کانوں میں ایک مانوس سی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ اس نے اوپر دیکھا، اس کے سر پر پنکھا چل رہا تھا۔ میزوں پر پیپر ویٹس کے نیچے دبے ہوئے کاغذات آہستہ آہستہ پھڑپھڑا رہے تھے۔ اس نے ایک گہری اطمینان کی سانس لی۔ ورما اپنی عینک کے نیچے سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"سنا ہے لمبی چھٹی لی ہے تم نے؟"

"ہاں یار کام کرتے کرتے تھک گیا۔ سوچا کچھ دنوں آرام کرلوں۔"
"بڑے بابو نمستے!" کسی کونے سے کوئی مخاطب ہوا۔
"نمستے، نمستے!" اس نے خوش ہو کر جواب دیا۔
کسی نے کہا "کہیے بڑے بابو، سب آنند ہے۔"
"ہاں بھیا، سب مہربانی ہے۔" اس نے کھلی ہوئی باچھوں سے جواب دیا۔
—— بڑے بابو، بڑے بابو —— کتنے دنوں بعد اسے اس نام سے مخاطب کیا گیا تھا اور اب اسے احساس ہوا جیسے اس مخاطبے نے کسی خلا کو پُر کر دیا۔ کوئی انجان کمی تھی جو پوری ہوگئی۔ وہ مسرت سے جھوم کر بولا۔
"لیجیے، آپ لوگ پان کھائیے۔" یہ کہہ کر اپنے پانوں کی ڈبیا اور بٹوا بڑھا دیا۔
بٹوے نے ساری میزوں پر گشت کرنا شروع کر دیا۔ بٹوے کو اسی طرح گھومتے دیکھ کر اسے ایک سکون سا محسوس ہوا۔ ایک اندرونی آسودگی۔
"اور سناؤ ورما۔ کام وام تو ٹھیک چل رہا ہے۔" وہ اپنے دوست سے مخاطب ہوا۔
"اماں ٹھیک ویک کیا۔ بس چل رہا ہے۔ کئی دنوں سے کچھ ریمائنڈر پڑے ہیں۔ ابھی تک جواب لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ آج کل بڑی سستی سوار ہے۔ یہ دیکھو، آتے ہی لے کر بیٹھ گیا۔"
"لاؤ، ایک آدھ میں ہی پار لگا دوں۔" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ورما نے انکار کیا لیکن وہ نہیں مانا۔ اس نے ورما سے کاغذ قلم لے لیا، مجبوراً ورما کو خط کا متن اسے سمجھانا پڑا۔ اس نے دس منٹ کے اندر خط ڈرافٹ کر دیا۔ کس وقت ایک بجا، اس کو احساس ہی نہ ہوا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب وہ سب لوگ پاس ہی کے ایک چائے خانے میں اسے لے کر چلے گئے۔ چائے خانے میں بیٹھا وہ ان لوگوں سے اپنی ملازمت کے تجربے بیان کرتا رہا۔ مختلف افسروں کے مزاج، عادتیں اور ان سے لڑے جانے والے مورچے بیان کرتا رہا۔ چائے خانے سے واپسی پر وہ پھر ورما کے ساتھ اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔
یہ سلسلہ یعنی گھر سے دس بجے نکل جانا اور شام پانچ بجے تک واپس آنا کئی دنوں تک جاری رہا۔ وہ اس بیچ اپنے کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا رہا۔ لیکن اس کی بیوی

یہ سب دیکھ دیکھ کر آخر کڑھنے لگی۔ ایک دن اس نے پوچھا۔
"تم سارا سارا دن غائب رہتے ہو ـــــ جانے کہاں چلے جاتے ہو ایسی چھٹی سے کیا فائدہ "
"پھر گھر پر پڑے پڑے کیا کروں" وہ تیوریوں بل ڈال کر بولا۔
"تو چھٹی لیے کیوں پڑے ہو اپنے دفتر جاؤ نا"
"ـــــ اپنے دفتر جاؤ نا ـــــ" جیسے ایک زوردار ہوا کا چپیڑ اس کے آکے لگا ـــ اپنے دفتر ـــــ وہ سپٹا گیا۔ اس کی بیوی نے تو ایک بات کہی تھی۔ معمولی سی۔ لیکن اس نے کئی بار اس کے جملے پر غور کیا۔ اپنے دفتر ـــ اپنے دفتر ـــ تو اس کی بیوی کو معلوم ہے کہ وہ دن بھر دوسروں کے دفتر میں بیٹھا رہتا ہے۔
رات کو جب وہ لیٹا، تو بہت دیر تک چھت کو تکتا رہا۔ اسے بڑا عجیب سا لگا۔ وقت! اس میں کتنی قوت ہے۔ پریشان کرنے کی، تھکا دینے کی، الجھا دینے کی۔ پورا وقت اس کا اپنا ہے، اسے پوری آزادی ہے۔ جو جی چاہے کرے، جہاں چاہے جائے، جس کو چاہے اپنائے۔ برسوں سے ایک ہی ڈگر پر چل رہا ہے۔ وہی سڑک، وہی راستے، وہی دفتر کا کمرہ، وہی جانے پہچانے چہرے۔ وہ ان سب سے اکتا چکا تھا، ان سے بھاگنا چاہتا تھا، اس کا جی آرام کرنے کو چاہتا تھا، اور جب وہ چھٹی لے کر گھر بیٹھا تو وقت ـــــ یہ فرصت ـــــ یہ آزادی کتنی جلدی وہ ایک تھکن، ایک بیزاری محسوس کر رہا ہے ـــــ اس نے اپنے سے سوال کیا۔
"میں ورما کے دفتر کیوں جاتا ہوں۔ میں کسی اور مشغلے کو کیوں نہیں اپناتا" اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک میٹھا میٹھا سا درد اسے اپنے اندر محسوس ہوا ایک ایسی کوفت جو انسان کو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب اس کا ذہن صاف نہ ہو۔ جب وہ کسی بات کی حقیقت کو سمجھنا چاہے اور سمجھ نہ پائے۔
دوسرے دن اس نے کھانا کھایا، کپڑے پہنے اور اپنے دفتر پہنچ گیا۔ سیدھا اپنی کرسی پر جا کر بیٹھا اور دراز سے کاغذ نکال کر اس نے چھٹی منسوخ کرنے کی درخواست اور (Joining Report) لکھ کر صاحب کے کمرے میں بھیج دی۔
اس کی ناک میں خس کی ٹٹیوں کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ کانوں میں

شرابِ کہنہ

# داغ

[۱۸۳۱ء ——————— ۱۹۰۵ء]

نواب مرزا خاں نام، داغ تخلص۔ نواب شمس الدین خاں والیِ فیروز پور جھرکہ کے فرزند۔ محلہ بلّی ماران (دہلی) میں پیدا ہوئے، چھے سات سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ان کی ماں، اپنا دوسرا نکاح مرزا فخرو (شاہ زادہ مرزا سلطان ابن بہادر شاہ ظفر) سے کر کے لال قلعہ منتقل ہو گئیں اور شوکت محل خطاب پایا۔ داغ کو سلطنتِ مغلیہ کی بیگمات کی گودوں میں کھیلنے اور شاہ زادوں کی صحبت میں رہ کر پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ غیاث اللغات کے مولف مولوی غیاث الدین سے فارسی پڑھی اور مولوی احمد حسین سے عربی۔ خوش نویسی، شہ سواری اور بانک پٹے وغیرہ کا فن وقت کے بہترین استادوں سے سیکھا۔ پیدائشی طور پر شاعر تھے، حالات اور ماحول بھی سازگار نصیب ہوا، باپ دادا بلکہ پورا لال قلعہ استاد ذوق کا شاگرد تھا انھوں نے ان کے آگے زانوئے تلمذتہ کیا بیس برس کی عمر میں اپنی صلاحیتوں اور مشاقی کی بنا پر شاہی مشاعروں میں شرکت کا فخر حاصل ہونے لگا جب کہ وہاں اچھے اچھے کہنہ مشقوں کی رسائی آسان نہ تھی۔ مرزا غالب جیسے سخن ور اور بادشاہ ظفر جیسے جوہر شناس سے داد تحسین حاصل کی۔ خوش گوئی کے ساتھ ساتھ خواندگی کا انداز بھی بڑا دل کش تھا چنانچہ استاد ذوق کی غزل بھی مشاعروں میں پڑھنے کے لیے انھیں کو ملتی تھیں۔

ناگاہ ۱۸۵۷ء آگیا، دلّی کے بہت سے باکمالوں کی طرح ان کو بھی یہاں سے بادل ناخواستہ نکلنا پڑا۔ مگر جلد ہی رام پور، ان کے لیے بہت سی حیثیتوں سے "آرام پور" اور "دارالسرور" ثابت ہونے لگا۔ نواب کلب علی خاں کے عہد اور ان کی ملازمت میں عمر کے چوبیس سال بسر کیے۔ فراغت، شہرت اور مقبولیت ہر چیز ان کو میسر تھی، نواب کی وفات

کے بعد ۱۸۸۹ء میں حیدر آباد دکن پہنچے۔ میر محبوب علی خاں فرمانروائے ملک دکن نے ان کو اپنا استاد بنایا۔ سپہ سالار، یار وفادار، مقرب السلطان، بلبل ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ اور فصیح الملک یہ تمام خطابات ان کو نظام دکن کی سرکار سے عطا ہوئے۔ گراں قدر مشاہرہ، عزت و توقیر اس کے علاوہ اپنے دور کے تنہا داغ ایک ایسے شاعر ہیں جن کی تمام عمر عشرت اور فارغ البالی میں بسر ہوئی۔

داغ بڑے وسیع المشرب، اعزا پرور، احباب نواز، خوش باش اور رنگین طبع لوگوں میں سے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی بڑی وسیع اور کثیر ہے، اصلاح اور مشورے کا کام تمام عمر بڑی مستعدی اور باضابطگی سے انجام دیتے رہے۔ نوح ناروی، بے خود، سائل، رسا، نسیم بھرت پوری، احسن مارہروی، علامہ اقبال، زار دہلوی، جوش ملسیانی جیسے استاد اور اکابران کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہیں۔

زبان میں فصاحت و سادگی اور بیان میں شوخی اور بانکپن داغ کی نمایاں خصوصیتوں میں سے ہیں۔ جرأت کی معاملہ بندی اور آتش کی صفائی زبان دونوں کا بہترین امتزاج داغ کے کلام میں موجود ہے ــــــ محاوروں کو خوش اسلوبی سے نظم کر کے زبان کو ٹکسالی بنا دینا بھی داغ کا ایک امتیازی ہنر تھا۔ وہ صرف غزل کے شاعر تھے اور ایک کامیاب شاعر، اس گئے گزرے زمانہ میں بھی اُن کے سیکڑوں شعر لوگوں کی زبان پر ہیں۔

"گل زارِ داغ۔ آفتابِ داغ۔ مہتابِ داغ" ان کی زندگی میں اور چوتھا دیوان "یادگارِ داغ" ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ ایک مثنوی "فریادِ داغ" اس کے علاوہ ہے۔ چوہتّر سال کی عمر میں حیدر آباد میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

## انتخاب

لگ گئی چُپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں ایسی ۔۔۔ مجھ کو کچھ حال تو کم بخت سُنا تو اپنا
ہو کے ظاہر تو کیا عشق نے اک حشر بپا ۔۔۔ حسرت اس دل پہ کہ جس دل میں یہ پنہاں ہو گا

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے اتنا رشک
کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا

ڈوب کر سینے میں اس رنگ سے پیکاں نکلا
دل سے بے ساختہ نکلا کہ وہ ارماں نکلا

عرضِ وفا پہ دیکھنا اس کی ادائے دل فریب
دل میں کچھ اعتبار سا آنکھوں میں کچھ ملال سا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

وعدے پہ مرے ان کے قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج

کل تاب فغاں کی تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی
کیا کیا لبِ خاموش پہ قرباں ہے اثر آج

بزمِ اغیار کا ظاہر ہے اثر آنکھوں پر
مہرباں آنکھ کی خفت میرے سر آنکھوں پر

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہاں کی سیر
دل خوش نہ ہو تو کس کا تماشا کہاں کی سیر

دل میں سما رہی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

رہ روِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

مے خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت ادھر کہاں

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں
کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بے تاب نہیں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے وہ چھپ کے جائیں گے ایسے کہاں کے ہیں

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

اُڑ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ

گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

ہر دل میں نئی طرح سے ہے یاد کسی کی
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

ایک تو حسنِ بلا اس پہ بناوٹ آفت
گھر بگاڑیں گے ہزاروں کا سنورنے والے

خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر اے صیاد
ہم سے اچھے رہے صدقے میں اترنے والے

■■

# نئی مطبوعات

نقد اقبال (تنقید) میکش اکبرآبادی ۴/۵۰ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

تنقید کیا ہے ( " ) آل احمد سرور ۳/۷۵ " " " " " "

نیرنگ معانی (شعری مجموعہ) تلوک چند محروم ۵/- ملنے کا پتہ " " " "

سید العرب (سیرت) عمر ابو النصر ترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی ۳/- ناشر: میر اینڈ کمپنی، دہلی

سرمدی نغمے یا گیت گووند (نظم) منور لکھنوی ۳/- " آدرش کتاب گھر، دہلی

روبینہ (ناول) نادرہ خاتون ۴/- " چچا بک ڈپو، دہلی

مغرب اور اسلام طالب صفوی ۲/- " محمد عباس طالب صفوی شمس آباد

تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ یونس نگرامی ندوی ۵۰/- " مکتبہ طیبہ، لکھنؤ

جذبات و احساسات حیدر لکھنوی ۳/- جامی پبلشنگ ہاؤس بمبئی

روح اسلام اقبال کی نظر میں ڈاکٹر غلام عمر خاں انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز حیدرآباد

ترانہ نعت (مجموعہ نعت) عمر انصاری -/۶۰ مکتبہ دین و ادب، لکھنؤ

صدائے عارف (نظمیں) ابو الوفا عارف -/۶۰ " " "

نور کی برکھا ( " ) بیکل اتساہی -/۶۰ " " "

چند ادبی مسائل (ادب) پروفیسر شاہ مقبول احمد مکتبہ صنم، پٹنہ

پاکستانی کلچر (تہذیب و تمدن) جمیل جالبی ۸/-

تنقیدی نقوش (تنقید) ڈاکٹر عبد القیوم ۳/۷۵

الٹ پھیر (طنز و مزاح) شوکت تھانوی ۳/-

تحقیق و تنقید (تنقید) فرمان فتح پوری ۴/-

(مشتاق بک ڈپو، شلڈن روڈ، کراچی ۱)

## زیر طبع کتابیں

آتش تر خمار بارہ بنکوی نیشنل بک ڈپو حیدرآباد

دسواں پل کرشن چندر ۴/- ایشیا پبلشرز، دہلی

(باقی ص۹ پر)

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## دلّی کالج میگزین (ایوننگ کلاسز) میر نمبر ۱۹۶۲ء

مرتبہ: نثار احمد فاروقی

صفحات: ۴۶۴ سائز $\frac{20 \times 26}{16}$

قیمت: بارہ روپے مجلد

سول ایجنٹ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار دہلی

میر تقی میر کی حیثیت اور عظمت اسی کی متقضی ہے کہ ان پر برابر لکھا جائے اور مختلف حیثیتوں اور نوعیتوں کے ساتھ لکھا جائے۔ ان کی سیرت و شخصیت کے اب بھی بہت سے ایسے رُخ اور پہلو ہیں جو مختلف فیہ اور بحث طلب ہیں لہذا تحقیق و تصدیق کا کام بھی باقی و جاری رکھا جا سکتا ہے۔

دلی کالج میگزین کا یہ مخصوص نمبر بڑے سلیقے اور حسن اہتمام سے شائع کیا گیا ہے پورا رسالہ چار ابواب پر مشتمل ہے جس میں "حیات میر" "میر کا فن" ان کی تصانیف اور "خراج عقیدت" کے عنوان سے میر کے بارے میں قریب قریب تمام ضروری جزوی اور تفصیلی نکات اور معلومات موجود ہیں۔ رسالے کے سب مضمون مخصوص اور نئے نہیں ہیں۔ پھر بھی حوالے در مطالعے کی خاطر ان کے یک جا ہو جانے سے فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے۔

"ذکر میر" کے بعض مقامات پر قاضی عبدالودود کی ناقدانہ نظر اور محققانہ گرفت و تصحیح حیات میر پر کلب علی خاں فائق کی ڈالی ہوئی روشنی خاص کر اس مسئلے پر کہ میر سید تھے یا شیخ؛ متعلقین، ورثا، تلامذہ اور مدفن کے ضمن میں ڈاکٹر منوہر سہائے انور نثار احمد فاروقی مختار الدین احمد اور نادم سیتاپوری وغیرہ نے جو کچھ قلم بند کر دیا ہے اس سے زیادہ قابل غور یا قابل اعتبار باتیں کسی ایک جگہ آسانی سے پڑھنے کے لیے شاید ہی مل سکیں۔

دوسرا باب جہاں سے "میر کا فن" شروع ہوتا ہے اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس

موضوع پر اظہار خیال کرنے والوں میں پروفیسر سرور، حامد اللہ افسر، ابو محمد سحر، نواب جعفر علی خاں اثر، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر عابدی، ڈاکٹر ابواللیث اور مرحوم وحید الدین سلیم جیسے نقاد، مبصر اور سخن سنج شامل ہیں۔ اسی طرح تصانیف میر کے تحت جن اہل الرائے حضرات کے مضامین فراہم کیے گئے ہیں ان میں قاضی عبدالودود اور نثار احمد فاروقی کے علاوہ مولد عرشی نصیر الدین ہاشمی اور مبارز الدین رفعت کے ناموں کی بڑی اہمیت ہے۔

چوتھا اور آخری باب جو "خراج عقیدت" کے عنوان سے موسوم ہے ان میں چند نظموں کے علاوہ باقی حصہ بس عقیدت ہی پر منحصر ہے۔ بہرکیف رسالے کے مرتب مع اپنی مجلس ادارت اس بات کے یقیناً مستحق ہیں کہ ان کو مبارک باد دی جائے کہ انھوں نے دلی کالج اور میر تقی میر دونوں کے شایان شان ایک علمی اور ادبی کام انجام دیا ہے۔

رسالے کی قیمت مقرر کرتے وقت تعجب ہے کہ طلبا اور عام اردو داں طبقے کی مالی حالت اور وسائل کا لحاظ نظر انداز کر دیا گیا۔

رشید نعمانی



## خدائے سخن میر تقی میر

(سن اشاعت اکتوبر ۱۹۶۲ء)

مرتبہ: ادریس صدیقی
سائز: ۳۰ × ۲۰ / ۱۶
قیمت: پانچ روپے ۶۲ پیسے
ناشر: مکتبہ عزم وعمل، کراچی

ناسخ نے کہا تھا کہ "آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں"۔ غالب نے اس مصرعے کو خوب اٹھایا۔ ذوق و مصحفی نے ان کی استادی کا اعتراف کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک شاید ہی کوئی ممتاز شاعر ایسا گزرا ہو جس کو ان کے "شیوۂ گفتار" کی یاد نہ آئی ہو۔ تنقید و تذکرے کے میدان میں بھی خواہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا "گلشن بے خار" ہو یا مولانا حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری"۔ دورِ حاضر کے کسی نقاد کا تبصرہ ہو یا کسی موقر رسالے کا خصوصی میر نمبر، سب ہی اپنے اپنے انداز اور اندازے کے مطابق میر کے حضور میں خراج عقیدت پیش کرتے رہے ہیں۔ میر جیسا شاعر ہر عہد کا محبوب شاعر ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر دور میں میر، میر ہی رہے۔ انھیں "آبروئے غزل" کہیے یا "خدائے سخن"

...یب دیتا ہے، جس قدر اچھا کہے!

'غذائے سخن' میں میر کی زندگی اور شاعری سے متعلق تقریباً ڈیڑھ سو صفحات
...امل ہیں اور دو سو صفحات کے قریب 'انتخاب کلیات' پیش کیا گیا ہے۔ 'ذکر میر'
...ے عنوان سے ادریس صدیقی نے اپنے ابتدائیہ کے اختتام پر لکھا ہے کہ "شاعر کے
...ن کو سمجھنے کے لیے اس کی شخصیت اور خارجی ماحول دونوں کا مطالعہ ضروری ہے۔"
...نظریہ بذاتِ خود ہی ایک اچھے تذکرے اور تبصرے کی ضمانت کر دیتا ہے۔ اگلے
...ب سے "میر کا عہد" شروع ہوتا ہے۔ یہ وہی عہد ہے جس نے میر سے کہلوایا تھا کہ "پھرتے
...ں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں"۔ اور انھیں دستار سنبھالنا دشوار ہو گیا تھا۔ پھر "میر کی
...ندگی" بیان کی گئی ہے اور اس کے بعد "میر کا نظریہ شاعری"۔ "میر کی غزل اور ان
...فن"۔ "میر اور مرزا"۔ "میر و غالب"۔ "میر و فانی" اور "میر کی مقبولیت" دیگر ابواب
...ں۔

میر کے سفر لکھنؤ کا ذکر "آبِ حیات" کے حوالے سے کرتے ہوئے ادریس صدیقی
...ے لکھا ہے کہ "اول تو اس بیان کی تردید کرنا مشکل ہے اور پھر تردید کی ضرورت بھی
...یا ہے"۔ اس سلسلے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ایک مختصر مضمون "میر کا سفر لکھنؤ"
...ی ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے۔ بابائے اُردو نے خواجہ امیر احراری کی کتاب "معدن الجواہر"
...ے حوالے سے اس مخصوص واقعہ پر روشنی ڈالی ہے۔

انتخاب کلام کے بارے میں ادریس صدیقی کا کہنا ہے کہ "موجودہ انتخاب میں یہ
...یال رکھا گیا ہے کہ کلیات سے ایسے اشعار نکالے جائیں جو میر کی زندگی، شخصیت اور
...اعری کی نمائندگی کرتے ہوں اور ان کے مزاج اور ماحول کو سمجھنے کے لیے اشارے
...کام دیں۔ یوں تو انتخاب اشعار میں پسند اپنی اپنی نگاہ اپنی اپنی والی بات ہوا
...تی ہے تاہم فاضل مرتب کا یہ احساس ان کے ذوقِ سلیم کی دلالت کرتا ہے۔
...ید ہے کہ یہ انتخاب دوسروں کو بھی پسند آئے گا۔

یہ کتاب میر کے نو آموز طالب علموں کے لیے بہت کچھ سامانِ لطف و نظر رکھتی
...ہے اور رمز شناسانِ میر کے لیے بھی کافی کارآمد مواد یک جا فراہم کرتی ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

# اردو تعلیم کے لسانی پہلو

مصنف: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ریڈر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی
صفحات: ۸۰ سائز: ۲۰ × ۳۰ / ۱۶
قیمت: ایک روپیہ ۹۰ پیسے
ناشر: آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی

صوتیات Phonetic پر اُردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی نوعیت بہت حد تک مذہبی سی ہے۔ علمی۔ ادبی اور لسانی حیثیت سے ڈاکٹر گیان چند، رشید حسن خاں سرسوتی سرن کیف اور شان الحق حقی وغیرہ کے کچھ مضامین کے علاوہ مستقل تصانیف و تراجم میں ڈاکٹر محی الدین زور قادری مرحوم، مسعود حسن خاں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اور چودھری محمد نعیم کی چند کتابیں ہیں ـــــ اور اب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے اُردو کے مشہور ادیب اور ممتاز محقق ڈاکٹر نارنگ نے ایک پر عزم اضافے کی کوشش کی ہے جس کا ترجمہ روسی زبان میں بھی کیا جا رہا ہے۔ "صوتیات" پر ڈاکٹر نارنگ کے کچھ مضامین اردو رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر ان کا مطالعہ انگریزی اور ہندی تک محدود ہونے کے باوجود یقیناً سطحی نہیں ہے اور انھوں نے عربی "تجوید و ترتیل" کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس موضوع کی عوامی افادیت مسلمہ طور پر تنگ و محدود ہے زیادہ سے زیادہ اُسے "فوجی اور سفارتی" مقاصد کے اسکول اور کالجوں کے لیے مفید کہا جا سکتا ہے پھر بھی اس کی علمی اور لسانی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا؟ اور اسی اعتبار سے ڈاکٹر نارنگ کی یہ خاص لسانی و علمی کدوکاوش یقیناً خوش گوار ہے ـــــ اگرچہ یہ بات پھر بھی باقی رہ جاتی ہے کہ اس عظیم جدوجہد سے اردو جیسی "سیاست زدہ" اور "نیم مُردہ" زبان اپنے تاریک مستقبل کو کس حد تک وابستہ رکھ سکتی ہے۔؟

اردو کے "صوتیاتی نظام" کی اصول کاری کے لیے (بلا متوازن تجزیے کے) یہ فرض کر لینا کہ ـــــ!

"قدیم صوتیات سے جدید لسانیات تک اتنا بڑا فاصلہ ہے کہ مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دنیا ہی دوسری ہے"۔

ایک ایسا بے دلیل دعویٰ ہے جس سے ایک بہت ہی شاندار ماضی کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ عاصم کوفی (۱۲۷ھ) ابن عمار (۱۵۴ھ) ابن عقیل حنبلی (۴۳۰ھ) ابن حمید اندلسی (۵۱۳ھ) جلال الدین سیوطی اور حریری ایشیائی لسانیات وصوتیات کے وہی ماہرین ہیں جن کی کشید کردہ "شراب کہنہ" آج نئی بوتلوں میں مغرب سے برآمد کی جارہی ہے۔ جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ عہد جدید کا "انسان" اپنے صوتی اعضا کے اعتبار سے ارتقار کی منازل طے کر چکا ہے اور اس کے "مخارج الصوت" "عہد عتیق" کے انسان سے مختلف ہو کر کچھ نئی آوازیں پیدا کر چکے ہیں۔ یہ تسلیم کرنا بہت ہی دشوار ہے کہ فطرت انسانی اتنی بدل گئی ہے جس پر "دوسری دنیا" کا اطلاق ممکن ہے۔

عربی زبان نے "تجوید۔ ترتیل اور قرأت" کے جن بنیادی اصولوں کی نشاندہی کی ہے ایشیائی زبانیں ان سے روشنی حاصل کرنے کی وراثتاً مستحق ہیں اور اگر چھان بین کی جائے تو خود اردو زبان میں بھی نصف صدی ادھر چھپی ہوئی ایسی کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں جن میں صوتیات کے بنیادی اصول تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اسی قسم کے نظر آئیں گے جیسے کہ "جامعہ ازہر" کے Phonetics Department میں وضع کیے جارہے ہیں اور ماہرین صوتیات کے نزدیک یہ ریسرچ ایک کامیاب تحقیق کا درجہ رکھتی ہے ——!

اردو کی "صوتی نظام" کے بنیادی اصولوں کی تشکیل کے لیے علاقائی زبانوں کے صوتی اتار چڑھاؤ کا مطالعہ بھی ضروری ہے کیوں کہ ہندستان کے مختلف علاقوں میں ایک ہی لفظ مختلف آوازوں کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ حیدرآباد دکن کے عوام اپنی روزمرہ زندگی میں "ق" کو "خ" کے مخارج سے ادا کرتے ہیں۔ بھوپال اور اس کے مضافات میں "مے ہے۔ تے" کو زبر کے بجائے "زیر" کے ساتھ بولتے ہیں۔ یو۔پی کے کئی اضلاع میں بعض الفاظ "مختلف الصوت" شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ بجنور میں بہت سے الفاظ مشدد ہو جاتے ہیں مثلاً روٹی۔ جوتی۔ چوٹی وغیرہ —— اسی طرح ضلع ہردوئی کے عوام میں "ر" کا استعمال عام طور پر نہیں ہوتا۔ ہردوئی "ہدوئی" اور "مرد" کو "مد" بولا جاتا ہے (تشدید کے ساتھ)

کہا جا سکتا ہے کہ بول چال کی زبان کے یہ علاقائی اختلافات کسی زبان کے بنیادی

اصولوں پر اس حیثیت سے اثر انداز نہیں ہوسکتے کہ ان میں کوئی اہم تبدیلی کردی جائے؟ لیکن اس کا صحیح فیصلہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب واضح الفاظ میں اس کی تشریح کردی جائے کہ یہ "صوتیاتی نظام" "عام بول چال کی زبان سے تعلق رکھتا ہے یا معیاری حیثیت سے!

نادم سیتاپوری



## ادب اور نفسیات

(سن اشاعت اپریل ۱۹۶۳ء)

مصنف: دیویندر اسّر
صفحات: ۱۷۰ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
ناشر: مکتبہ شاہراہ دہلی ۶
قیمت: تین روپے پچاس پیسے

دیویندر اسّر نے اس کتاب کو منظر عام پر لاکر وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اردو ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے نفسیاتی نظریات سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ ابھی تک قارئین کو مختلف مضامین کی شکل میں جنسیات اور نفسیات کے مسائل پر مطالعہ کا موقع ملتا تھا۔ لیکن مذکورہ تصنیف کے ذریعہ ہم، ممتاز ماہرین نفسیات کے نظریات، یورپ کی ادبی تحریکوں اور اردو ادب پر ان کے اثرات سے واقف ہوجاتے ہیں۔

چند موضوعات سے کتاب کی اہمیت واضح ہوگی:۔

فرائڈ اور ادب ـــــ ژونگ اور ادب ـــــ شعور کا بہاؤ ـــــ مطالعہ اور نفسیات ـــــ لاشعور اور تخلیق فن وغیرہ

یہ کتاب نہایت مفید ہے۔ تسلسل اس کی بڑی خوبی ہے۔ لیکن انگریزی الفاظ کا شدّت سے استعمال محض اردو جاننے والوں کے لیے دشواری پیدا کرے گا۔ مخصوص اصطلاحات کے لیے تو یقیناً مجبوری ہے مگر فرسٹریٹ، فینٹسی، کنٹرول وغیرہ الفاظ کی اردو لکھنی چاہیے تھی۔ بعض جگہ مصنف کی عبارت پر ترجمے کا دھوکا ہوتا ہے۔

آخر میں "اردو افسانہ، ایک مطالعہ" ـــــ "اردو شاعری ایک مطالعہ" مختصر ہونے کے باوجود نہایت اہم باب ہیں۔ ان میں ہم اپنے افسانہ نگاروں اور شاعروں کو نفسیاتی تنقید کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ تنقیدی شعور رکھنے والے قارئین

کے لیے یہ تصنیف اپنے اندر خصوصی اپیل رکھتی ہے۔

کتاب کا سرورق بہت معقول ہے۔ لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے۔ ہمارے نزدیک "ادب اور نفسیات" ایک قابل قدر تصنیف ہے اور مبارک باد کی مستحق بھی ——

سیفی پریمی



# سازِ دل

مصنف : ذکی کاکوروی
صفحات : ۹۶ سائز : $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$
قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے
ناشر :

'سازِ دل' ذکی کاکوروی کے مئی ۱۹۶۱ء سے جون ۱۹۶۳ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ اس مختصر مجموعے میں غزلوں کے علاوہ دس نظمیں بھی شامل ہیں۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے پیش لفظ میں فرمایا ہے۔

"ان کی غزل گوئی درحقیقت اس جوان اضطراب کا نتیجہ ہے جو جذبات محبت کے ہیجان سے پیدا ہوتا ہے اور جس کے اثر سے جوانی گنگنانے لگتی ہے۔ شاعر گنگنا کر شعر موزوں کر لیتا ہے اور غیر شاعر دل دوسروں کے اشعار گنگناتا ہے۔"

ذکی کی غزلیہ شاعری کے متعلق میری نظر میں یہ رائے بڑی وقیع ہے۔ ان کی غزلوں میں جو نغمگی، ترنم اور گنگناہٹ ہے، اس کے پس پردہ جوانی دیوانی کی کارفرمائیاں اپنی تمام تر ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ ملتی ہیں۔ ان کے سینہ میں اٹھنے والا ہر تلاطم دل کے بحر بے کنار ہونٹوں تک آ کر صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتا ہے، یہ طوفان اپنی موجوں کے ساتھ موتی بھی لاتا ہے اور سیپ بھی، یہ ضرور ہے کہ موتیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ذکی کی شاعری کلیتہً دل کی شاعری ہے لیکن اگر وہ موقع بہ موقع "پاسبان عقل" کو بھی شریک کار کر لیا کریں تو نہ صرف ان کی لَے عصر حاضر کے نغمات سے ہم آہنگ ہو جائے بلکہ ان کے یہاں کہیں کہیں جو سطحیت نظر آتی ہے، وہ بھی پیدا نہ ہونے پائے۔

یہ بات نہایت خلوص کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ذکی کی نظمیں مجموعے میں شامل

نہ ہوتیں تو بہتر تھا۔ ان کے شاعرانہ مزاج کو نظم گوئی سے کوئی فطری مناسبت نہیں معلوم ہوتی انھوں نے نظموں کو جن جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے، وہ غزلوں کے پیرائے میں زیادہ بہتر اور خوش گوار انداز سے بیان ہو سکتے تھے۔

ذکی ثابت قدمی نیز سلامت روی کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہے تو مستقبل کے ایک اچھے غزل گو ہو سکتے ہیں۔

سید حرمت الاکرام



## عرفان حافظ

مولف و مترجم: پنڈت شیا چرنداس صاحب
صفحات: ۸۰ سائز: ۲۷ × ۱۷ / ۱۶
قیمت: ایک روپیہ
ناشر: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی ۶

یہ کتاب اگرچہ بہت مختصر سی ہے مگر اس میں حافظ شیرازیؒ کے اشعار کو مختلف عنوانات کے تحت تشریح اور ترجمے کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ معمولی اردو جاننے والا بھی حافظ شیرازیؒ کے کلام کی معنویت سے واقف اور تصوف کی بہت سی باتوں سے روشناس ہو جاتا ہے، مثلاً عشق حقیقی کی ضرورت، بے سامانی میں سامانی، صدق و صفائی نیت، رہبر (مرشد) کی ضرورت، لطف دایم، کارساز پر اعتماد، اور خوش و خرّم رہنے کی تعلیم، اس قسم کے عنوانات قائم کر کے مولف نے بقول خواجہ حسن نظامی "اُسے قابل قدر بنا دیا ہے،" مگر جا بجا تشنگی محسوس ہوتی ہے کاش پنڈت جی اس میں کچھ اور اضافہ کر کے شائقین کی تشنگی کو دور کرنے کا سامان فراہم کر سکیں، بہر کیف اس اختصار میں بھی ایک اعجاز ہے اور اس پر فاضل مولف قابل مبارک باد ہیں۔ بلاشبہ سالکان راہِ عشق حقیقی کے لیے یہ ایک قابل قدر توشہ ہے۔

ظل عباس عبّاسی

# ادبی خبریں

**اُردو کانفرنس** انجمن ترقی اُردو (ہند) کی کل ہند کانفرنس اس سال جے پور میں ۲-۳-۴ر اکتوبر کو ہورہی ہے۔ اس موقع پر پنڈت رتن نرائن کول صاحب سکریٹری ریڈکراس سوسائٹی راجستھان کی صدارت میں اُردو تحریک کا جائزہ لیا جائے گا اور آئندہ کے لیے پروگرام مرتب کیے جائیں گے۔

**صدسالہ جشنِ ولادت** مرحوم ملک الشعرا منشی دوار کا پرشاد افق لکھنوی کے صد سالہ جشنِ ولادت کی تقریب امسال نومبر میں منعقد کی جارہی ہے۔ جشنِ ولادت کمیٹی (۲۹-۱۵۲۸۔ فیض گنج دریا گنج۔ دہلی) نے اور پروگراموں کے علاوہ یہ بھی طے پایا ہے کہ اس تقریب پر مرحوم کی زندگی اور ان کے فرمودات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی جائے۔ کمیٹی نے ان حضرات سے اشتراک کی بھی اپیل کی ہے۔ جن کے پاس حضرت افق سے متعلق تحریری یادداشتیں یا ان کا کلام یا ان کے دوسرے کارنامے موجود ہوں۔ یہ بھی طے ہوا ہے کہ بعض حالات میں ایسے حضرات کو مناسب معاوضہ بھی دیا جائے۔

**اُردو ڈرامے پر انعام** آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، حیدرآباد نے اردو کے بہترین ڈرامے پر -/۱۱۱۶ روپے کے ایک انعام کا اعلان کیا ہے۔ ڈراما اصلاحی یا تاریخی ہونا چاہیے اور اتنا طویل ہونا چاہیے کہ تقریباً دو گھنٹے تک اسٹیج کیا جاسکے۔ مقابلے میں ہر ہندوستانی شریک ہوسکتا ہے ڈرامے کی دو کاپیاں ۳۱ر مارچ ۶۵ء تک ساہتیہ اکیڈمی، تلک روڈ، حیدرآباد (آندھرا پردیش) کے پتے پر بھیجی جاسکتی ہیں۔

## کتاب نما


| سالانہ ایک روپیہ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی | فی پرچہ دس پیسے |
| --- | --- | --- |

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

مکتبہ جامعہ

بزنس منیجر
شمیم ربانی تاباں

مدیر اعزازی
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۵ | نومبر ۱۹۶۴ء | شمارہ نمبر ۱۱


## اشاریہ!

اکتوبر کا مہینہ اور خاص طور سے اس مہینے کے آخری دن جامعہ برادری میں بڑی چہل پہل کے دن ہوتے ہیں۔ اور اس سال تو جلسۂ تقسیم اسناد کی تیاری نے برادری کی مصروفیت اور چہل پہل میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ تقسیم اسناد کا یہ جلسہ، ۲۹ اکتوبر کو جامعہ کے یوم تاسیس کے موقع پر ہو رہا ہے اور اس میں امیر جامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (نائب صدر جمہوریہ ہند) کامیاب طلبہ کو اسناد عطا فرما رہے ہیں۔ اس کے بعد جیسا کہ پہلے لکھا تھا۔ ۳۰، ۳۱ اکتوبر اور یکم نومبر تین دن جامعہ میں تعلیمی میلہ ہوگا۔ تعلیمی میلے کا افتتاح دہلی کے میئر جناب بادا بچتر سنگھ صاحب فرمائیں گے۔

اس میلے میں جامعہ کے تقریباً تمام شعبے کسی نہ کسی شکل میں اپنے اپنے کاموں کی نمائش کرتے ہیں یا اس کے پروگراموں میں حصّہ لیتے ہیں۔ مکتبہ جامعہ کی طرف سے بھی میلے میں ایک شوروم اور بک اسٹال کے علاوہ ایک ادبی پروگرام "فن اور فنکار" کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اس سال یہ پروگرام "کاروانِ غزل" کے نام سے ہو رہا ہے جسے جناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ "کاروانِ غزل" میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، غزل کی تاریخ کا بتدریج جائزہ لیا جائے گا اور ولیؔ سے لے کر مجازؔ تک ۔۔ تمام اہم شعرا کے تذکروں کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا نمونہ بھی مختلف حضرات کی زبانی پیش کیا جائے گا۔ گزشتہ سال کی طرح ہم اس بار بھی "فن اور فنکار" کی پوری روداد کتاب نما کے جنوری ۶۵ء کے شمارے میں شائع کریں گے۔ جنوری کا یہ خاص شمارہ ہم پچھلی بار کی طرح صرف خریدار حضرات کی خدمت میں ہی بھیج سکیں گے۔

ہمیں خوشی ہے کہ مکتبہ جامعہ کی بمبئی برانچ کے لیے اب ایک آفس اور گودام کی جگہ بھی فراہم ہو گئی ہے اب تک ہماری یہ برانچ اپنی دکان واقع پرنسس بلڈنگ متصل جے۔ جے اسپتال میں ہی تمام مقامی اور باہر کے کام انجام دیتی رہی تھی لیکن اب کام کے اضافے کے ساتھ ساتھ یہ جگہ ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ ہمیں امید ہے کہ اب ہماری یہ برانچ زیادہ اچھی طرح اپنے فرائض انجام دے کر بہتر طریقے پر اپنے کرم فرماؤں کی خدمت کر سکے گی۔

آفس ۴۰ - II فلور ۱۵۹، پرنسس بلڈنگ میں واقع ہے

آل احمد سرور

# تنقید کیا ہے؟

مغرب کے اثر سے اردو میں کئی خوشگوار اضافے ہوئے۔ ان میں سب سے اہم فن تنقید ہے۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ مغرب کے اثر سے پہلے اردو ادب میں کوئی تنقیدی شعور نہیں رکھتا تھا یا شعر و ادب کے متعلق گفتگو، شاعروں پر تبصرہ اور زبان و بیان کے محاسن پر بحث نہیں ہوتی تھی۔ بڑے تخلیقی کارنامے بغیر ایک اچھے تنقیدی شعور کے وجود میں نہیں آسکتے۔ تخلیقی جوہر بغیر تنقیدی شعور کے گمراہ ہو جاتا ہے اور تنقیدی شعور بغیر تخلیقی استعداد کے بے جان رہتا ہے۔ اردو میں وجہی سے لے کر حسرت موہانی تک ہر اچھے شاعر کا ایک واضح اور کارآزمودہ تنقیدی شعور بھی ہے۔ پھر بیاضوں، تذکروں، تقریظوں دیباچوں اور مکاتیب کا سرمایہ شروع سے موجود ہے۔ مشاعروں اور ادبی صحبتوں میں شعر و شاعری اور فکر و فن پر تبصرے برابر ہوتے رہتے ہیں۔ میر، جرأت کی چوما چاٹی سے بے زار تھے۔ خان آرزو، سودا کے شعر کو "حدیث قدسی" کہتے تھے، آتش، دبیر کے مرثیوں کو لندھور بن سعدان کی داستان بتاتے تھے۔ شیفتہ، نظیر کے کلام کو سوقیانہ ٹھہراتے تھے اور اسلوب میں متانت کے اس قدر قائل تھے کہ کیسے ہی معنی ہوں متانت کے بغیر نامعقول سمجھتے تھے۔ غالب کے نزدیک شاعری معنی آفرینی تھی، قافیہ پیمائی نہیں۔ وہ شعر میں "چیزے دگر" کے بھی قائل تھے اور آتش کے یہاں ناسخ سے تیز تر نشتر پاتے تھے۔ یہ تنقیدی شعور بعض اچھی روایات کا حامل تھا۔ اس میں فن کی نزاکتوں کا احساس تھا اور اس کی خاطر ریاض کرنے کا التزام۔ یہ قدرے محدود اور روایتی تھا اور ضبط و نظم کا ضرورت سے زیادہ قائل۔ یہ نشیب و فراز کو ہموار کرنا چاہتا تھا اور موضوع کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنا جانتا تھا۔ یہ بات اشاروں میں کرتا تھا، وضاحت، صراحت تفصیل کا قائل نہ تھا۔ اس میں مدح ہوتی تھی یا قدح اس کا معیار اونچا کم تھا۔ فنی زیادہ

اس میں کلام نہیں کہ تنقید صحیح معنی میں حالی سے شروع ہوئی۔ حالی سے پہلے شاعر استادوں کو مانتے تھے۔ نقادوں کو نہیں۔ ان سے پہلے کسی میں اعلیٰ درجہ کی تنقیدی صلاحیت اگر ملتی ہے تو وہ شیفتہ ہیں جن کی پسند کے بغیر غالب بھی غزل کو غزل نہیں سمجھتے تھے۔ مگر وہ بھی ناز و اور جبر کردہ حسن کے قائل ہیں، حسن کو خود دریافت نہیں کر سکتے۔ حالی نے شاعری، ادب زندگی، اخلاق، سماج، غزل اور نظم کے متعلق اصولی سوال کیے۔ انھوں نے شاعری کا ایک معیار متعین کرنا چاہا تھا اور اس معیار سے ہمارے ادبی سرمائے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس معیار میں وہ مغرب سے بھی متاثر ہوئے۔ اگرچہ ان کا معیار خالص مغربی نہ تھا۔ اس میں انھوں نے فن کا بھی لحاظ رکھا، مگر فطرت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انھوں نے بعض روایات پر نکتہ چینی کی مگر مجموعی طور پر ادب کی روایات کو نظر انداز نہیں کیا حالی کا یہ طریقہ مفید ثابت ہوا۔ اور تنقید اور اس کے اصول پر گفتگو شروع ہو گئی۔ چنانچہ اردو میں اس قسم کے مضامین رسالے اور کتابیں بکثرت ہیں جن میں تنقید کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ یا بعض ادیبوں یا ادبی تحریکوں پر تنقید ہے یا کسی ادبی اصول کی تشریح و تفسیر ہے۔ مغرب میں تنقید نے کئی کروٹیں بدلی ہیں اور ان کا اثر بھی ہمارے یہاں محسوس ہو رہا ہے پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ تنقید کے مفہوم، منصب، اس کی ضرورت، اس کی بنیادی شرائط، اس کے میدان اور خصوصیات کے متعلق آج بھی بہت سی غلط فہمیاں عام ہیں۔ اس لیے یہ واضح کرنے کی اب بھی بڑی ضرورت ہے کہ تنقید کیا ہے اور ادب اور زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے؟

کولرج نے ایک جگہ ایک مرد اور ایک عورت کا ذکر کیا ہے جو کسی آبشار کا نظارہ کر رہے تھے مرد نے کہا "یہ کیسا جلال رکھتا ہے؟" عورت نے جواب دیا "ہاں بہت خوبصورت ہے" یہ نہ تھا کہ بے چاری عورت حسن کا احساس نہ رکھتی ہو، احساس تھا، ذوق نہ تھا، شعور تھا مگر تربیت یافتہ اور مہذب نہ تھا، اس لیے وہ حسن اور حسن میں فرق نہ کر سکتی تھی، اور دلبری اور قاہری کے فرق کو نہیں جانتی تھی۔ یا جانتی تھی تو بیان نہ کر سکتی تھی۔ یہ مرض عوام ہی میں نہیں خواص میں بھی ہے۔ کتنے ہی بزرگ "نظارے سے نہیں، ذوق نظر سے سروکار رکھتے ہیں، وہ چیزوں کا حسن نہیں دیکھتے۔ ان چیزوں میں ایک خاص خیال حسن کا دیکھتے ہیں۔ اب بھی کتنے ہی لوگ ترقی پسند ادب اور نئے ادب کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ کتنے

ہی حسن کو ایک خاص لباس میں دیکھتے ہیں اور لباس کو حسن سمجھتے ہیں۔ کتنے صرف روایات کے پجاری ہیں، کتنے صرف بغاوت کے علمبردار کچھ ایسے بھی ہیں جو فانی و جگر کی طرح غزل کو حقیقی شاعری سمجھتے ہیں اور نظم کو محض قافیہ پیمائی۔ کچھ کلیم الدین کی طرح غزل کو نیم وحشیانہ صنف شاعری کہتے ہیں۔ کچھ کرشن چندر کی طرح ہیں جو راشد کی شاعری میں فرار اور جنسی الجھنیں دیکھتے ہوئے بھی اس کی ترقی پسندی پر اصرار کرتے ہیں۔ کچھ انقلابی شاعری کے معنی بغاوت اور خون کی ہولی سے لیتے ہیں۔ کچھ اختر رائے پوری کی طرح اپنے جوش میں اکبر کے کلام کو طنزیہ تک بندی کہہ جاتے ہیں۔ کچھ ادب کو پروپیگنڈا۔ ظاہر پرستوں نے اقبال کی زبان میں اس کے "باطن" کو نہیں دیکھا اسے محض فن سمجھا۔ انھوں نے خون جگر کی رنگینی کو نظر انداز کیا، دوسروں نے ردّ عمل کے طور پر فن کے نکات کو نظر انداز کرنا چاہا اور اس طرح اپنی بات کا وزن کھو بیٹھے۔

اردو میں تنقیدیں اچھی اچھی لکھی گئیں مگر صحیح تنقید جس کا راستہ بال سے زیادہ باریک ہے اسی وجہ سے زیادہ ترقی نہ کرسکی۔ مختلف ٹولیوں نے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اس کی خاطر ریاض کم کیا۔ حالی کے بعد اردو میں کوئی ایسا نقاد نہیں ہے جو ٹی ایس ایلیٹ کے الفاظ میں آفاقی ذہن Universal Intelligence رکھتا ہو۔ آفاقی ذہن سے مراد بین الاقوامی نہیں ہے۔ کتنے ہی نقاد اپنے حقیقی منصب کو بھلا کر دنگل میں دادِ شجاعت دینے لگے۔ کتنے ہی فلسفے بگھارنے کے شوق میں رسوا ہوئے۔ کتنے ہی آمریت پر اتر آئے۔ کتنے اسکول ایک دور، ایک روایت کے ترجمان ہو کر رہ گئے۔ نظریئے اچھے اچھے پیش کیے گئے۔ مگر ایسے کم جو تین سو سال پہلے کی شاعری آج کی شاعری اور تین سو سال بعد کی شاعری، تینوں کے مطالعے میں ہمیں مدد دے سکیں، چاہے حرف آخر نہ ثابت ہوں۔ افسوس ہے کہ اردو میں کوئی ارسطو پیدا نہ ہوا۔ حالی کی مشرقیت اور ان کی شرافت بعض اوقات معاصرین پر اظہار رائے میں انھیں ضرورت سے زیادہ نرم بنا دیتی تھی۔ بقول برنارڈ شا کے ادیب کو پہلے ادب کا خیال کرنا چاہیے۔ بعض ہیں شرافت اور مروّت کا۔ مقدمے اور مقالات کے حالی میں یہی فرق ہے۔

اردو میں تنقید کی کمی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ تنقید کو عام طور پر دوسرے درجے کی چیز سمجھا گیا ہے۔ علی گڑھ میں میرے ایک کرم فرما ہیں۔ جو کوئی تنقیدی مضمون پڑھتے ہیں تو فرماتے ہیں۔ یہ بات کیا ہوئی؟ کچھ اشعار لکھے، کچھ ان کا خلاصہ بیان کیا، کچھ افتتاحی الفاظ

یا حواشی بڑھائے اور تنقید تیار ہو گئی۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی رسالوں میں ایسی تنقیدیں کثرت سے ملتی ہیں۔ مگر تنقید محض ان کا نام نہیں۔ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں طول طویل اقتباسات اس لیئے دیے تھے کہ مرثیوں کی خوبی کا اندازہ دو ایک بندوں سے نہیں ہو سکتا۔ اقبال کے بہت سے نقادوں نے اقبال کے اشعار زیادہ لکھے اپنے خیالات کم بیان کیے۔

انتخاب تنقید تو نہیں ہے مگر انتخاب سے تنقیدی شعور ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ انتخاب میں اپنی پسند سے زیادہ شاعر کی نمائندگی ضروری ہے۔ شاعر کی نمائندگی آسان کام بھی نہیں ہے۔ مگر جو لوگ اقتباسات کی کثرت سے بدگمان ہو جاتے ہیں انھیں یہ سوچنا چاہیے کہ تنقید ہوائی نہیں ہو سکتی، اقتباسات تنقید کو صحت سے قریب رکھتے ہیں۔ جو لوگ اقتباسات کو دیکھتے ہیں، اس تلاش و جستجو کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جو اقتباسات میں صرف ہوتی اور ہونی چاہیے وہ ادب کا کوئی اچھا تصور نہیں رکھتے اور ان کی ذہنی استعداد کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ اب بھی کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ تخلیقی ادب براہِ راست زندگی کے شعور کو ظاہر کرتا ہے اور تنقیدی ادب چونکہ اس تخلیق کی ترجمانی، تحلیل یا تجزیے کا فرض انجام دیتا ہے، اس لیے اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ ان کے نزدیک جس ادب سے کتابوں کی زیادہ اور تخلیق کی کم مہک آئے وہ چنداں اہم نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ چونکہ نقاد خود شاعر کم ہوتے ہیں اور اگر اچھے ہوتے ہیں تو اچھے شاعر نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کی رائے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ آخر یہ کبوترانِ بامِ حرم، مرغانِ رشتہ برپا کے متعلق کیا جان سکتے ہیں، اور کیا بتا سکتے ہیں ان دونوں تصورات پر غور کرنا ہمارا فرض ہے۔

اقبال کی شاعری پر یوسف حسین نے روحِ اقبال لکھی جس میں ان کے کلام کی ترجمانی کی کوشش کی۔ کسی نے روحِ اقبال پر تنقید لکھی۔ جس میں یوسف صاحب کے نظریے سے اختلاف کیا . . . . . نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعبیروں کی کثرت سے بعض اوقات خواب پریشان ہو جاتا ہے۔ ٹیگور پر بھی ایک دفعہ یہی واقعہ گزرا تھا۔ انھوں نے اپنے حلقے میں ایک نئی نظم سنائی۔ ایک صاحب نے کہا اس کا یہ مطلب ہے۔ دوسرے نے کہا یہ نہیں یہ ہے۔ اس پر دونوں میں بحث ہونے لگی اور ٹیگور بیچ میں سے غائب

ہو گئے۔ ہمارے قدیم نظامِ تعلیم میں شرحوں، حاشیوں اور تفسیر قبل کے سمجھنے کا جو دستور تھا اس کی وجہ سے جزوی چیزیں اصل سے زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی تھیں اور نظر محدود ہو جاتی تھی۔ ذاتی، شخصی اور داخلی تنقیدوں میں اس قسم کا امکان ضرور ہے۔ کبھی کبھار یہ بھی ہوتا ہے کہ نقاد کی غیر معمولی شخصیت اس کے شاندار اصول اور دلچسپ فقرے پڑھنے والے کو مرعوب کر دیتے ہیں۔ وہ نقاد عینک سے ہر چیز کو دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے اگر عام پڑھنے والوں کے لیے ایسے ذہنی رفیق بہتر ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ادبی مزاج کا شکار ہوں، مگر اچھی تنقید تخلیقی ادب کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ خود تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ پڑھنے والے کے ذہن پر مہر نہیں لگاتی۔ اس کے ذہن کی تربیت کرتی ہے۔ تخلیقی ادب پر کوئی تنقید، تخلیقی ادب سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ دونوں کے درمیان کوئی خلیج نہیں ہے۔ تخلیقی ادب میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ تنقید اس کو واضح کر دیتی ہے۔ تنقید خلاصہ یا تنقیص نہیں ہے مگر اس کا تخلیق کے بنیادی خیال تک پہنچنا ضروری ہے۔ یہ تخلیق پر عرفِ عام میں عملی جراحی بھی کرتی ہے۔ مگر یہ عمل شاعرانہ طور پر ہوتا ہے اور اسی فضا کے اندر رونما ہوتا ہے۔

تنقید کی طرف سے بدگمانی عام طور پر ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ادب کو بہت گہری نظر سے دیکھنے کے عادی نہیں ہیں، جو اس میں صرف تفریح یا اقبال کے الفاظ میں کوکنار کی لذت ڈھونڈتے ہیں۔ اگر وہ سطحی فرق کو نظر انداز نہ کر دیں اور غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ تخلیقی ادب کی زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے کہ وہ تنقیدوں سے مدد لے بعض اوقات بدگمانی اس وجہ سے بھی ہو جاتی ہے کہ تبصروں، دیباچوں، مقدموں اور تعارفوں میں عام طور پر جو تنقید ملتی ہے۔ اس میں تنقید کے علیحدہ علیحدہ رنگ ہیں۔ دراصل ان میں سے ہر ایک میدان الگ ہے۔ دیباچہ یا تعارف، کتاب یا صاحبِ کتاب کا تعارف کرتا ہے۔ اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ مقدمہ اس سے ذرا آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہ قدر و قیمت بھی متعین کرتا ہے اور قولِ فیصل بھی پیش کر دیتا ہے۔ تبصرہ یا ریویو بعض اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر عام طور پر مقدموں میں بالغ نظری سے زیادہ شرافت کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر یقیناً گمراہ کن ہوتے ہیں۔ محدود تنقید تو غیر محدود قسم کی ہوتی ہے نہ زیادہ مضر نہیں

ہوتی لیکن وہ تنقید جس میں دعویٰ جامعیت کا کیا جائے مگر ہو محدود اور مخصوص، گمراہ کن اور پرفریب ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ داخلی تنقید میں اس قسم کا فیصلہ ناگزیر ہے اور یہ فریب مشرق و مغرب میں بہت عام ہے۔ اس لیے میں داخلی تنقید کو ناقص کہتا ہوں وہ تحسین Appreciation کے درجے میں آتی ہے۔ اس کی علیحدہ قدر و قیمت ہے مگر اس سے بڑی تنقید کا درجہ نہیں مل سکتا۔ بڑی تنقید تخلیقی ادب سے کسی طرح کم تر نہیں ہوتی بلکہ وہ خود تخلیق ہو جاتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ جو نقاد شاعر نہیں ہوتے، وہ شاعری کے متعلق کیا بتا سکتے ہیں یا جو ناولسٹ نہیں وہ ناول کے متعلق کیا رائے قائم کر سکتے ہیں، غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مولوی عبدالحق کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ وہ شاعر نہیں ہیں لیکن یہ بات ان کے ایک اچھے نقاد ہونے میں خلل انداز نہیں تھی۔ جگر ایک اچھے شاعر ہیں مگر وہ ایک اچھے نقاد نہیں کہے جا سکتے۔ شاعر کے لیے ایک شیریں دیوانگی اور تنقید کے لیے ایک مقدس سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے آرنلڈ نے اس کو High Seriousness کہا ہے۔ کبھی کبھی یہ دونوں چیزیں ایک شخص کے یہاں مل جاتی ہیں۔ ہر اچھا شاعر ایک فنی شعور بھی رکھتا ہے مگر یہ فنی شعور سے ادب کے دوسرے اصناف کی قدر و قیمت متعین کرنے میں چنداں مدد نہیں دیتا۔ بلکہ ایک رکاوٹ ہی ثابت ہوتا ہے۔ ایک شعبے کی طاقت دوسرے کی کمزوری ہو ہی جایا کرتی ہے۔ غزل کے شاعر اکثر نظم کی تعبیری صلاحیتوں کا اندازہ نہیں کر پاتے۔ اشاروں کے دلدادہ تفصیل اور صراحت اور وضاحت کے حسن کو نہیں دیکھ پاتے۔ جس گہرائی اور سپردگی کی تخلیق میں ضرورت ہوتی ہے، تنقید میں اس سے ابھرنا بھی ہوتا ہے۔ ہر فن کار کی شخصیت کے دو حصے ہوتے ہیں ایک حصہ تجربہ حاصل کرتا ہے، دوسرا اس رنج و راحت کو ذرا بلندی سے دیکھتا ہے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ اس لیے اگر فن کار بعض اوقات اپنے رنج و راحت کو ذرا بلندی سے نہ دیکھ پائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے مگر اس سے نقاد کی اہمیت اور عظمت کم نہیں ہوتی۔ اور مسلم ہو جاتی ہے، میر نے نکات الشعراء میں اپنا جو انتخاب کیا ہے اس سے میر حسن کا انتخاب اچھا ہے۔ جنوری ۱۹۴۱ء کے نگار میں شاعروں نے اپنا جو انتخاب کیا تھا وہ یقیناً ہر جگہ کلام کا بہترین انتخاب نہیں تھا۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ نقاد شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی یا اونچے پائے کا شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی اچھا نقاد ہو سکتا ہے ہاں اس کے لیے سخن فہم ہونا

ضروری ہے۔ اس کے لیے اس روح تک پہنچنا ضروری ہے جو شاعری کی ہے۔ اس کے یہاں اس وسیع ہمدردی کی اس لچک دار ذہن کی، اس ہمہ گیر طبیعت کی موجودگی ضروری ہے جو شاعری کی فضا میں، شاعر کے ساتھ، بلکہ اس سے آگے بھی پرواز کر سکے۔ فن کار تجربوں کو جنم دیتا ہے۔ سخن فہم نقاد فن کاروں کو صحیح معنی میں فنکار بناتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے غلط نہیں کہا ہے کہ "جب ایک تخلیقی ذہن دوسرے سے بہتر ہوتا ہے۔ اکثر اس کی وجہ یہ ہوتی کہ جو بہتر ہوتا ہے وہ تنقیدی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے۔" ہڈسن نے تو اور صاف صاف کہا ہے کہ "سچی تنقید بھی چونکہ اپنا مواد اور جذبہ زندگی سے لیتی ہے اس لیے اپنے رنگ میں وہ بھی تخلیقی ہے" اس لیے تنقیدی ادب سے اس وجہ سے بھڑکنا کہ وہ کتابوں کی جھلک رکھتا ہے، صحیح نہیں۔ اچھی تنقید کسی طرح اچھی تخلیق سے کم نہیں، بلکہ بعض وجوہ سے اس پر فوقیت رکھتی ہے۔ ("تنقید کیا ہے" سے اقتباس)



(بقیہ صفحہ ۲)

ے تو ہے انسان، پھینے تو ہے بندہ اور نمازی بندہ کی تو جب نیت بدلے ہے تو ایسی بدلے ہے تو ایسی بدلے ہے کہ جس کی کچھ ٹھیک نہ ہے! مجھے ہے نہ کہ نماز پڑھوں ہوں، تو سات خون مجھ کو معاف ہو جاویں گے، جاتے ہے نہ کہ اللہ تو کچھ کہنے کو آنے سے رہا ـــ اپنی ساری کی کرائی۔ اگلی پچھلی گوڑی سمیٹی اور اللہ کے سر تھوپ دی! اپنے آپ ہاتھ جھاڑ کے الگ ہو گئے ـــ اور خواہ مخواہ اللہ کو الزام ـــ کیا انصاف کرو ہو ـــ واہ جی واہ۔"

(بشکریہ "کتاب" لکھنؤ)

## روشؔ صدیقی

# غزل

اشتیاقِ دید کی رسوائیاں
بن گئیں رُخ پر ترے رعنائیاں

بھول جاؤ گے یہ بزم آرائیاں
کیا کہوں کیا ہیں مری تنہائیاں

کھل نہ جائے پردۂ شوقِ نمود
اک جھلک اور سو حجاب آرائیاں

زندگی اس کی ہے بس اے سروِ ناز
پڑ گئیں جس پر تری پرچھائیاں

آخرش! تصویرِ جاناں بن گئیں
کچھ پریشاں سی خیال آرائیاں

کس نے آنکھیں پائے ساقی پر ملیں
میکدہ لینے لگا انگڑائیاں

بڑھ گئیں منزل سے آگے لغزشیں
رہ گئیں تھک کر وفا پیمائیاں

ہے یہ سب رعنائی حسنِ خیال
کس نے دیکھی ہیں تری پرچھائیاں

تو بھی رخصت! اے ہجومِ آرزو
آج تنہا ہیں مری تنہائیاں

ہیں فروغِ خلوتِ دل تک روشؔ
زندگی کی انجمن آرائیاں

**یہ غزل**

روشؔ صدیقی صاحب کے مجموعۂ کلام "محرابِ غزل" سے لی گئی۔
روشؔ صدیقی موجودہ غزل گو شعراء کی صفِ اول میں ہیں۔
"محرابِ غزل" اردو غزل میں ایک قابلِ قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کو دیکھنے کے بعد ہی آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ غزل کے امکانات کتنے گہرے اور وسیع ہیں۔
قیمت: ۳/۰

# کچھ نئی پاکستانی کتابیں

## ناول، افسانے

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| اپنے خواب | واحد حسین | ۴/۰ |
| اسرار روم | اعجاز الرحمٰن | ۴/۰ |
| اور جہاز جلا دیے | واحد حسین | ۴/۰ |
| پیار کی دیوی | پیٹر لوئی | ۲/۷۵ |
| تین دیوانے | صفیہ انجم | ۵/۰ |
| خون کا دریا | اعجاز الرحمٰن | ۴/۰ |
| ڈاک بنگلہ | اے حمید | ۴/۵۰ |
| سہرے کے پھول | عادل رشید | ۳/۰ |
| شہزادہ اورنگ زیب | مائل ملیح آبادی | ۳/۰ |
| شب و روز | محمد شریف | ۳/۰ |
| ضبن | اے حمید | ۳/۰ |
| لڑکی اور جنگل | ” | ۳/۵۰ |
| مونگے کا جزیرہ | اعجاز الرحمٰن | ۴/۰ |
| ناز آفریں | قیسی رامپوری | ۳/۵۰ |
| یہ قربتیں یہ فاصلے | سیدہ زہرہ | ۴/۵۰ |
| وجینتی مالا | سید ندیم احمد | ۵/۵۰ |

## نظم

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ٹیڑھی زمین | اختر انصاری دہلوی | ۳/۰ |
| سرود جاں | ” | ۲/۵۰ |
| گجر | قتیل شفائی | ۳/۰ |

## مذہب و سوانح

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| اولیائے لاہور | محمد وارث کامل | ۶/۰ |
| احکام سلطانیہ | علامہ ابوالحسن | ۶/۰ |
| ابوبکر | محمد حسین ہیکل | ۴/۵۰ |
| الہارون | عمر ابو النصر | ۲/۲۵ |
| الحسین | ” | ۱/۵۰ |
| امیر معاویہ | انیس زکریا | ۱/۲۵ |
| امام زین العابدین | عبدالعزیز | ۱/۲۵ |
| الزہرا | عمر ابو النصر | ۱/۰ |
| ابوذر غفاری | عبدالمجید | ۲/۰ |
| خانہ کعبہ | محمد طاہر | ۱/۷۵ |
| دس پیغمبر | بشیر احمد | ۲/۵۰ |
| سیرۃ النبی اول دوم | عبدالجلیل صدیقی | ۳۲/۰ |
| سلطان محمد فاتح | محمد مصطفٰے | ۱/۰ |
| محمد رسول اللہ | توفیق الحکیم | ۵/۰ |

## نفسیات

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| آداب زندگی | محمد اقبال | ۲/۰ |
| جینے کی اہمیت | لن یو تانگ | ۵/۵۰ |
| جنس کا جسمانی پہلو | کیتھ واکر | ۲/۵۰ |
| ” نفسیاتی ” | ” | ۳/۰ |
| روز مرہ آداب | الطاف فاطمہ | ۲/۰ |

**مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی سے مل سکتی ہیں**

رضیہ سجاد ظہیر

# اللہ دے بندہ لے

جب فخرو سرسی سے سنبھل آیا تو اس نے دھوتی کی جگہ تہمد باندھا' گمری اتار کے کرتا سیا۔ سنبھل سے مرادآباد پہونچا تو تہمد کی جگہ پاجامے نے اور کرتے کی جگہ قمیض نے لے لی۔ سرسی میں وہ الف کے نام لٹھا نہیں جانتا تھا سنبھل میں ہمارے ماموں نے اس کو اردو پڑھنا لکھنا سکھایا اور مرادآباد پہونچ کر تو وہ اتنا تیز ہوگیا کہ ہمارے بیرسٹر ماموں جو کتاب کہتے وہ الماری میں سے نکال لاتا' قانون کی ایک ایک کتاب پہچاننے لگا' سب قصے داستانیں رسالے اسے معلوم ہو گئے۔

لیکن اس ترقی کے باوجود ایک کمی اس کی شخصیت میں رہ گئی کہ وہ بوٹ جوتا نہیں خرید سکا —— بوٹ اس وقت بھی کافی مہنگے تھے اور پانچ روپے میں سے تین روپے گھر بھیجنے اور چار آنے مہینے میں مسجد میں چراغی' چار آنے یتیم خانے کا چندہ اور آٹھ آنے فاخری دادی کے پاس جمع کرانے کے بعد پھر بچتا ہی کیا تھا جو فخرو بوٹ جوتا بھی خرید سکتا' آخر ہر مہینے حجامت بنوانا تھا' بیڑی ماچس' دھوبی کی دھلائی' سر کا تیل یہ سب مفت تو ہوتا نہیں تھا —— اس لیے اس کی شخصیت میں یہ ایک کمی رہ گئی تھی —— اور دوسری کمی اس کی ذہنیت میں رہ گئی تھی —— کہ وہ نماز پڑھنے سے برابر انکار کرتا چلا گیا۔ ترقی کے کسی اسٹیج پر بھی اس نے نماز نہیں پڑھی! ہمارے بیرسٹر ماموں کو اس معاملے میں اس کا یہ اڑیل بیل والا رویہ سخت ناپسند تھا۔

بیرسٹر ماموں کئی سال ولائت رہے تھے' سوٹ پہنتے تھے' انگریزی فروٹ بولتے تھے مگر نماز پانچوں وقت کی پڑھتے تھے، جب وہ نماز کے لیئے باآواز بلند اذان دیتے تو باقی گھر والوں کی سٹی گم ہو جاتی' ہر شخص ان کی گرجدار آواز کے رعب میں آکر فوراً نماز پر کھڑا ہو جاتا۔ ہمارے نانا جب تک جئے اس بات پر بیحد فخر کرتے رہے کہ ان کے کئی دوستوں کے بیٹے تو ولائت جاکر اپنا دین ایمان بھول گئے مگر ان کا بیٹا اتنے دن تک ولائت میں رہنے کے بعد بھی پانچوں

وقت کی نماز پڑھتا اور تیسوں روزے رکھتا تھا۔ اجی اس کی نماز کی تو طوائفیں تک قائل تھیں، ایسی جانے کتنی عورتوں کو اس نے نماز سکھا کے ان گمراہوں کو دین وایمان کا راستہ دکھایا تھا۔

ویسے بیرسٹر ماموں کو فخرو سے محبت بہت تھی اور کیوں نہ ہوتی یوں تو وہ عمر میں ان سے بڑا تھا پر آخر انہوں نے ہی تو اس کو جانور سے آدمی بنایا تھا۔ یہ بات اور تھی کہ اب فخرو کے بغیر ان کا کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا اتنا سستا' اتنا زیادہ کام کرنے والا اور ایسا خیر خواہ نوکر نہیں مل سکتا تھا۔ ورنہ کبھی کبھی تو وہ خود بھی کہتے تھے کہ ایسے آدمی کے تو ہاتھ کا پانی بھی نہ پینا چاہیے جو کبھی ایک ٹکر نہیں مارتا' جس کے دل پر اللہ نے مہر لگا دی ہے!

فخرو روزے تیسوں رکھتا تھا' رمضان بھر جو کچھ ہو سکتا خیرات کرتا مسجد میں آنے والوں کے لیے نکڑ کی لالٹین میں تیل اپنے پاس سے رمضان بھر ڈالتا ــــ تاکہ راستہ پر روشنی رہے پر خود مسجد کے اندر نماز پڑھنے کبھی نہ جاتا ــــ اور کانوں سے پچاس پھیرے مسجد کے کرتا۔

ماموں رمضان کے دوران دو تین بار اس سے کہتے "ابے تیرے روزے سے فائدہ ہی کیا' بیکار فاقے کرے ہے' بغیر نماز کے کہیں روزے ہوئے ہیں"

"اجی آپ نے جو کتاب پڑھائی تھی میر صاحب اس میں تو نماز الگ لکھی ہے گی' روزہ الگ لکھا ہے گا' یوں تو نہ لکھا کہ نماز بغیر روزہ نہ ہو سکتا یا روزہ بغیر نماز نہ ہو سکتی"

اب اس صریحی منطق کا ماموں کے پاس کیا جواب تھا۔ وہ اسے دھتکارتے ہوئے کہتے۔

"چل کمبخت' دور ہو' لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا ــــ"

دلچسپ بات یہ تھی کہ فخرو نے کبھی بیرسٹر ماموں سے انکار بھی نہیں کیا تھا وہ نماز نہیں پڑھے گا پر کچھ ایسا ہو جاتا تھا کہ وہ صاف بچ نکلتا اور پھر بھی مزے میں رہتا ــــ

مثلاً مغرب کی نماز کے لیے ماموں مسجد جانے لگتے تو فخرو سے بھی کہتے "ابے چل مسجد" مغرب کی اور صبح کی نماز وہ مسجد میں پڑھتے تھے ــــ پہلے گھر میں اذان دیتے ــــ پھر مسجد میں جا کر نماز پڑھتے۔

فخرو گھر کے دفتر والے کمرے کی طرف اشارہ کرتا اور بڑی معصوم سی صورت بنا کے چپکے سے کہتا "اجی بڑا موٹا موکل ہے گا بلشٹر صاحب جو میں تمہارے ساتھ چلا جاؤں تو وہ مچھلی کی طرح کھسل جاوے گا' تم پڑھ یاؤ نماز جتنے میں اسے باتوں میں الجھاؤ ہوں"

اب اس کے آگے ماموں کیا کہتے!

جب مغرب کی نماز پڑھ کر وہ لوٹتے فخرو کو موکل سے گپ شپ کرتے پاتے!
کبھی کبھی صبح کو وہ فخرو کو آواز دیتے" ابے آ ــــ مسجد جا رہا ہوں"
وہ چائے کی ننھی سی پتیلی مانجتا ہوا منڈیر ہی پر سے بڑے اطمینان سے جواب دیتا" اجی تم چلو، فاخری دادی کو رات لرزہ چڑھ گیا ان کے لیے دو پتی چائے دم کر کے ابھی آؤں ہوں فروٹ، تم چلو میر صاحب"
"فاخری دادی بڑی جلالی سیدانی تھیں اور گھر کی سب سے زیادہ پھوس قسم کی بزرگ، پچانوی برس کی عمر تھی لہذا ان کو سب کے حالات معلوم تھے۔ ہر ایک کی ماں کا مہر اور ہر ایک ــــ کی خرابی یا عمدگی ان کو پتہ تھی، ان کو غصہ چڑھتا تھا تو وہ سات پشت تو م کے دھر دیتی تھیں، ظاہر ہے ان کی چائے میں کون اڑچن لگا سکتا تھا۔ ماموں بڑبڑاتے، پیر پٹختے چلے جاتے!
جاڑوں میں اکثر سب لوگ رات کے کھانے کے بعد بیرسٹر ماموں کے کمرے میں جمع ہوتے، کیونکہ وہاں سب سے بڑی والی انگیٹھی سلگتی تھی ــــ فخرو بھی وہیں ہوتا ــــ کبھی کبھی بیرسٹر ماموں اس سے بحث کرتے۔
"ابے میں کہوں ہوں آخر تو اللہ کے گھر جانے سے کیوں کنی کاٹے ہے"
فخرو بڑے بھولے پن سے حیران ہو کے جواب دیتا" اجی لا اللہ کے گھر جانے سے کون بندہ کنی کاٹ سکے ہے، ابھی اس دن نہ گیا تھا روزہ داروں کی افطار لے کے، بڑے بڑا دیگچہ گھنگھنی کا جلو آپا نے حوالے کر دیا کہ لے جا مسجد، دونوں نے تو کیا بھی کہ بھگنا کو لے لے پکڑنے کو، پر میں نے اکیلے ہی سر پہ اٹھا کے منڈی میں پہنچا دیا کہ افطار ہے ثواب ہو وے گا ــــ بھلا پندرہ سیر سے کیا کم رہی ہو گی گھنگھنی ــــ کیوں جلو آپا؟"
"لے ہاں اور کیا" جلو آپا نے گواہی دی۔
"ابے وہ تو ٹھیک ہے پر تو نماز پڑھنے کیوں نہ جاتا؟ دعا مانگنے سے کیوں گھبراوے ہے؟" بیرسٹر ماموں نے صاف صاف سوال کیا۔
"اجی واہ میر صاحب، اتنے بڑے بالشٹر ہو کے یہی انصاف کرو ہو! اجی دعا نہ مانگوں ہوں تو کیا اللہ میاں نے یوں ہی سر سی سے مردہ بادشاہ بنا دیا؟ اجی میرے برابر تو کوئی دعا نہ مانگتا ہو وے گا ــــ اتی اتی دعا مانگی تب اللہ میاں نے یہ چار حرف پیٹ میں ڈالے کہ اب داستان امیر حمزہ پڑھ سکوں ہوں۔

بیرسٹر ماموں زچ ہو جانے پر بھی بحث کیئے جاتے — آخر وہ بیرسٹر تھے یہ سری کا لنگوٹی بند ان کو کیا ہرا سکتا تھا۔

کہتے "تو کوٹھری میں بیٹھ کے ڈھیروں دعا مانگے ہے تو پھر کیا! جماعت میں نماز کا حکم ہے"

فخرو ذرا سا جھینپ کے جواب دیتا "اجی سب کے سامنے کسی سے کچھ مانگتے ذرا شرم آوے ہے — اور دعا تو اللہ میاں ہر کسی کی سن لیویں ہیں میر صاحب — کیا کوٹھری کے نہ سنتے ؟ اور مولی صاحب تو اس دن کے رہے تھے کہ رسول اللہ کبھی اپنے حجرے میں نماز پڑھیں تھے اور کبھی مسجد میں اور حضرت یوسف ؑ نے تو قید خانے میں دعا مانگی تھی اور....."

ماموں کھسیا کے بولے" اور اور کے بچے! کیا بکتا چلا جاوے ہے، استغفر اللہ، تیری اور نبیوں کی برابری ہے؟"

فخرو نے کان کو ہاتھ لگایا" توبہ ہے، توبہ ہے، اجی میں گے تھوڑا ہی کے رہا ہوں، میں تو گے کے رہا ہوں کہ گنہگار بندوں کو، تو وہی کرنا چاہیے جو آپ کریں تھے، جب ہی تو نجات ہووے گی، جب ہی تو آپ سفارش کریں گے — صلی اللہ —" اس نے اپنی انگلیاں آنکھوں کو لگا کے چومیں — مارے عقیدت کے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں!

بیرسٹر ماموں نے عاجز ہو کے حقہ طلب کیا اور گڑگڑانے لگے۔

یقیناً فخرو کے دل پر خدا نے مہر لگا دی تھی!

پھر ایک دن گھر میں بڑا ہنگامہ مچا۔ بات یہ ہوئی کہ فخرو کے پاس یکایک ایک جوڑ جوتا کہیں سے آ گیا — جوتا نہیں بوٹ — ایک دم عمدہ والا، چما چم کرتا، چاہو تو اس میں منھ دیکھ لو، اس کی چھوٹی ننھی آنکھوں میں کالے ہی ریشمی فیتے پڑے ہوئے تھے جن کے آخر میں سیاہ ٹین جڑا تھا اور بٹن میں سے آخر کی طرف، فیتے کا بالکل ننھا سا، بالکل ذرا سا ریشمی پھندا اوپر کو منھ اٹھائے جیسے کوئی محبوب اپنے بھرے بھرے گلی سے ہونٹ سکوڑ کر سیٹی بجا رہا ہو!

اور پھر اکیلا جوتا بھی نہیں، ساتھ میں ایک ڈبیہ اس پر کرنے والی پالش بھی اور ایک برش بھی سب بچے بیحد خوش میں تھے، باری باری سے جوتا اٹھا کے دیکھتے، کوئی پالش کی ڈبیہ کو زمین پر گول گول نچاتا، کوئی برش کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا، کوئی فیتے کے پھندے پر انگلی چھوتا، نوری آپا نے تو یہاں تک تجویز کی کہ جوتے کا کوئی نام بھی رکھا جائے!

بیرسٹر ماموں کا بھی منہ اس وقت اچھا تھا، ہنس کے بولے "ہاں ضرور رکھو ——— خدا بخش نام رکھو اس کا"

سب ہنسنے لگے مگر فخرو سنجیدگی سے بولے " اجی یہ تو ٹھیک کہو ہو میر صاحب، میں نے بہتیری ہی دعائیں مانگی تھیں کہ اللہ میاں تم نے سب کچھ دیا بس اب ایک بوٹ جوتا اور دلوا دو کہیں سے سو میر صاحب وہ جو عورت بھگانے والا موکل آیا تھا، اجی وہی جن نے اجھاری لالی تمیزن کی لونڈیا بھگائی تھی اور تم نے وسے صاف چھڑا لیا تھا، تو وہ نے مجھ سے کیا کہ بھائی جب میں آؤں تھا تو تو میری بہت خاطر کرے تھا۔ اب میں باعزت بری ہو کے گھر جا رہا ہوں، تو بتا تو کیا لیوے گا سو چنگی بجاتے ہیں، چھپر پھاڑ کے اللہ میاں نے دلوا دیا گے بوٹ ——— اچھا ہے نہ میر صاحب" اس نے بڑے پیار سے جوتے کو دیکھا۔

" اے ہاں، بہت اچھا ہے" بیرسٹر ماموں بولے ——— " اب آج تو چل مسجد، نماز شکرانہ تو ادا کر"

فخرو چپ ہو گیا، جھک کے اس نے جوتے اٹھائے، بڑی احتیاط سے ڈبے میں رکھے برش، جوتوں کی آڑیں فٹ کیا، پھر ڈبہ ایک کونے میں بٹھائی، ڈھکنا ڈھک کے اسے سُتلی سے باندھا، ڈبہ بغل میں دبایا ——— اور کھسک لیا۔

شام کو مغرب کے وقت بیرسٹر ماموں مسجد میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ انھیں فخرو کا سایہ گلی کے نکڑ پر دکھائی دیا ——— نئے جوتے پہنے، نئی قمیض کا دامن اڑاتا، نئے پاجامے کے پائنچے پھٹکارتا، پان چباتا، ایک دوست کے ہاتھ میں ہاتھ دیے وہ گلی میں مڑنے ہی والا تھا کہ بیرسٹر ماموں نے للکارا " فخرو ——— ابے او فخرو ——— یہاں آ ——— ابے آ یہاں!"

فخرو بھنس چکا تھا۔ اس کا دوست اور وہ دونوں آئے " چل وضو کر" ماموں نے حکم دیا۔
فخرو کسمسا کے بولا " اجی پان کھا رہا ہوں میر صاحب ——— اور پھر گے بھی تو بات ہے کہ . . . . "
نکہ پان سسرال والوں نے کھلایا ہے، تھوک نہ سکے ہے بیچارہ" اس کے دوست نے ٹکڑا جوڑا
ماموں ہنسنے لگے " سسرال ہی کیسی سسرال ——— ابے یہ چکے ہی چکے!"
فخرو خاموش رہا ——— پر اس کا دوست بولا " اجی کوئی ایسی ویسی بات نہ ہے۔ اشراف ہیں گے وہ لوگ بھی اپنی برادری ہے، بالشٹر صاحب، سسری کے ہی لڑکی بھی قبول صورت ہے گی۔ نماز پڑھے، کلام پاک ختم کر چکی ہے، اس دکھیا کا گھر بھی بیوی کے مرنے سے اجڑ گیا ہے سو بس جا رہے گا"

"اچھا، اچھا چلو وضو کرو دونوں آدمی ——— چلو" ماموں نے اصلی بات پھر چھیڑی۔
فخرو نے بے بسی سے دوست کی طرف دیکھا، دوست نے اس کی طرف، دونوں مٹی کا بدھنا اٹھا کے وضو کرنے لگے۔

مغرب کی نماز کے بعد مولوی صاحب روز وعظ کہتے تھے، آج بھی کہا، اس میں کافی دیر لگی کچھ لوگ اٹھ اٹھ کے چلے گئے۔ فخرو اور اس کے دوست نے بھی کئی بار پہلو بدلا بیرسٹر ماموں نے ان کو ایسا گھورا کہ وہ پھر دبک کے بیٹھ گئے! آخرکار وعظ ختم ہوا، لوگ باہر نکلے اور فخرو کو ایک ہی لمحہ بعد پتہ چل گیا کہ اس کا نیا بوٹ جوتا غائب ہے۔

اس کے دوست کی پیشو چپلیاں اسی طرح محفوظ رکھی تھیں سب لوگوں میں ہراسانی کی ایک لہر دوڑ گئی بیرسٹر ماموں بھونچکا رہ گئے ان پر ایک دو منٹ کے لئے تو بالکل سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر فخرو کو سمجھاتے ہوئے بولے "چل جانے دے ——— ہوگا، میں تجھے دوسرا لے دوں گا" اس سے ———

پولیس میں رپورٹ ہوئی، بیرسٹر ماموں نے انعام کا اعلان کیا دوسرے دن وعظ میں بڑے مولوی صاحب نے بھی خوب لعنت ملامت کی، محلہ میں بھی ایک ایک سے کہا گیا ——— پر بوٹ کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔!

بھئی اچھا سمجھ لے جس اللہ نے دی تھیں وِسی نے لے لیں۔ فخرو پر ابھی اب تک تو سکتہ طاری تھا پر یہ سن کر وہ بپھر گیا۔ بھنا کے بولا "اجی گے تو میں کبھی نہ ماننے کا ہوں کہ اللہ نے لیا ——— ان نے تو مجھے اتی دعائیں مانگنے پہ دیا تھا، پھر لے کیوں لیوے گا اور وِسے کیا ضرورت ہے بوٹ جوتے کی ——— خوامخواہ اللہ کو الزام دو ہو بالشٹر صاحب۔ لیا تو ہے کسی نمازی نے"

بیرسٹر ماموں کیا کہتے ——— وہ تو صاف ہی ظاہر تھا کہ کسی نمازی نے لیا ہے! کھسیا کے بولے "نہ جانے کون تھا شیطان کی اولاد! مسجد میں نماز کے بہانے آ دبں ہیں جوتے چرانے! ابھی پولیس میں رپورٹ کر کے بند کرواؤں ہوں"

جب میری عمر کوئی سات آٹھ سال کی تھی تو فخرو کافی بوڑھے ہو چکے تھے، ڈیوڑھی میں بیٹھے کھانسا کرتے تھے، پوتوں پڑپوتوں والے تھے مگر ہر بار جب ہم لوگ اپنے ننھیال جاتے تو میں ایک ایک سے یہ قصہ سنتی تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ نہ کبھی مسجد گئے نہ کبھی انھوں نے نماز پڑھی ——— حسب عادت نماز کا ذکر سن کر تو وہ کچھ نہیں کہتے تھے ——— کبھی کبھار مسکرا دیتے! لیکن اگر کوئی یہ کہہ دیتا کہ "اللہ کی مرضی یونہی تھی، خدا کا کرنا یوں ہی تھا" تب وہ بے حد بگڑتے ہے ... کیا کرتا ہے۔
... تو ... کہو، اللہ کا کرنا تھا ...

# ہائر سکنڈری اسکول

## کامٹی

"........ یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آٹھ سال کی طویل مدت کے بعد آپ نے پیامِ تعلیم اپنی پہلی آب وتاب کے ساتھ جاری کردیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اتنے اچھے لکھنے والوں کا تعاون حاصل کرلیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اپنی تمام تر سابقہ روایات کے ساتھ پیامِ تعلیم کو ہر دلعزیز بنانے میں ضرور بضرور کامیاب ہوں گے۔

بچّوں کی صحیح تربیت ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ جسے دیگر ممالک نے تو کسی حد تک سُلجھا لیا ہے۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارا دیس اس سلسلے میں ابھی بہت پچھڑا ہوا ہے خصوصاً اُردو والے تو اور بھی زیادہ پیچھے ہیں۔ کیونکہ اُردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں بچّوں کے ایسے رسالے ایک عرصے سے شائع ہونا شروع ہو گئے ہیں جو بچّوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ معلومات اور ایک اچھا شہری بننے کے لیے ضروری مواد فراہم کرتے رہتے ہیں۔

اُردو میں بھی اس قسم کے رسالوں کی اشد ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے اور پیامِ تعلیم کے دوبارہ اجراء سے یہ امید بندھ گئی ہے کہ اس کمی کو بہت حد تک دور کیا جاسکے گا.........."

ایم۔ ربّانی
(پرنسپل)

## شرابِ کہنہ

# جلالؔ

۱۸۳۴ء ——— ۱۹۰۹ء

ضامن علی، نام، جلال تخلّص۔ قوم ونسب کے لحاظ سے سید اور رضوی، خاندانی پیشہ طبابت۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے، اردو فارسی کی کتابیں اپنے والد میر اصغر علی سے پڑھیں، عربی اور کچھ آگے کی تعلیم کے لیے نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں بٹھائے گئے تھے۔ مگر لکھنؤ کی فضا میں شعروشاعری کا دور دورہ تھا یہ بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے اور باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اپنے خاندانی پیشے طبابت کی طرف بھی کچھ دنوں توجہ رہی، تھوڑے دنوں تک لکھنؤ میں باقاعدہ مطب بھی کیا مگر بالآخر شاعری ہی کو ذریعۂ معاش بھی قرار دے لیا۔

شروع میں جلالؔ نے امیر علی خاں ہلالؔ کو اپنا کلام دکھایا، اس کے بعد میر علی اوسط رشکؔ کے شاگرد ہوئے، وہ کربلائے معلیٰ چلے گئے تو نواب فتح الدولہ برقؔ کو اپنا استاد بنا لیا۔ برقؔ بھی جب نواب واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج (کلکتہ) چلے گئے تو پھر جلالؔ کے لیے اس کی ضرورت نہ رہ گئی تھی کہ وہ کسی کے آگے زانوئے تلمّذ تہ کریں، اپنی مشقِ سخن اور زبان دانی کی بنا پر استادی کے درجے تک پہنچ چکے تھے۔ ناسخؔ کی جو خوبیاں اور خصوصیتیں تھیں وہ سب رشکؔ اور برقؔ کے ذریعہ جلالؔ تک منتقل ہو چکی تھیں۔

واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد شعرا اور دوسرے اہلِ کمال حضرات کا لکھنؤ میں کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔ خوش قسمتی سے جلالؔ کے والد بزرگوار کو رام پور میں "داستان گو" کی حیثیت سے ملازمت مل چکی تھی۔ انھیں کے توسط سے نواب یوسف علی خاں نے جلالؔ کو بھی اپنی ریاست میں بلا لیا۔ معاش کی طرف سے مطمئن ہو کر جلالؔ کو رام پور میں شعروسخن کے ساتھ ساتھ مطالعے کا بھی خوب موقع ملا۔

نواب یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں کے عہد میں جلالؔ کی پہلی جیسی

قدر و منزلت نہ رہی ان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جلالؔ ایک صاف گو اور بے باک قسم کے آدمی تھے شعر و ادب کے معاملے میں وہ کسی کی رو رعایت نہ کرتے۔ خواہ وہ نواب کلب علی خاں ہی کیوں نہ ہوں تقریباً بیس سال رام پور میں رہ کر وہ لکھنؤ واپس آ گئے۔ تھوڑے دنوں بعد منگرول کے نواب شیخ حسین میاں نے ان کو اپنی ریاست میں بلا کر بڑی عزت و توقیر کے ساتھ رکھا مگر جلالؔ وہاں بھی زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے، اپنے صاحبزادہ کو اپنی جگہ چھوڑ کر وطن لوٹ آئے۔

پیرانہ سالی اور آنکھوں میں ناسور ہو جانے کے باعث اُن کی آخری عمر تکالیف اور مالی پریشانیوں میں گزری۔ اس حالت میں بھی اصلاح و مشورے کا کام، اور تن پیٹ کے لیے معاوضے کر غزلیں لکھ کر دینے کی مشقت برابر جاری رہتی تھی۔

جلالؔ فنِ عروض کے زبردست ماہر تھے۔ لکھنؤ کی شاعری کی بعض ناپسندیدہ باتوں کو انھوں نے بڑی خوبصورتی اور جسارت کے ساتھ دور کیا۔

ان کے چار مطبوعہ (شاہدِ شوخ طبع۔ کرشمہ گاہِ سخن۔ مضمونہائے دل کش۔ منظم نگاریں) اور ایک غیر مطبوعہ دیوان۔ اس کے علاوہ سات نثر کی کتابیں (منتخب القواعد۔ سرمایہ زبان اردو۔ گلشنِ فیض۔ تنقیح اللغات۔ افادۂ تاریخ۔ رسالہ عروض و قوافی اور مفید الشعرا) اس بات کا زبردست ثبوت ہیں کہ انھوں نے اپنی تمام عمر اور توجہ شعر و سخن کی قدر افزائی اور زبان و فن کی اصلاح و خدمت میں صرف کی۔

انتخاب :-

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو　　پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا
جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم　　چمن کو پھول گئے ہم کو داغ بھی نہ ملا

~~~~~~

جس دل کو پوچھتا تھا، وہ ہم نے بتا دیا　　اے دردِ عشق تجھ کو ٹھکانے لگا دیا

~~~~~~

حسرتیں پوچھیں جو لے عشق ٹھکانا دل کا　　نہ بتانا انھیں مسکن نہ بتانا دل کا

~~~~~~

خود سے تو اُدھر نہ جائیں گے ہم　　آئندہ جو قصد بے خودی کا
~~~~~~

یہ کیوں ہے جان چھپی آج کس پہ آپا جی آ یا — پکارا بے کُلائے اضطرابِ دل کر کے جی آیا

مری داستانِ فراق نے شبِ وصل کو مزا دیا — کبھی میں نے رو کے ہنسا دیا کبھی اس نے ہنس کے رلا دیا

آستاں بوس تھے جس در کے وہ در چھوڑ دیا — بھاری پتھر تھا فقط چوم ہی کر چھوڑ دیا
گرمیٔ آہ نے کیا جلد اثر چھوڑ دیا — لب کو تو خشک کیا آنکھ کو تر چھوڑ دیا

دھوم نالوں کی ہے۔ اک شور ہے فریادوں کا — خوب آباد ہے کوچہ ستم ایجادوں کا

دل ہمارا اور یوں ہو جائے ہم سے منحرف — آج ان کی کج ادائی کا گلہ جاتا رہا

مجھے جان دے کے اتنی بخدا خوشی نہ ہوتی — مرے مرنے کا ذرا بھی جو تمہیں ملال ہوتا

تغافل کے گلے سن کر جھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بے باک ہونا تھا

یہ اشکِ حسرت جو گر پڑا ہے تمہارے آگے ابھی ٹپک کر
اسی نے آنکھوں میں صبح کی ہیں ہزاروں راتیں کھٹک کھٹک کر

تم حضرتِ دل اور مدارات کے قابل — کہنا جو نہ مانے وہ نہیں بات کے قابل

کس کی محشر میں ہم کریں فریاد — داورِ حشر ہو تمہیں نہ کہیں

کرشمے لاکھ اُن کی ادا میں — ہزاروں شوخیاں اک حیا میں
بہت پچھتائے ہے درد کو ہم — جگر دے کر دلِ درد آشنا میں

ایسے گئے کہ پھر نہ ادھر آئے تم کبھی | کیا میری عمر رفتہ ہو، میرے شباب ہو
منہ ڈھانکتے ہو کیوں مری میت پر آکے تم | آنکھیں ہیں بند شوق سے اب بے حجاب ہو

ٹنک کے زلفیں جو آپڑی ہیں کمر کسی کی لچک رہی ہے
بلا کی آئی ہیں وہ گھٹائیں، غضب کی بجلی چمک رہی ہے

چلتے ہیں پیرِ مغاں اور کوئی جام سہی | نقد تو پی ہے بہت تھوڑی سی بے دام سہی

اٹھا کیوں یہ درد جگر بیٹھے بیٹھے | کوئی یاد آیا مگر بیٹھے بیٹھے
چلو دشت کو کہتی ہے وحشتِ دل | ہم اکتا گئے اب تو گھر بیٹھے بیٹھے

کر دے خبر اُس خانہ بر انداز سے کوئی | روتا ہے کہیں درد کی آواز سے کوئی
اللہ رے غم رے تیرے اے موت شبِ ہجر | معشوق بھی آتا نہیں اس ناز سے کوئی
کیا دہشتِ صیاد ہے مرغانِ چمن کو | روتا نہیں شبنم صفت آواز سے کوئی

## رسائل

جو

## مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

سے مل سکتے ہیں

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| شاہکار | (ڈائجسٹ) | الہ آباد | انشار | (ڈائجسٹ) | کراچی |
| صبا | (ماہنامہ) | حیدرآباد | نیا دور | (سہ ماہی) | کراچی |
| کتاب | ( " ) | لکھنؤ | نقوش | (دوماہی) | لاہور |

# نئی مطبوعات

سپنوں کے قیدی (افسانے)، کرشن چندر قیمت ۳/۰ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵

لہر لہر ندیا گہری (نظمیں) زبیر رضوی " ۳/۰ ایجنسی: " " "

تڑپ (ناول) رئیس احمد جعفری " ۴/۵۰ ناشر: مکتبہ عالیہ ۔ ۔ ۔ ۔ دہلی

ستاروں کی راہیں نوری لنگگاریں " ۳/۵۰ " نئی روشنی پرکاشن، نئی دہلی

لینن " ۸/۰ " " " "

ٹھنڈی آگ (ناول) کرشن چندر " ۴/۲۵ " اہلووالیہ بکڈپو ۔ ۔ دہلی

خوفناک پرچھائیاں (") محمود جالندھری " ۴/۰ " " " "

دھڑکنیں (") ایم۔ احمد جاوید " ۵/۵۰ " " " "

عورت کی موت (") " ۲/۵۰ " ساہتیہ سنگم "

ستلج سے برہم پتر تک (") دت بھارتی " ۴/۵۰ " بھارتی بک کلب نئی دہلی

جذبات فطرت ہر چہار جلد مرتبہ الیاس برنی " ۱۰/۰ " نذیریہ کتب خانہ دہلی

انتخاب اودھ پنچ " رضی کاظمی " ۲/۰ " کتابی دنیا لکھنؤ

اردو میں پشتو کا حصہ امتیاز علی عرشی ۸/۰ ملنے کا پتہ: کتاب کار پبلشرز، پھلواڑ، رامپور

مصائب غدر مولوی نذیر احمد مرحوم ۲/۵۰ ناشر نذیریہ کتب خانہ دہلی

تیری دلبری کا بھرم (ناول) عزیز احمد ۳/۵۰ " میر اینڈ کمپنی "

افضل الفوائد ملفوظات حضرت نظام اولیاء رح ۵/۰ " نذیریہ کتب خانہ "

علی و عائشہ عمر ابوالنصر ۳/۵۰ " میر اینڈ کمپنی "

روسیاہ (ناول) رئیس احمد جعفری ۵/۵۰ " " "

مطالعے (خاکے) نریش کمار شاد ۳/۵۰ " " "

## زیر طبع کتابیں

غالب کے کلام میں الحاقی عناصر (تحقیق) نادم سیتاپوری ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری

مرتبہ:- حمیدہ سلطان

صفحات:- ۲۷۲　سائز ۲۰×۳۰/۱۶　مجلد

قیمت:- پانچ روپے

(سن اشاعت ۶۴ء)

ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اپنے ادیبوں اور شاعروں کو جیتے جی سراہنے کا خیال ہمیں کم ہی گزرتا ہے۔ ہماری عادت تو بعد از مرگ واویلا کرنے کی رہی ہے۔ ایسی صورت میں حمیدہ سلطان صاحبہ کی زیرِ تبصرہ تالیف ایک فالِ نیک کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے جگن ناتھ آزاد جیسے خوش فکر و خوش خصال شاعر کی شخصیت اور فن کے بارے میں متعدد معتبر و مستند اہلِ قلم کی نگارشات کو ایک مجموعہ کی شکل دے کر نہ صرف دورِ حاضر کے ایک مقبول و معروف نوجوان شاعر کو جائز و واجب خراجِ تحسین پیش کیا ہے بلکہ ایک ایسا نیک قدم اٹھایا ہے جسے جلد ہی ہمارے ادب کی ایک خوشگوار اولیت کی حیثیت حاصل ہو جانی چاہیے۔

اس مجموعہ مضامین کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں آزاد کی شخصیت اور شاعری سے متعلق نو مضامین شامل ہیں جو حضرت فراق گورکھپوری کے 'ابتدائیہ' سے شروع ہوتا ہے۔ دوسرے حصے میں اُن کی مختلف تصانیف پر تیرہ تبصرے درج ہیں جن کے لکھنے والوں میں آلِ احمد سرورؔ، وقار عظیم اور خواجہ احمد عباس جیسے صاحبانِ نظر بھی موجود ہیں۔ ابتدا میں مرتبہ صاحبہ نے 'پیش نامہ' تحریر فرمایا ہے جو اخبارات کے اندراجات کی بنا پر بے جا طور پر طول پکڑ جانے کے باوجود آزاد کے ساتھ ان کے قرب و خلوص کی کماحقہٗ آئینہ داری کرتا ہے۔ یہاں اگر وہ انھوں نے بتا دیا ہے کہ وہ آزاد کے لیے 'آپا جان' ہیں پھر بھی یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر "اس کی شاعری" کے بجائے "ان کی شاعری" وہ تحریر کرتیں تو اچھا ہوتا۔

آزاد کی شاعری کے بارے میں حضرت فراق کی رائے ہے کہ "یہ شاعری۔ . . .

کتابی شاعری نہیں ہے بلکہ زندگی کی آواز ہے۔ ایک چوٹ کھائے ہوئے مگر سوچنے والے دل کی پکار ہے اور ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جسے شعر کہنا آتا ہے" اور ان کے سب ہی ناقدین نے اُن کی شرافتِ نفس اور خلوصِ نیت کا تذکرہ کیا ہے۔ آزاد کے کلام اور ذات کے بارے میں ایسا کیوں کہا گیا ہے؟ یہ بات اس مجموعہ کے مضامین سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ایک اجنبی کو بھی اس نوجوان شاعر کی قدر محسوس ہونے لگتی ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

## جذبات واحساسات

(سنِ اشاعت اگست ۱۹۶۴ء)

شاعر:۔ حیدر دہلوی
ناشر:۔ حافظ غلام رسول شاد جامی
صفحات ۱۲۸۔ سائز:۔ ۱۸×۲۲/۸
قیمت:۔ تین روپے
ملنے کا پتہ:۔ جامی پبلیکیشنز ہاؤس اینی تاج کمپنی
نمبر ۱۰ مسجد اسٹریٹ بمبئی ۳

اردو شعر و ادب میں جناب حیدر دہلوی کی شخصیت غیر متعارف نہیں ہے۔ جگر مرادآبادی اور آرزو لکھنوی وغیرہ جیسے شعرا کی ادبی صحبتوں سے ان کے ذوقِ شعری کو جلا ملی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے شاعر کا تعارف لکھا ہے۔

اس مجموعے کی ہر غزل عموماً سات اشعار پر مشتمل ہے۔ اور یہ اہتمام بلا شبہ حسنِ انتخاب کی دلیل ہے۔ اشعار میں غزل کا روایتی اثر شامل ہے مگر شاعر کی انفرادیت کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ جذبات واحساسات کی تصاویر، مشاہدات و تجربات کے اظہار اور فکری عناصر نے اس مجموعے کو پاکیزہ، بلند اور دل آویز تخلیق کا روپ دے دیا ہے۔ اسی لیے اس میں درج ذیل اشعار کی شمولیت کھٹکتی ہے ؎

خدا کا شکر ہے اس بزمِ ناز جاتے ہیں ص۲۳ کہ جس پہ کرتے تھے ارماں نثار برسوں سے
رسماً ہی سرِ محفل جانبِ مری دیکھا کر ص۴۷ دل کو نہ ملا دل سے نظریں تو ملایا کر

اس کتاب میں ایک انمول چیز جگر مرادآبادی کا عکس تحریر ہے (مورخہ ۹ نومبر ۱۹۵۶ء) حضرت جگر کی یہ رائے "جذبات واحساسات" کے شاعر کے لیے ایک قیمتی سند ہے۔

"وہ شعر گوئی کے فن میں بھی ان کی شہرت کچھ کم نہیں۔ وہ ایک مقام رکھتے ہیں"
شاعرانہ تعارف کے لیئے درج ذیل اشعار کا مطالعہ کافی ہو گا۔

جنوں منزل ہے عرفان و یقیں کی — خرد ہے راستہ وہم و گماں کا
محفل میں ان کی اپنے بھی بیگانہ ہو گئے — دل ہے کہیں نگاہ کہیں اور ہم کہیں
دور ہو جاتی ہے اُس چہرے سے جس دم بھی نقاب — میری آنکھوں میں شرارے سے چمک جاتے ہیں
ہر اک وفا شناس مگر خوش گماں رہا — وہ چشم ناز کام کسی کے نہ آ سکی

یہ "مجموعہ غزل" نہایت نفاست کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ اس کا خیر مقدم ضروری ہے۔

سیفی پریمی

## پیاسی بیل

(سن اشاعت اپریل ۶۴ء)

مصنف:- مانک ٹالہ
صفحات:- ۱۷۶ - سائز $\frac{22 \times 18}{8}$
قیمت:- چار روپے
ناشر:- جوپیٹر پبلشرز اوم نواس وڈالا بمبئی ۳۱

پیاسی بیل اٹھارہ افسانوں کا مجموعہ ہے مانک ٹالا ہندو پاک کے اُبھرتے ہوئے فنکار ہیں معیاری رسائل میں آپ کے افسانے طبع ہوتے رہتے ہیں۔ مصنف کا نام اردو کے لیے ایک عجیب سا نام ہے مصنف کو بھی اس کا احساس تھا اسی لیے انھوں نے "اپنی کہانی" میں اس کی وضاحت کی ہے اور معنی بتائے ہیں۔ موتیوں کا سوداگر۔

ان کے افسانے پڑھ کر واقعی اس بات پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ وہ موتیوں کے سوداگر ہیں اس مختصر سے تبصرے میں سب افسانوں پر سیر حاصل تبصرہ تو ممکن نہیں لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کے افسانے قاری کو کسی منزل پر مایوس نہیں کرتے۔

ست یگ کا انسان - بندھن - پیاسی بیل - شیطان بھی فرشتہ بھی بڑے خوبصورت افسانے ہیں انھیں پڑھ کر زندگی کے حقائق کا احساس ہوتا ہے۔

ایک خاص بات اور ان کے افسانے پڑھ کر محسوس ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار جنس زدہ نہیں ہیں بلکہ وہ جانے پہچانے آپ ہم جیسے عام کردار ہیں انھوں نے افسانوں کی بنیاد بھی روزمرہ کے واقعات اور حادثات پر رکھی ہے۔ اور پھر ان کے ساتھ پورا پورا انصاف بھی کیا ہے۔

مانکستالا اپنی کہانی میں خود اپنے فن کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔
"مقصدیت کے باوجود میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ حتی الوسع ادب کی روح مجروح نہ ہونے پائے اور کہانی کی تکنیک کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جا سکے۔"
"اور جہاں تک مجھ سے بن پڑا میں نے کہانی لکھتے وقت خود اپنا محتسب اور ناقد بننے کی کوشش کی ہے۔"

پیاس بیل ایک صحت مند افسانوں کا مجموعہ ہے جسے ہر صاحب علم کو پڑھنا چاہیئے۔ کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے۔

(عشرت کرتپوری)

## گیتا (ہندوستانی نظم میں)

(سن اشاعت ۱۹۶۴ء)

شاعر:- ستیہ پرکاش مہتاب پسروری
صفحات:- ۱۴۰ سائز:- ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد
قیمت:- دو روپے ۵۰ پیسے
ایجنسی:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

رامائن اور مہابھارت ہماری قومی کتابیں ہیں۔ 'گیتا' مہابھارت کا ایک باب ہے' جو اس کے درمیان ایک روشن چراغ کی طرح قائم ہے۔ اور جس کی روشنی سے مہابھارت کی داستان آج تک جگمگا رہی ہے۔ گیتا ایک مختصر سی کتاب ہے مگر ہندو دھرم کی جملہ کتابوں میں اسے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ اس میں شری کرشن جی نے ارجن کے توسط سے ساری دنیا کو "کرم یوگ" (راہ عمل) کے فلسفہ سے روشناس کیا ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں گیتا کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ خود اردو میں اس کے بہت سے ترجمے موجود ہیں۔ کچھ منظوم بھی ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی گیتا کا ترجمہ ہے' اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے "ہندوستانی نظم میں" ہے۔ اس میں جگہ جگہ خالص ہندی اور سنسکرت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں' جنہیں ہندو دھرم اور اس کی اصلاحات سے واقف حلقہ کے لیے عام فہم بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ ارجن کو اُپدیش دیتے ہوئے شری کرشن جی کہہ رہے ہیں ؎

روح اوناشی ہے ارجن اس کو کہتے ہیں امر
یہ جنم لیتی نہیں یہ سناتن سر بسر

مارنے مرنے کا ہے بیکار تیرے دل میں ڈر
جس طرح میلے پھٹے کپڑے بدلتا ہے بشر

اس طرح جسم کے اندر ہے جو بھی آتما
اک بدن کو چھوڑتی ہے روپ لیکر دوسرا

فارسی عطف و اضافت کا استعمال کیے بغیر اردو میں منظوم ترجمہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم "مشقت طلب" کام نہیں ہے۔ مہتاب لپسروری صاحب نے بہرحال اس پابندی کو نبھانے میں کافی محنت کی ہے جس کے لئے مہتاب لپسروری صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔

رفیق شاستری

## بہارستان

پتہ:۔ گورنمنٹ اردو بنیادی ٹریننگ کالج
بالاپور

اس رسالے کی حیثیت 'کالج میگزین' کی سی ہے، پھر بھی اسے ایک وسیع تر حلقے کے لئے مفید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو زبان میں درس وتدریس اور اصول تعلیم سے متعلق بہت کم مواد ملتا ہے۔ فن کی رفتارِ ترقی تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور اردو زبان میں نئی کتابوں کی توقع ایک امید موہوم ہی معلوم ہوتی ہے　اس لئے اردو زبان کے ذریعے پڑھانے والے اساتذہ کی تیاری اور ان کی رہنمائی کے لئے بہارستان جیسے رسالے نہایت مفید اور ضروری خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

اردو کی اس بنیادی خدمت کے لئے گورنمنٹ اردو بنیادی ٹریننگ کالج بالاپور مبارکباد کا مستحق ہے۔ امید ہے کہ رسالے کی کتابت وطباعت کا معیار بلند کرنے کی کوشش کی جائے گی اور طریقۂ تعلیم، اصول تعلیم کے علاوہ دلیس کے موجودہ تعلیمی مسائل کی طرف بھی دھیان دیا جائے گا۔

"معلم"

---

# مطبوعات مکتبہ جامعہ

## (صرف بڑوں کی کتابیں)

### ادب

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| آشفتہ بیانی میری | پروفیسر رشید احمد صدیقی | ۲/۵۰ |
| پردیسی کے خطوط | مجنوں گورکھپوری | ۲/۷۵ |
| پریم چند | ہنس راج رہبر | ۳/۲۵ |
| تذکرہ جگر | محمد علی خاں جامعی | ۳/۰ |
| تنقید کیا ہے؟ | آل احمد سرور | ۳/۷۵ |
| حسرت کی شاعری | ڈاکٹر یوسف حسین | ۱/۰ |
| ذکر غالب | مالک رام ایم اے | ۴/۲۵ |
| غزل سرا | مجنوں گورکھپوری | ۶/۰ |
| کچھ پرانے خط اول | پنڈت جواہر لعل نہرو | ۸/۰ |
| " " " دوم | " " " | ۸/۰ |
| روح تہذیب | خواجہ غلام السیدین | ۰/۷۵ |
| روح اقبال | ڈاکٹر یوسف حسین | ۷/۵۰ |
| گنجہائے گرانمایہ | پروفیسر رشید احمد صدیقی | ۴/۰ |
| محراب غزل | روش صدیقی | ۳/۰ |
| نقد اقبال | مجنوں گورکھپوری | ۴/۵۰ |

### تعلیم

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| بنیادی استاد کے لئے | ڈاکٹر سلامت اللہ | ۴/۲۵ |
| تعلیمی خطبات | ڈاکٹر ذاکر حسین | ۳/۷۵ |
| چند پروجکٹ | عبدالغفار مدہولی | ۲/۵۰ |
| ہم کیسے پڑھائیں | ڈاکٹر سلامت اللہ | ۳/۵۰ |

### ناول، افسانے

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ایک چادر میلی سی | راجندر سنگھ بیدی | ۲/۲۵ |
| بیوہ | منشی پریم چند | ۲/۷۵ |
| باپ بیٹے | ترگنیف | ۵/۰ |
| پرند اور دوسرے افسانے | آصف مجیب | ۱/۵۰ |
| خیالستان | سجاد حیدر یلدرم | ۳/۷۵ |
| دلدل | ڈاکٹر بھبانی بھٹاچاریہ | ۴/۵۰ |
| دانہ و دام | راجندر سنگھ بیدی | ۲/۷۵ |
| دو ہاتھ | عصمت چغتائی | ۳/۵۰ |
| دیا جلے ساری رات | خواجہ احمد عباس | ۲/۵۰ |
| راہ عمل | صالحہ عابد حسین | ۷/۵۰ |
| سات سال | ملک راج آنند | ۵/۲۵ |
| شکست ناتمام | جان اسٹن بک | ۲/۰ |
| کالے صاحب | اوپندر ناتھ اشک | ۲/۵۰ |
| کیمیا گر | پروفیسر محمد مجیب | ۲/۰ |
| گئودان | منشی پریم چند | ۶/۵۰ |
| میدان عمل | " " | ۶/۵۰ |
| نروان | جیلانی بانو | ۴/۷۵ |
| نئی بیماری | مہندر ناتھ | ۲/۵۰ |
| واردات | منشی پریم چند | ۲/۵۰ |
| سپنوں کے قیدی | کرشن چندر | ۴/۰ |

# کچھ ایجنسی کی کتابیں

## ڈرامے

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| اوپر کی منزل | کرتار سنگھ | ۲/۰ |
| آئینۂ ایام | پریسٹلے | ۳/۵۰ |
| آذر کا خواب | بیگم قدسیہ زیدی | ۱/۵۰ |
| بند لفافہ | اشتیاق حسین قریشی | ۱/۳۰ |
| دوسری شام | پروفیسر محمد مجیب | ۰/۷۵ |
| دروازے کھول دو | کرشن چندر | ۲/۵۰ |
| سراج الدولہ | سچن سین گپتا | ۱/۵۰ |
| کھیتی | پروفیسر محمد مجیب | ۰/۷۵ |
| موت پر فتح | جیالال ساز | ۱/۲۵ |
| نفرت کا بیج | اشتیاق حسین قریشی | ۰/۷۰ |
| نقشِ آخر | " " | ۱/۲۵ |
| ہیروئن کی تلاش | پروفیسر محمد مجیب | ۰/۷۵ |

## تاریخ وسوانح

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| تاریخ الامت اول تا ہشتم | مولانا اسلم جیراجپوری | ۲۲/۷۵ |
| امن کا راستہ | عبدالغفار مدہولی | ۳/۰ |
| کشمیر پر حملہ | کرشنا مہتہ | ۲/۰ |
| گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں | | ۵/۰ |

## کچھ زیر طبع کتابیں

اردو مرثیہ اور تاریخ - سید سفارش حسین

پت جھڑ کی آواز (افسانے) قرۃ العین حیدر

باغ وبہار (داستان) میر امن

## ادب، تنقید، انشاء

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| اردو خطوط | شمس الرحمٰن | ۲/۵۰ |
| ادبی رجحانات کا تجزیہ | راجندر ناتھ شیدا | ۲/۵۰ |
| اردو غزل ولی تک | ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی | ۳/۰ |
| آرٹ | سید مجید اللہ | ۳/۰ |
| تلامذۂ غالب | مالک رام ایم اے | ۷/۵۰ |
| تنقیدی آئینے | پروفیسر مشیر علی صدیقی | ۱/۵۰ |
| تعبیر، تشریح، تنقید | پروفیسر مسیح الزماں | ۲/۰ |
| تبرکات آزاد | غلام رسول مہر | ۳/۰ |
| شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں | عبداللطیف اعظمی | ۳/۰ |
| غالب کی نادر تحریریں | خلیق انجم | ۴/۵۰ |
| فکر غالب | پرتھوی چند | ۳/۵۰ |
| فانی | پروفیسر عبدالشکور | ۲/۰ |
| فردوسی ہند | ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری | ۲/۰ |
| لکھنؤ کی پانچ راتیں | سردار جعفری | ۳/۵۰ |
| مضامین رشید | رشید احمد صدیقی | ۴/۵۰ |
| مضامین عابد | ڈاکٹر سید عابد حسین | ۴/۰ |
| مکاتیب غالب | امتیاز علی عرشی | ۴/۰ |
| مطالعے اور جائزے | راجندر ناتھ شیدا | ۲/۵۰ |
| ملفوظات کونگ فوزی کنفوشس | | ۳/۵۰ |
| میرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام | | ۶/۰ |
| مطالعات شبلی | الیس جالب مظہری | ۲/۵۰ |
| میر انیس | سید سفارش حسین | ۲/۵۰ |
| ولی گجراتی | ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی | ۳/۰ |

## نظم

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| اردو شاعری کا انتخاب | ڈاکٹر زور | ۷/۵۰ |
| اوراقِ مصور | سکندر علی وجد | ۷/۰ |
| آتشِ گل | جگر مراد آبادی | ۶/۰ |
| آغوشِ خیال | آزاد گلاٹھی | ۳/۰ |
| اردو مثنوی، | جگن ناتھ آزاد | ۰/۵۰ |
| انتخابِ حالی | سید سفارش حسین | ۲/۲۵ |
| بہارِ طفلی | تلوک چند محروم | ۳/۵۰ |
| بے کراں | جگن ناتھ آزاد | ۴/۵۰ |
| تلخیاں | ساحر لدھیانوی | ۶/۰ |
| جوئے شیر | آنند نرائن ملا | ۵/۰ |
| حدیثِ دل | غلام ربانی تاباں | ۲/۲۵ |
| خلش | سیفی پریمی | ۲/۰ |
| خالی مکان | محمد علوی | ۴/۰ |
| دیوانِ قائم | مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام | ۷/۰ |
| دیوانِ عزلت | " عبدالرزاق قریشی | ۱۰/۰ |
| زخمِ تمنا | مظہر امام | ۳/۰ |
| ستاروں سے ذروں تک | جگن ناتھ آزاد | ۲/۷۵ |
| صدائے دل | ساحر بھوپالی | ۳/۰ |
| صبحِ بنارس | عشرت کرتپوری | ۳/۵۰ |
| فردوسِ گوش | جوش ملیح آبادی | ۶/۰ |
| فروزاں | جذبی | ۲/۲۵ |
| کاروانِ وطن | تلوک چند محروم | ۷/۵۰ |
| کلیاتِ فانی | فانی بدایونی | ۷/۰ |
| کفر و ایماں | ہری چند اختر | ۴/۰ |
| گنجِ معانی | تلوک چند محروم | ۷/۵۰ |
| گردِ راہ | ضیا فتح آبادی | ۳/۵۰ |
| مزامیر دوم | مرتبہ اثر لکھنوی | ۵/۰ |
| میری غزلیں | علی جواد زیدی | ۲/۵۰ |
| متاعِ کلیم • | حکیم احمد آبادی | ۴/۰ |
| متاعِ تسکین | تسکین قریشی | ۳/۰ |
| نئے ترانے | اظہار ملیح آبادی | ۲/۵۰ |
| نو بہ نو | آہ سیتاپوری | ۱/۷۵ |
| نقشہائے رنگ رنگ | رادھے شیام اختر | ۳/- |
| نیرنگِ معانی | تلوک چند محروم | ۵/۰ |
| وادیٔ گل | رفعت سروش | ۳/۰ |
| وطن میں اجنبی | جگن ناتھ آزاد | ۳/۵۰ |
| یدِ بیضا | ساحر بھوپالی | ۳/۰ |
| یادیں | اختر الایمان | ۶/۰ |

## تعلیم

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| اردو املا کا آسان طریقہ، | عبدالغفار مدھولی | ۰/۷۵ |
| تعلیم دینے کا فن | گلبرٹ ہگٹ | ۳/۵۰ |
| کھیل کے ذریعہ (اول دوم) | عبدالغفار مدھولی | ۳/۰ |
| زندگی کا رخ | سعید انصاری | ۲/۰ |
| مدرسۂ ابتدائی کی کہانی | عبدالغفار مدھولی | ۲/۰ |

## ناول افسانے ڈرامے

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| بے ساختہ و بے ضابطہ | وجاہت علی سندیلوی | ۲/۷۵ |
| بازارِ حسن | منشی پریم چند | ۴/۵۰ |
| بارہ آنے | پرویز | ۱/۰ |
| پیاسا راہی | ایم اے نشتہ | ۲/۵۰ |

| کتاب | مصنف | قیمت | کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|---|---|---|
| پردۂ غفلت | ڈاکٹر سید عابد حسین | ۱/۰ | والڈن | ہنری ڈیوڈ تھورو | ۶/۵۰ |
| کھیاں | رشید اختر ندوی | ۳/۵۰ | ولہیلم ماسٹر اول | گوئٹے | ۶/۰ |
| تین ناٹک | ٹیگور | ۷/۰ | ″ ″ دوم | ″ | ۶/۰ |
| جنگل کا راجہ | خان محبوب طرزی | ۳/۰ | ہلاک فریب | کرانسکی | ۳/۰ |
| جاں نثار | بیگم قدسیہ زیدی | ۱/۳۷ | ہندوستان ہمارا | بلونت سنگھ | ۴/۵۰ |
| خالد کی خالہ | ″ ″ | ۱/۷۵ | **متفرق** | | |
| دل سے قریب | انتصار حسین | ۱/۷۵ | اردو مخطوطات اول | نصیر الدین ہاشمی | ۱۰/۰ |
| دو سیر دھان | تکشی شوشنکر | ۲/۵۰ | ″ ″ دوم | ″ | ۱۰/۰ |
| رنگ محل | حمیدہ سلطان | ۶/۰ | بھگوان بدھ | دھرمانند کوسمبی | ۷/۰ |
| زندگی کے کھیل | صالحہ عابد حسین | ۲/۵۰ | تذکرہ امام غزالی | | ۲/۰ |
| سانچ کو آنچ | شوکت تھانوی | ۳/۵۰ | شکاری رائفل | محمد صادق صفوی | ۵/۰ |
| سرکنڈوں کے پیچھے | سعادت حسن منٹو | ۳/۰ | فلسفہ | مولانا آزاد | ۲/۵۰ |
| سمندری لٹیرے | ہنرک السن | ۲/۵۰ | گاندھی جی نے فاقہ کیوں کیا | | ۰/۱۲ |
| شہناز | حبیب اشعر | ۳/۵۰ | مہاتما گاندھی منظوم | | ۱/۵۰ |
| صفیہ | سلمیٰ محبوب | ۴/۰ | لہر لہر ندیا گہری (نظم) | زبیر رضوی | ۳/۰ |
| کامریڈ | والنیئر | ۲/۰ | صدر دفتر | | |
| کھوکھلے انبار | م۔م۔ راجندر | ۲/۰ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ | | |
| گونگے معمار | خورشید عادل منیر | ۱/۰ | | | |
| مٹی کا پتلا | کالندی چرن پانیگراہی | ۲/۰ | شاخ بمبئی | | |
| مٹی کی مورتیں | شری رام ورکس بینی پوری | ۱/۵۰ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳ | | |
| ماں | میکسم گورکی | ۲/۵۶ | | | |
| معصومہ | عصمت چغتائی | ۳/۷۵ | شاخ دہلی | | |
| نمک پارے | سید سخی حسن | ۲/۲۵ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶ | | |
| نقوش | شمارہ مارچ ۵۶ء | ۲/۰ | | | |
| [illegible] | پرویز | ۲/۰ | | | |

# ادبی خبریں

## صبح افسانہ

انجمن ترقی ادب لکھنؤ نے یہ طے کیا ہے کہ ہر ماہ دو ادبی نشستیں کیا کرے گی جس میں اردو داں اور غیر اردو داں دونوں طبقے پوری دلچسپی لے سکیں۔
انجمن کی ادبی نشستیں آٹھ سال سے مسلسل لکھنؤ کے مرکز امین آباد میں واقع ممتاز اسکول میں ہوتی ہیں۔ ان نشستوں میں اردو کے نوجوان ادیب اور شاعر اپنی اپنی تخالیق نذر حاضرین کرتے ہیں۔ ان کی تخلیق پر تنقید کی جاتی ہے۔ اس طرح اردو میں صاف ستھرے ادب پیش کرنے کی کوشش کی جاتی [illegible]
اس سلسلے کی پہلی نشست "صبح افسانہ" ۲۰ ستمبر کو لکھنؤ میں ہوئی۔ صبح افسانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف نوجوان ادیبوں سے شرکت کی درخواست کی گئی۔ اور انھوں نے اپنی ذمہ دار[illegible] کو محسوس کرتے ہوئے اچھے سے اچھے افسانے پیش بھی کیے۔
نشست میں احمد ابراہیم علوی۔ اوصاف احمد۔ رضا عباس جعفری۔ اقبال قدوائی سلمان پرویز۔ اور ریاض قدوائی نے افسانے پڑھے۔
"صبح افسانہ" کا آغاز احمد وصی کی نظم سے ہوا بعد میں بشیر فاروقی، سلمان عباسی علم شبنم وقار رومانی، اور محمود الحسن رضوی نے اپنی اپنی غزلیں اور نظمیں سنائیں۔

## غالب پر انسائیکلوپیڈیا

لکھنؤ .... غالب اکیڈمی کے صدر مولانا خیر بہرا[illegible] نے اعلان کیا ہے کہ غالب کے متعلق انسائیکلوپ[illegible] مرتب کرنے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ مولانا نے کہا کہ وہ اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں تمام ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کریں گے۔ بنارس میں غالب میوزیم بھی قائم کیا جائے گا جس میں غالب کی تصاویر اور دوسری تحریریں وغیرہ رکھی جائیں گی۔

## نصیر الدین ہاشمی کا انتقال

نصیر الدین ہاشمی مولف "دکن میں اردو" کا حیدر آباد (اے۔ پی) میں انتقال ہو گیا۔ نصیر الدین صاحب کافی عرصے سے یورپ کے کتب خانوں میں اردو مخطوطات کے موضوع پر تحقیقات کر رہے تھے اور حال ہی میں انہوں نے سالار[illegible]

سالانہ ایک روپیہ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی | فی پرچہ دس پیسے

پرنٹر پبلشر سید احمد دہلوی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ [illegible]

ماہنامہ
# کتاب نما
نئی دہلی

مینیجنگ ایڈیٹر
غلام ربانی تاباںؔ

ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

جلد نمبر ۵ | دسمبر ۱۹۶۴ء | شمارہ نمبر ۱۲


# اشاریہ

ہمیں خوشی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی میلہ کے موقع پر مکتبہ جامعہ کی طرف سے پیش کیا جانے والا سالانہ ادبی پروگرام "فن اور فن کار" اس سال بھی نہایت کامیاب رہا۔ اس سال اس پروگرام میں، جسے "کاروان غزل" کے عنوان سے جناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے ترتیب دیا تھا، ولی سے مجازؔ تک منتخب مرحومین شعراء کا دلآویز پیرایے میں تذکرہ اور نمونۂ کلام پیش کیا گیا تھا۔ ہم اپنے اعلان کے مطابق اس پروگرام کی مکمل روئداد کتاب نما کے جنوری ۶۵ء کے شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے قارئینِ کتاب نما اسے پسند فرمائیں گے۔

مکتبہ جامعہ کے پریس (لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی) کے لیے بمبئی سے جو خودکار آفسٹ مشین آئی تھی وہ پریس میں نصب ہو گئی ہے۔ ہمیں خوشی ہے مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین، شیخ الجامعہ جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب اس کا افتتاح ۱۲ر دسمبر ۶۴ء کو فرما رہے ہیں۔ مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والا بچوں کا مشہور تعلیمی رسالہ "پیام تعلیم" تو بہت جلد آفسٹ پر چھپنے ہی لگے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری یہ کوشش رہے گی کہ ہم اپنی دوسری عام مطبوعات بھی اس پر چھاپ سکیں اور اس طرح زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے پر ستی ستھری کتابیں پیش کرتے رہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسے میں شیخ الجامعہ نے پنڈت جی کے نام پر ۱۰۰۰/- روپے کے جس انعام کا اعلان کیا تھا وہ انعام مدرسہ ثانوی کے طالب علم سید رضا مہدی نے حاصل کیا ہے۔ اس سلسلے میں ۱۵ر نومبر ۶۴ء کو ایک تقریب میں امیر جامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے یہ انعام رضا مہدی کو عطا فرمایا

فراق گورکھپوری

# شعر اور شاعر

ہر آدمی کو ہر لحظہ بے شمار باتیں یا چیزیں شعوری لیکن زیادہ تو تحت الشعوری طور پر متاثر کرتی رہتی ہیں۔ پھر شعوری تاثرات بھی تحت الشعور میں اتر جاتے ہیں۔ تحت الشعور انھیں تاثرات کا ایک عالم انتشار ہے۔ ان تاثرات کا ہضم ہونا اس حالت میں ممکن ہے۔ جب یہ متوازن اور منظم ہو جائیں۔ اور ان سے ہماری داخلی زندگی میں پوری اکائیاں بنیں۔ یہ تنظیم و توازن و سالمیت جہاں تک شعور محض کا تعلق ہے۔ وجدان کی کارفرمائی سے ہی ممکن ہے۔ ہر آدمی کی داخلی زندگی منتشر، غیر منظم، غیر متوازن، ناقص اور ادھورے تاثرات ایک خاموش ہیجان کے موجب ہوتے ہیں۔ اس کی روحانی زندگی میں بدہضمی کا سارا عالم رہتا ہے۔ جب روح کو پیٹ کی شکایت ہوگی۔ اور وہ بھی تحت الشعوری طور پر زندگی کا توازن، زندگی کا اعتدال زندگی کا سکون و طمانیت، زندگی کی داخلی شگفتگی، زندگی کے نشاط و فرحت سب میں فرق آجائے گا۔ زندگی کو بھی داخلی صحت بخشنا فنون لطیفہ کی غرض و غایت ہے

جن لوگوں کی زندگی پر خارجی ناخوش گواری واقعات اثر انداز نہیں ہوتے جو توانا اور تندرست ہیں، خوش حال ہیں۔ صاحب ثروت و عزت ہیں۔ جن کی گھریلو زندگیاں قابل رشک ہیں۔ ایسے لوگ بھی رہ رہ کے اپنی زندگی میں ایک ناآسودگی، ایک کمی اور ایک بے نام نقص کا احساس کرتے رہتے ہیں۔ اس بے کیفی یا داخلی گھٹن کا سبب وہی داخلی انتشار ہے۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ایسے لوگوں کی اداسی یا ذہنی پراگندگی یا داخلی بے چینی کا علاج فنون لطیفہ ثابت ہوتے ہیں خوش نصیب سے خوش نصیب عاشق کو عشقیہ نغمے سہارا دیتے ہیں۔ پورا انسا تہذیب و تمدن بیمار پڑ جاتا ہے۔ اور ایک بیماری نہیں سیکڑوں بیماریوں کا شکا

ہو جاتا ہے۔

ہر سماج میں حقیقی معنوں میں شاعر و فنکار بہت محدود تعداد میں ہوا کرتے ہیں۔ ان کے اندر داخلی زندگی کے انتشار سے پیدا ہونے والا بحران غیر معمولی طور پر شدید ہوا کرتا ہے پوری انسانیت ایک داخلی انتشار یا پریشان خاطری کا شکار رہتی ہے۔ لیکن یہ انتشار ایک شاعر کے اندر بہت شدید شکل اختیار کر لیتا ہے اور اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
دردِ دل لاکھوں کیے جمع تو دیوان ہوا

ہوتا یہ ہے کہ عام انسانوں کی طرح شاعر کی زندگی کے تاثرات ذاتی دکھ، سکھ ذاتی غم و غصّہ، ذاتی خوش گواری یا ناگواری، ذاتی علم و ادراک تک محدود نہیں رہتے ان سرحدوں کو توڑ کر یہ تاثرات اس کے وجدان یا جمالیاتی احساس کے عالم میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں انتشار تنظیم کی شکل اختیار کرتا ہے۔ غیر ہم آہنگی ہم آہنگی سے بدل جاتی ہے۔ بے سرا پن شعور، شعور محض سے بدل جاتا ہے۔ اس وجود کو حقیقی معنوں میں پایا جاتا ہے۔ جسے انتشار نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ شاعر کی تخلیق سے ہزارہا آدمی جو شعر کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن شعر سے متاثر ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی ہستیوں کو پھر سے جڑتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اور بہت حد تک ان کی زندگیاں بھی پوری اکائیاں بن جاتی ہیں۔ اس بے مثال خدمت کے لیے امیر غریب سبھی یعنی پورا سماج شاعر کی عزت کرتا ہے۔ بظاہر شاعر انھیں کچھ نہیں دیتا لیکن بباطن یعنی شعر کے پردے میں ان کی داخلی زندگی کے تمام زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ شاعر انھیں زندگی کا نسخہ دیتا ہے۔ ان کے ذہن کی دھندلی تصویروں کو واضح کر دیتا ہے۔ شاعری میں ہماری زندگی کے گرد آلود تجربے اپنے حقیقی خط و خال سے روشناس ہوتے ہیں۔ اس آئینہ میں وہ اپنی اصلی صورت پہچان لیتے ہیں۔

زندگی کے خارجی مسائل کا حل شاعری نہیں لیکن داخلی مسائل کا حل ضرور ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ زندگی کے ہر داخلی مسئلے اور بے شمار تاثرات کا جمالیاتی پہلو ایک ہی شاعر دیکھ سکے یا دکھا سکے لیکن مرکزی مسائل و تاثرات کا بہت بڑا حصہ ایک حقیقی اور بڑے شاعر کی آواز میں حل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہر شاعری کا مقصد ہم جو کچھ بھی سمجھیں اس کا حقیقی مقصد بلند ترین وجدانی کیفیت و جمالیاتی شعور پیدا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ کیفیت و شعور اپنی جگہ خود ایک بلند ترین مقصد ہے۔ یہاں تک کہ جدوجہد اور عمل کے متعلق بھی شاعری کا مقصد تحریک و ترغیب عمل نہیں ہے۔ بلکہ عمل کا اور جمالیاتی وجدانی احساس کرانا۔

تو کیا عمل کی دنیا میں شاعری کی کارفرمائی مطلق نہیں؟ شاعری اور دیگر فنون لطیفہ بہ یک وقت ضد عمل ہیں اور رُوحِ عمل ہیں۔ ضدِ عمل تو اس لیے ہیں کہ جیسا اوپر کہا جا چکا ہے ان کی غرض و غایت وجدان جہاں پیدا کرنا ہے۔ لیکن عمل کے بھی تو سیکڑوں پہلو ہیں۔ عمل میں محض کھردری افادیت نہیں ہوتی۔ انسانی عمل میں ایک داخلی ارتقا بھی شامل رہا ہے جو ہماری قوت ارادی میں رعنائی، روشنائی، تربیت یافتگی، لطافت، نرمی و نزاکت اور وجدآفریں محرکات پیدا کرتا ہے۔ اس طرح جمالیاتی شعور براہ راست نہیں مگر بالواسطہ عمل پر اثرانداز ہوتا ہے۔ یہ شعور افادیت کی دنیا کو وسعت، گہرائی، بلندی اور سجاوٹ عطا کرتا ہے۔ قوت ارادی میں اور عمل میں ایک ترتیب و معنویت پیدا کرتا ہے۔ جب قوت ارادی اور عمل جمالیاتی محرکات سے محروم ہو جاتے ہیں تو ان میں اکھڑپن آ جاتا ہے۔ اور تعمیری ترغیبات اکثر تخریبی ترغیبات بن جاتی ہے۔ ہندو دیومالا میں شکتی کی تصویر بہت حسین ہے۔ شہرہ آفاق وزیوں اور ناٹکوں میں ہیرو محض سورما نہیں بلکہ حسین و جمیل بھی ہوتا ہے۔ اس لیے عمل اور جمالیات باہم بے تعلق نہیں ہیں۔

بہت سے مفکروں نے بڑے صنعتی شہروں، کارخانوں، مکانوں، مزدوروں کی چالیوں، کارخانوں میں کام کرنے کے طریقوں، اور اس زندگی کے ماحول و فضا کی بدصورتی کا رونا رویا ہے۔ ان کی یہ تحریریں اسی لیے تو وجود میں آئیں کہ مندرجہ بالا چیزیں دیکھ کر ان کے جمالیاتی تصورات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مفکر نے یہاں تک کہہ دیا کہ فن، اخلاق سے زیادہ بااخلاق یا خلیق ہے۔ یہ سب صحیح ہے لیکن فنونِ لطیفہ کو براہ راست عمل کا ہنگامی نعرہ نہیں بنایا جا سکتا۔ جیسے جیسے رائے عامہ تربیت یافتہ اور منظم ہوتی جائے گی۔ اس کے دباؤ ہی سے وہ بہت سی برائیاں دور ہو جائیں گی جن کے لیے ہم الفت ... اور عمل کے نعرہ لگاتے ہیں۔ عمل بھی

اسی دن صحیح معنوں میں مقصد حیات کی تکمیل کا آلہ بنے گا۔ جب وہ ایک فن بن جائے گا لیکن جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ جمالیاتی تصور کے علاوہ ایسی اہم چیزوں کا جمالیاتی تصور بھی ضروری ہے۔ جن کا تعلق عمل سے نہیں ہے۔ جدید مفکران عالم اب اس طرح کا اظہار خیال کرنے لگے ہیں کہ اگر فنون لطیفہ کی رگِ حیات زندگی سے محروم رہی تو صرف منظم یا افادی عمل یا بلند سے بلند علمی دریافتیں تہذیب کو مکمل نہیں کر سکیں اور زندگی کے نقائص کو دور نہیں کر سکتیں۔

جہاں تک داخلی زندگی کا تعلق ہے۔ حیات انسانی کا غالباً سب سے مرکزی مسئلہ اس کی جنسی زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ اس لیے عشقیہ شاعری، اگر اس میں خلوص کی گہرائی ہو اور انسانی لہجے کی گھلاوٹ ہو۔ سب سے زیادہ اپیل کرتی ہے پھر مناظرت قدرت کی رنگا رنگ اور رنگا رنگ معنویت کی اپیل بھی ہمہ گیر ہوتی ہے۔ اسی لیے ایسی نیچر شاعری میں منظر کشی کے ساتھ ساتھ تخیل کی گہرائی بھی ہو، بہت بلند خیال کی جاتی ہے۔ عشق اور مناظر فطرت کے علاوہ کائنات اور انسانی حیات سے متعلق مرکزی تاثرات بھی ہمہ گیر دلکشی رکھتے ہیں۔ ان موضوعات پر دو طرح سے حقیقی شاعری کی جا سکتی ہے۔ اجمالی طور سے اور تفصیلی یا تخلیصی طور سے یا بہ یک وقت دونوں طریقوں سے پھر وقتی مسائل ـــــ سماجی، اخلاقی، سیاسی ایک ایسا اہم پہلو رکھتے ہیں کہ وہ وقتی اور مخصوص اور محدود ہوتے ہوئے بھی شاعر کے وجدان میں تحلیل ہو کر ہمہ گیر بن جاتے ہیں اور ان پر ابدیت کا سایہ پڑنے لگتا ہے۔ اگر ان موضوعات میں ڈوب کر شاعری کی جائے تو اس کی اپیل بھی ہمہ گیر ہوگی اس طرح کی شاعری میں خطرہ اس بات کا رہتا ہے کہ وہ بڑی حد تک ہنگامیت زدہ ہو کر جانے یا ان مسائل کا شعور یا مکمل طور پر ہی جمالیاتی شعور بن سکے اور ان کی عارفیت ان کی ابدیت پر مسلط اور حاوی ہو جائے۔ بجائے گیان دھیان کے چیخ و پکار کی عمل داری ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ ان موضوعات کے علاوہ سائنس اور فلسفے کی دریافتیں، انسانی عمل کے کارنامے بلکہ خود فنون لطیفہ کے نمونے اور ان کی اہمیت بھی بلند ترین شاعری کے موضوعات ہیں۔ یہاں تک کہ بلند فن کاری اور بلند شاعری، بلند شاعر بھی بلند ترین شاعری کے موضوعات رہے ہیں

یہاں یہ بھی بتادینا ضروری ہے کہ شاعری کرنا نسبتاً آسان ہے۔ لیکن شاعری میں روح شاعری کوٹ کوٹ کر بھر دینا بہت مشکل ہے یہ یاد رہے کہ جو دماغی کاوش سائنس فلسفہ اور دوسرے تمام علوم کے لیے درکار ہے اس سے کم دماغی کاوش کالی داس، شیکسپیر، فردوسی اور دوسرے عالم گیر شعراء کے کارناموں کی تخلیق و تکمیل میں صرف نہیں ہوتی ہے۔

شاعری میں صداقت یا واقعیت کا سوال ایک بہت دل چسپ سوال ہے۔ دنیا کے بڑے شعراء ایک دوسرے کی بازگشت نہیں ہوتے۔ ہر ایک وجدان کی نوک پلک ہوتی ہے۔ اپنے خط و خال ہوتے ہیں، اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ ہر ایک کا اپنا رنگ ہوتا ہے اپنا طرز احساس اور انداز بیان ہوتا ہے۔ ہر ایک کا اسلوب و اظہار الگ ہوتا ہے۔ شعراء مشترک موضوعات پر قلم اٹھائیں تو ان کی شاعری امتیاز کے اہتمام کے باوجود بہ یک وقت صداقت اور واقعیت کی حامل کیسے ہوسکتی ہے؟ اس لیے کہ حقیقت اور شاعر کے شعور کے امتزاج یا میل جول سے تخلیق شعر ہوتی ہے۔ ہر شاعر کا مزاج اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ اس انفرادیت کے آئینے میں حقیقت کی جھلک بگڑ کے نہیں پڑتی بلکہ منور ہو کے پڑتی ہے۔ شاعروں کی مختلف آوازیں سب کی سب سچائی کی آوازیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شاعر کی شاعرانہ شخصیت کی تعمیر و تخلیق ہیں، اس کی داخلی تربیت میں آغاز آفرینش سے آج تک کے تمام زمانے میں نسل انسانی کی مکمل تاریخ کارفرما ہوتی ہے۔ اور سب سے زیادہ کارفرما ہوتا ہے ادب و کلچر کا وہ ورثہ جو شاعر کو مل جائے۔ انفرادیت اگر ہم غور کریں تو سراسر مانگے تانگے کی چیز ہے۔ ہر شاعر کا "میں" ہزاروں "ہموں" سے بنا ہے۔ اس کی شخصیت و انفرادیت حقیقتاً ایک کمپوزٹ فوٹوگراف ہے۔ بلکہ شاعر ہی کا نہیں ہم سب کے جسم تک اپنے مخصوص خط و خال کے باوجود نسل، ملک، زمانہ اور آبا و اجداد کی دین ہیں۔ ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا بھر کی شاعری مختلف المزاج شعر کی تخلیق ہے تو کسی شخص کے لیے اس کے اپنے ذاتی مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ تمام شاعری اور قدر کشش یا اپیل کیوں رکھتی ہے۔ ایک طرف تو نسل و قومیت و انفرادیت کے اختلافات [illegible] کہ تمام شاعری کی عالمگیر [illegible]

دیکھتے ہوئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاعری زبان، قومیت، نسلیت، ملک و ملت یا ایمان و مذہب اور ذاتی مزاج کے حدود توڑ دیتی ہے اور تمام انسانوں کا ورثہ بن جاتی ہے اتنا ہی نہیں بلکہ تربیت یافتہ رائے عامہ عموماً متفقہ طور پر شعراء کے مدارج اور مرتبے بھی متعین کرتی ہے۔ ان کی قدریں متفقاً نکلتی ہیں۔

ہمیں بہت کم شاعروں کے حالات زندگی معلوم ہیں۔ ان کے متعلق کچھ خارجی واردات ہمیں معلوم ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے دل کی سوانح عمری تفصیل سے ہمیں پڑھنے کو نہیں ملتی۔ لیکن اگر ہم شعر سے صحیح طور پر متاثر ہوں تو شاعر کے کلام میں اس کے دل کی سوانح عمری، اس کی وجدانی شخصیت کا ارتقاء ہم دیکھ سکتے ہیں۔ جتنی دیر ہم صحیح معنوں میں کسی شاعر کے کلام سے متاثر رہتے ہیں اتنی دیر تک ہماری شخصیت اس شاعر کی شخصیت بن جاتی ہے۔ من تو شدم تو من شدی والا معاملہ ہے۔ ہر انسان کے اندر پوری انسانی دنیا جی رہی ہے اور شاید پوری کائنات جی رہی ہے۔ ہم شاعر کے کلام سے قریب قریب صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فطرت اور اس کے مناظر زندگی اور اس کے واقعات اور سانحات میں کن کن چیزوں اور باتوں سے شاعر مستقل طور پر متاثر ہوا ہے۔ اور کس انداز سے متاثر ہوا ہے۔

عموماً بلند عشقیہ شاعری کرنے والا شاعر غیر معمولی شدت جذبات و احساسات کے ساتھ عاشق بھی ہوتا ہے۔ لیکن عشقیہ شاعری کرنے والے شاعر یا دوسری قسم کی شاعری کرنے والے شاعر کی خاموش نشو و نما بچپن ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ بچپن ہی سے اس کا مزاج بنتا ہے۔ اسے خود اس کا پتہ نہ ہو کہ آگے پیدا ہونے والے عشقیہ جذبات و رجحانات اس کے اندر پل رہے ہیں۔ جب اسے جنسی محرکات کی خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ ایک طفل معصوم ہوتا ہے۔ اس وقت یہ آہستہ آہستہ اُگنے والے جذبات مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔

والدین کی محبت، بھائی بہنوں کی محبت، ہم جماعتوں اور ہم عمروں کی محبت، کچھ پڑوسیوں کی محبت، کچھ قصے کہانیوں کے کرداروں سے محبت، کچھ خاص مناظر یا مقامات سے محبت کی شکل میں یہ جذبات ایام طفلی میں ظاہر ہوتے ہیں اور جوانی میں غیر معمولی شدت کے ساتھ عشقیہ جذبات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

حقیقی اور پرخلوص عشقیہ شاعری میں شاعر کی مکمل شخصیت اور بچپن کے زمانے ہی سے اس کی زندگی کے تمام ردعمل سمٹ آتے ہیں۔ اگر اس سلسلے میں بہت ہچکچاتے ہوئے اپنی غزلوں، رباعیوں اور کچھ نظموں کا ذکر کردوں تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ بچپن میں مجھے جس قدر شدید اور خلوص لگاؤ گھر یا باہر کے چند لوگوں سے تھا۔ مناظر فطرت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہونے کی حالتیں، موسیقی، نغمہ اور دیگر فنون لطیفہ کا جو مجھ پر اثر پڑتا تھا، جو استعجاب اور محویت خاص موقعوں پر مجھ میں پیدا ہو جاتی تھی۔ جہاں انسان کا غیر معمولی اثر جو میرے دل پر ہو جاتا تھا، کائنات کی پاکیزگی اور اپنے ساتھ اس کی حریت اور مانوسیت کا جو احساس مجھ کو ہوتا تھا، پھر پر عظمت کارنامے میرے لیے جو کشش رکھتے تھے۔ اور جس شدت سے مجھے متاثر کرتے تھے۔ زندگی کے وہ نظریے اور آدرش جو میرے اندر پل اور بڑھ رہے تھے۔ یہ تمام باتیں جو مجھے متاثر کر کے میری تشکیل کر رہی تھیں۔ ان سب کی جھلک میری شاعری کا ایک حساس پڑھنے والا پالے گا۔ اور میرے تجربوں کی آواز سن لے گا اور میرے شعور کی جھنکار اس کے کانوں میں پڑے گی۔

اگر ہم شاعر کے تاثرات کو شاعر کا مذہب کہہ سکیں تو اس مذہب میں ہمیں کچھ خاص باتیں ملیں گی۔ عالم مجاز یا کائنات کی عظمت کا احساس جتنا شاعر یا فنکار کو ہوتا ہے۔ اتنا ہمہ شمہ کو نہیں ہوتا۔ جتنا بڑا شاعر ہوگا، اتنا ہی زبردست اس کا یہ احساس ہوگا۔ شاعر کسی غیر مرئی حقیقت اور اس کے پاک اور لامحدود ہونے کے مقابلے میں محسوسات کی دنیا کا قائل ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی بھی مابعد الطبعیاتی رگ ہو۔ یا اس کی شخصیت میں علیت اور روحانیت کو کم یا زیادہ دخل ہو لیکن اس کی وجدان کو بار بار عالم آب و گل میں اترنا پڑے گا۔ شاعر کے مذہب میں بجائے خدائے پاک کے زمین پاک کا کلمہ پڑھا جاتا ہے۔ مظاہر فطرت پر اس کا ایمان ہوتا ہے۔ گوشت پوست کی زندگی پر اس کا اٹل عقیدہ ہوتا ہے۔ وہ اس کفر کو ایمان کی روشنی اور بلندی دے دیتا ہے اور ایسا کر کے ہی وہ اس ہیجان اور شعوری اور نیم شعوری ہیجان کا علاج کر پاتا ہے۔

(بشکریہ "سویرا" لاہور)

# کچھ پاکستانی ادبی کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| امام الہند | ابو سلمان الہندی | -/۶ |
| ادب و آگہی | مجتبیٰ حسین | -/۷ |
| امریکی ناول اور اس کی روایات | مترجم سید وقار عظیم | -/۵ |
| تلخیص الاردو | مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی | ۵/۸ |
| تذکرہ اولیائے لاہور | محمد وارث کامل | -/۶ |
| جام سرشار | رتن ناتھ سرشار | -/۹ |
| جنس کا جسمانی پہلو | مترجم سید قاسم محمود | ۲/۸ |
| جنس کا نفسیاتی پہلو | 〃 〃 〃 | ۲/۸ |
| جذباتِ نادر مع مثنوی لالہ رخ | مقدمہ مختار حسین | -/۱۰ |
| جینے کی اہمیت | مترجم مختار صدیقی | ۵/۸ |
| سیرت محمد علی | رئیس احمد جعفری | -/۶ |
| محمد رسول اللہ | توفیق الحکیم | -/۵ |
| گلہائے داغ | ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی | ۲/۸ |
| مکتوباتِ عبدالحق | مرتبہ جلیل قدوائی | -/۱۲ |
| روزمرہ آداب | الطاف فاطمہ | -/۲ |
| روایات کی اہمیت | ڈاکٹر عبادت بریلوی | -/۷ |
| خدائے سخن میر تقی میر | ادریس صدیقی ایم اے | ۵/۱۰ |
| علم الکلام اور الکلام (حصہ اول، دوم) | شبلی نعمانی | -/۹ |
| ظہیر الدین بابر اور ان کا عہد | مترجم حسین انور | -/۱۳ |
| مکتوبات شیخ عبدالحق محدث دہلوی | مترجم قاضی احمد عبدالصمد فاروقی | -/۵ |
| ملفوظات آزاد | مرتبہ محمد اجمل | -/۲ |

زبیر رضوی

# تشنگی

زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں
میرے قدموں کی رفتار تھم سی گئی
کوئی رہرو کوئی نقشِ پا بھی نہیں
کوئی شمعِ سرِ رہگذر بھی نہیں
جانے کیا شب کی ویرانیوں نے کہا
میرے ذوقِ طلب میں کمی آگئی
راہ چلتے مسافر کو نیند آگئی

وقتِ آغاز جب شوق کے قافلے
ایک شہرِ تمنا کی جانب چلے
ہم سفر تھے مرے، ہم نظر تھے مرے
کتنے نقشِ قدم، کتنی زلفوں کے خم
کتنے چہروں کی شادابیوں کے چمن
قول، وعدے، تسلی، دلاسے، قسم

زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں
وہ نقوشِ قدم ہیں نہ زلفوں کے خم
عہد و پیماں، دلاسے نہ قول و قسم
قافلے شوق کے کس طرف کھو گئے
یا وہ سب منزلِ آرزو پا گئے

زندگی کون سا موڑ ہے یہ جہاں
میرے قدموں کی رفتار تھم سی گئی
راہ ویران ہے کس کو آواز دوں
کوئی ایسا نہیں جو مری رہگذر
ماہ و انجم کی شمعوں سے روشن کرے
خضر کے روپ میں آئے، آ کر کہے
آ، تجھے منزلِ آرزو سونپ دیں!

---

یہ نظم
زبیر رضوی کے مجموعۂ کلام "لہر لہر ندیا گہری" سے لی گئی

زبیر رضوی کے کلام میں خیالوں کی صحت، جذبات کی شدت، اظہار کا بانکپن اور کیف و رنگ کی فراوانی پوشیدہ ہے۔
"لہر لہر ندیا گہری" زبیر رضوی کے مترنم گیتوں، دلکش نظموں اور پُر اثر غزلوں کا مجموعہ ہے۔
سائز ۱۸x۲۲　صفحات ۱۴۴　مجلد مع عمدہ گرد پوش: قیمت ۳ روپے

کرشن چندر

# شیطان کا استعفیٰ

ایک روز شیطان خدا کے روبرو حاضر ہوا اور سر جھکا کر بولا: "میرا استعفیٰ حاضر ہے۔"

"کیوں کیا بات ہے؟" اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"میں اس کام سے عاجز آ گیا ہوں" شیطان نے تھکے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔ "ہر روز لوگوں کو جہنم کی آگ میں جلانا، لہو اور پیپ کے کڑھاؤ میں اُبالنا، چابک مار مار کر ان کی کھال ادھیڑنا۔ ہر لحہ لوگوں کو گناہوں پر اکسانا۔ کتنا مشکل کام ہے میرا اور جب سے یہ دنیا بنی ہے۔ جب سے یہ کام میں کر رہا ہوں۔ اور اب میں یہ کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ زرا غور کیجیے بارالہٰی سب سے مشکل کام تو مجھے سونپا گیا ہے۔ ورنہ تیرے دوسرے فرشتے تو دن رات جنت کی ٹھنڈی ہوائیں کھاتے ہیں۔ تیری عبادت میں مگن رہتے ہیں۔ اور ہر لحظہ لوگوں کو نیکی کا درس دیتے ہیں۔ کیا عمدہ خوب صورت اور دل چسپ کام ہے ان کا یا خدا، میرے مالک، میرے گاڈ، میرے بھگوان، ربّ عظیم! میں لوگوں کو گناہ پر اکساتے اکساتے تھک کر ٹوٹ چکا ہوں۔ میرا استعفیٰ قبول کر اور مجھے اس روز بروز کے جہنم سے نجات دے۔"

یہ کہہ کر شیطان دوزانو ہو گیا اور خدا کے قدموں میں لیٹ کر گڑگڑا گڑگڑا کر رونے لگا۔ خداوند کریم کے دل میں رحم آ گیا انھوں نے اپنے فرشتوں اور ملائکہ سے مخاطب ہو کر پوچھا: "کیا کہتے ہو تم لوگ!"

شیطان کی آہ وزاری سے فرشتوں کے دل پسیج چکے تھے مگر آگے بڑھ کر کچھ کہنے کی ہمّت کسی میں نہ تھی۔ آخر ڈرتے ڈرتے جبرئیل نے اتنا کہا: "تو رحیم ہے کریم ہے۔ واقعی اس شیطان کو اس کی گستاخی کی سزا مل چکی ہے۔ مجھے اس پر رحم آتا ہے۔"

خدا نے جبرئیلؑ سے پوچھا "کیا تم اس کی جگہ کام کرو گے؟"
جبرئیل نے دست بستہ عرض کی "میں تیرا پیغام رساں ہوں"
میکائیل بولا "میں روزی رساں ہوں"
اسرافیل بولا "میں صور پھونکتا ہوں"
عزرائیل بولا "میں روح قبض کرتا ہوں"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "جو روح قبض کرتا ہے۔ اس کو ہم آج سے جہنم کی نگرانی مقرر کرتے ہیں اور شیطان کو آزاد کرتے ہیں۔ اس کے پر اس کو واپس کر دو۔"

جب شیطان کو اس کے پر واپس مل گئے تو خدا نے اس سے کہا "آج سے تو فرشتہ ہے۔ آج سے تو ہر ایک کو نیکی کا سبق دے گا۔ اس وقت تو سیدھا یہاں سے چلا جا۔ موضع لکشمن پن جہاں کرم دین کسان کی لڑکی 'زہرہ' کا سودا ہو رہا ہے۔ جا کر فوراً اس سودے کو روک دے۔

شیطان نے ایک معمر سفید ڈاڑھی والے بزرگ کا بھیس بدلا اور موضع لکشمن پن میں کرم دین کسان کے گھر پہونچ گیا اور اسے سمجھانے لگا "اگر تم نے اپنی لڑکی بیچی تو تم پر خدا کا قہر نازل ہوگا۔"

"فی الحال تو بنیے کا قہر نازل ہے" کرم دین مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اگر میں اپنی لڑکی نہ بیچوں تو زمین بیچوں گا اور اگر زمین بیچوں گا تو میں اور میری بیوی اور میری پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے کھائیں گے کہاں سے؟ تم نے یہاں کی زمین دیکھی ہے سخت اور پتھریلی اور بھر بھری لال مٹی والی۔ اس زمین میں مکا اور باجرے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ دن رات کی محنت کے بعد بھی ایک وقت فاقہ سے گزرتا ہے۔ اب اگر زمین بھی بیچ دیں گے تو سیدھے سیدھے مر جائیں گے۔ کیا تم پانچ لڑکیوں اور دو لڑکوں اور ایک بیوی کے قتل کے ذمہ دار بننے کے لیے تیار ہو؟"

شیطان نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔

"تو تم مجھے سمجھانے کے بجائے۔ لالہ مصری شاہ کو سمجھاؤ۔ جو ہمارے گاؤں کا بنیا ہے اور جس کے ساڑھے سات سو روپے کا قرضہ واجب الادا ہے۔ اگر وہ قرضہ مجھے معاف کر دے گا۔ تو میں اپنی لڑکی زہرہ کا سودا نہیں کروں گا۔"

شیطان نے اپنے ماتھے پر تلک کا نشان لگایا۔ گیروے رنگ کی ایک دھوتی پہنی کاندھے پر رام نام کا انگوچھا رکھا اور ہاتھ میں مالا لے کر لالہ مصری شاہ کے گھر پہنچ گیا۔ لالہ مصری شاہ اس وقت اپنے گھر کے آنگن میں تلسی کی پوجا سے فارغ ہو کر کھاٹ پر بیٹھے ہی تھے کہ شیطان نے آنکھ جگائی۔

اس کی بات سن کر لالہ مصری شاہ اپنے لہجہ میں مصری گھولتے ہوئے بولے۔

"پنڈت جی آپ کیوں بار بار بھگوان کا نام لے کر مجھے ڈرا رہے ہیں۔ لڑکی کا سودا میں نہیں کر رہا ہوں۔ کرم دین کر رہا ہے۔ اس کی سزا جزا گناہ و ثواب وہ بھگتے گا۔ میں کیا جانوں مجھے ساڑھے سات سو روپے چاہئیں۔ میرا قرضہ واپس کر دے۔ بس وہ جانے اس کا کام۔"

"لیکن اگر تم اس کے ساڑھے سات سو روپے معاف کر دو تو وہ اپنی لڑکی نہیں بیچے گا۔" شیطان نے اسے سمجھایا!

"کس کس کا قرضہ معاف کر دوں۔" بنیے نے اپنی لال کتاب کھول کر اسے دکھائی۔ "یہ چوپڑی دیکھیے۔ سندر داس سے دو ہزار لینا ہے۔ جمّا سے پانچ سو ساٹھ روپے، گورو دیال سے آٹھ سو روپے اور مہتاب رائے تین ہزار کھائے بیٹھا ہے۔ اس گاؤں کے کسانوں پر میرا اکیس ہزار کا قرضہ مع سود کے نکلتا ہے۔ جب سب کو معاف کر دوں گا تو خود کھاؤں گا کہاں سے۔ اور گھر کیسے چلاؤں گا؟"

"تم اور کسی کا قرضہ نہ معاف کرو صرف اس کا کر دو جو تمہارے قرضہ کی وجہ سے اپنی لڑکی کا سودا کرنے پر مجبور ہے۔"

"مجبور تو میں بھی ہوں۔ میں نے دو پن چکیوں کے لائیسنس کی درخواست دے رکھی ہے۔ اور مجھے اس لائیسنس کے لیے ساڑھے سات سو روپے سات دن کے اندر اندر سرکاری خزانے میں داخل کرانا ہوگا۔ کرم دین کسان کی زمین کی قرقی کے کاغذ میرے پاس ہیں۔ اگر اس نے چار دن کے اندر اندر روپیہ واپس نہ کیا تو میں اس کی زمین قرق کرا کے اپنے لائیسنس کا روپیہ بھر دوں گا۔"

شیطان نے مالا جپتے ہوئے کہا۔ "تم کو شرم نہیں آتی لالہ مصری شاہ ان ساڑھے سات سو روپوں کے عوض تم ایک مسلمان لڑکی کو اپنے گھر میں لاؤ گے۔ اپنا دھرم بھرشٹ

کروگے؟"

"رام رام۔ کیسی باتیں کرتے ہو پنڈت جی" لالہ مصری شاہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "میں ایسی قبیح حرکت کی تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لڑکی کو میں اپنے گھر نہیں لا رہا ہوں۔ دراصل اس لڑکی کا سودا خواجہ بدرالدین سے ہو رہا ہے جو لکشمن چپن کے پل پانڈو مت کی دوکان کرتا ہے۔ اس کی چار بیویاں پہلے سے موجود ہیں مگر اس پر بھی وہ اس زہرہ کے لیے ساڑھے سات سو دینے کے لیے تیار ہے۔ سودا صرف اتنا ہے کہ کرم دین ساڑھے سات سو کے عوض خواجہ بدرالدین کو اپنی لڑکی اور کرم دین اپنے قرضہ کے عوض ساڑھے سات سو مجھے دے گا اور میں اپنے لائیسنس کے عوض......"

"بس بس" شیطان گھبرا کر بولا "یہ بتاؤ کیا یہ گندا سودا کسی طرح رُک نہیں سکتا؟"

"خواجہ بدرالدین چاہے تو روک سکتا ہے۔ اس کو پانچویں شادی کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ چار تو اس کے گھر میں پہلے سے موجود ہیں وہ اگر شادی نہ کرے تو یہ سودا آسانی سے رک سکتا ہے۔"

"مگر میں کہاں پانچویں شادی کر رہا ہوں؟"

خواجہ بدرالدین آڑھتی نے شیطان کو سمجھایا "یہ درست ہے کہ میری چار بیویاں ہیں۔ مگر سب سے پہلی عمر رسیدہ ہو چکی ہے۔ گھر کا کام تک نہیں کر سکتی۔ میں اس کے مہر ادا کر کے اس کا خرچہ باندھ کے اس کو الگ کر دوں گا۔ اور تب زہرہ سے شادی کروں گا۔"

"مگر تمہاری عمر پینسٹھ ۶۵ برس کی ہو چکی ہے۔ اس بڑھاپے میں تم کیوں شادی کرنا چاہتے ہو؟" شیطان نے اس سے پوچھا۔

"چاروں بیویوں سے آج تک کوئی لڑکا پیدا نہیں ہوا۔ سبھی لڑکیاں جنتی ہیں۔" خواجہ بدرالدین مایوسی سے بولا "مجھے لڑکا چاہیے اپنا نام لیوا خاندان چلانے والا۔"

"یہ ضروری نہیں ہے کہ زہرہ سے لڑکا ہی پیدا ہو" شیطان نے کہا۔ "اللہ بڑا کارساز ہے۔" خواجہ بدرالدین نے ہاتھ اوپر اٹھا کے کہا۔ "وہ مجھے ضرور میری مراد دے گا۔"

"شیطان نے پھر پوچھا "کیا کسی طرح یہ سودا نہیں رک سکتا؟"

"کیوں زبردستی کا سودا تو ہے نہیں جناب" خواجہ بدرالدین نے کسی قدر تلخی سے کہا "لڑکی بالغ اور جوان ہے۔ اپنا برا بھلا خود سوچ سکتی ہے۔ اگر لڑکی اس شادی کے لیے راضی نہ ہو تو میں یا اس کا باپ اسے شادی کے لیے کبھی مجبور کر سکتے ہیں ؟"

شیطان نے ایک خوب رو۔ گبرو کا بھیس بدلا اور زہرہ سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ جو اس وقت نکی ڈھکی کی بیریوں کے سائے میں ایک ٹھنڈے چشمے کے کنارے بیٹھی ہوئی گھڑا بھر رہی تھی۔ پہلی نظر ہی میں وہ اس گبرو نوجوان پر عاشق ہو گئی۔ اس کے سنہری گالوں پر حیا کی گلابی رنگت بکھر گئی۔ اور وہ لجا کر چشمے میں پڑے ہوئے گھڑے کو اپنی انگلیوں سے گھمانے لگی۔

شیطان نے اسے شادی کا پیغام دیا۔

زہرہ گھڑا گھماتے گھماتے رک گئی۔ نظر بھر کر اس نے نوجوان کی طرف دیکھا پھر اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور بڑی کمزور آواز میں بولی۔

"کیا کام کرتے ہو ؟"

"کچھ نہیں کرتا" شیطان بولا ! "خدا کا نام لیتا ہوں !"

"خدا کا نام تو سبھی لیتے ہیں" زہرہ اداس ہو کر بولی "پھر تم مجھے کھلاؤ گے کیسے ؟"

"ہم دونوں مل کر محنت کریں گے !"

"محنت تو میں نے ہمیشہ کی ہے۔ اپنے ماں باپ کے گھر میں اور کھیتوں میں۔ آج تک دن رات محنت کرتی آئی ہوں اور اس محنت نے مجھے پھٹے چیتھڑے اور ایک وقت کا فاقہ دیا اس محنت سے اب عاجز آچکی ہوں"

شیطان دیر تک چپ رہا۔ پھر آہستہ سے بولا "زہرہ تم جوان اور خوبصورت ہو ذرا سوچو تم اس پینسٹھ برس کے بڈھے سے شادی کر کے خوش رہ سکو گی۔ کیا تمھاری روح کو اس امر سے اطمینان ہو گا کہ تم ایک انسان ہو کر چاندی کے چند سکوں کے عوض فروخت کی جا رہی ہو ؟"

"وہ مجھے گھر دے گا، دو وقت پیٹ بھر کے روٹی تو دے گا" زہرہ کا چہرہ امید سے کھل گیا۔

"مگر وہ بڈھا بدصورت پینسٹھ برس کا..........!"

شیطان نے زہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: "ذرا سوچو تم اس سے کیسے خوش رہ سکو گی؟"

زہرہ نے آہستہ آہستہ اپنی لانبی لانبی پلکیں اوپر اٹھائیں اور شریر نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "خوش ہونے کے لیے میں کبھی کبھی تم سے مل لیا کروں گی۔ آؤگے نا مجھ سے ملنے کے لیے چھپ کے؟"

زہرہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اپنا سینہ اس کے سینے پر رکھ دینا چاہا مگر شیطان جلدی سے ہاتھ چھڑا کے وہاں سے بھاگ گیا۔

وہ تھانے دار گوردیال سنگھ کے پاس پہنچا اور اس سے کہنے لگا: "میں ایک شریف شہری کی حیثیت سے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس سودے کو روک دیجیے اور ایک لڑکی کی زندگی تباہ ہونے سے بچا لیجیے۔ تھانے دار صاحب! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ موضع لکشمن تین کا کسان کرم دین اپنی لڑکی کا سودا خواجہ بدرالدین سے کر رہا ہے۔ ساڑھے سات سو روپے لے کر وہ اپنی لڑکی کی شادی خواجہ بدرالدین سے کر دے گا۔ اور زہرہ کو پاکر خواجہ بدرالدین ساڑھے سات سو روپے کرم دین کو دے گا۔ جو یہ ساڑھے سات سو روپے لے کر لالہ مصری شاہ کو دے کر اپنی زمین چھڑا لے گا۔ کیا انسان کی روح اب مربوں اور بیگھوں کی صورت میں بیچی جائے گی۔ اخلاقی اعتبار سے یہ سودا غلط ہے۔ مذہبی اعتبار سے یہ گناہِ عظیم ہے۔ قانونی اعتبار سے بھی یہ جرم ہے۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں آپ اس علاقہ کے تھانے دار ہیں۔ آپ اس کے خلاف قانون سودے کو روک دیجیے۔"

"میں ہرگز نہیں روکوں گا"۔ تھانے دار نے شیطان کو سمجھایا۔ "مجھے سارا قصہ معلوم ہو چکا ہے اور میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ جب زہرہ کا نکاح خواجہ بدرالدین سے ہوگا۔ اس سے چند منٹ قبل خواجہ بدرالدین ساڑھے سات سو روپے اپنے ہاتھ سے اپنی ہونے والی بیوی کے ہاتھ میں دے گا۔ زہرہ وہ رقم لے کر اپنے باپ کے ہاتھ میں دے گی۔ نکاح کے بعد وہی رقم لے کر کرم دین لالہ مصری شاہ کے پاس جائے گا۔ اور وہی ساڑھے سات سو روپے دے کر اپنا قرضہ چکائے گا مگر

ہرے آدمی خواجہ بدرالدین کے نکاح کے وقت موجود ہوں گے۔ اور جو روپیہ خواجہ بدرالدین
ں سودے کے عوض دے گا۔ اس پر پہلے سے ہمارے خفیہ نشان بنے ہوں گے۔ پس
ب نکاح ہو جائے گا۔ تو میں ایک ہی ہلے میں سب کو گرفتار کرلوں گا اور ان پر
ختر فروشی کے سلسلے میں مقدمہ چلاؤں گا۔"

"مگر آپ مقدمہ کیوں چلاتے ہیں" شیطان نے پریشان ہو کر کہا۔ "آپ اس
خلاف قانون حرکت کو عمل میں آنے سے پہلے ہی کیوں نہیں روک دیتے۔"

"بڑے چغد ہیں آپ!" گوردیال سنگھ تھانے دار نے جھلا کر کہا "میں ایسا احمق
نہیں ہوں کہ اتنے بڑے مقدمے کو یوں آسانی سے ہاتھ سے جانے دوں۔ جس میں خواجہ بدرالدین
اور مصری شاہ اور کرم دین اور زہرہ کو میں ایک ساتھ لپیٹ میں لے سکوں۔ خواجہ بدرالدین
سے میں کم سے کم دو ہزار روپیہ رشوت میں لے سکوں گا۔ اور اتنی ہی رقم لالہ مصری شاہ سے
اینٹھ لوں گا۔ پھر میں نے سنا ہے کہ زہرہ بہت خوب صورت لڑکی ہے......"

"مگر یہ تو گناہ ہے" شیطان نے گھبرا کر کہا۔

"ان چار ہزار روپوں سے میں اپنی لڑکی کی شادی کر سکوں گا۔ بڑی بچی کی
شادی ایک عرصہ سے رکی ہوئی ہے۔ مجھے اس کے جہیز کے لیے معقول رقم چاہیے۔
اب ایک ہی ہلے میں سب بندوبست ہو جائے گا۔"

"ایک لڑکی کی شادی کے لیے آپ دوسری لڑکی کی زندگی تباہ کریں گے۔
یہ تو پاپ ہے۔"

"اور شہرت الگ ملے گی جناب!" تھانے دار نے شیطان کو سمجھایا "اتنا بڑا مقدمہ
آج تک اس علاقہ میں کسی تھانے دار کے ہتھے نہ چڑھا ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ میں اس
مقدمہ کی کامیابی کے بعد انسپکٹر بنا دیا جاؤں۔"

"مگر یہ تو جرم ہے" شیطان چلایا۔

"آپ بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہیں!" تھانے دار نے گرج کر پوچھا۔

"میں خدا کا بندہ ہوں" شیطان نے عاجزی سے سر جھکا کر کہا "لوگوں
کو نیکی کا درس دیتا ہوں!" تھانے دار نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ سات دن
کے بعد حوالات سے چھوٹ کر شیطان خدا کے حضور میں پہنچا اور اپنے عہدہ واپس کرنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" اللہ تعالیٰ نے پوچھا۔

شیطان نے کہا "میں نے سوچا تھا کہ میرا کام سب سے مشکل ہے۔ اور فرشتوں کا کام سب سے آسان ہے۔ اب معلوم ہوا کہ میرا کام سب سے آسان ہے۔ اور فرشتوں کا کام سب سے مشکل ہے۔ اس لیے میں اپنا استعفیٰ واپس لیتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ مجھے فوراً جہنم میں بھیج دیا جائے۔

(یہ افسانہ کرشن چندر کے نئے افسانوں کے مجموعے "سپنوں کا قیدی" سے لیا گیا)



## شراب کہنہ

# حالؔی

۱۸۳۶ء ــــــــــــ ۱۹۱۴ء

الطاف حسین نام، حالؔی (اور کچھ دن کے لیے خستہ) تخلص۔ باپ کی طرف سے شیخ انصاری اور ماں کی طرف سے سیّد۔ پانی پت میں پیدا ہوئے تھے، ان کے مورث اعلیٰ خواجہ ملک علی، جو اپنے دور کے مشہور عالم تھے، ہرات سے سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہندوستان آئے اور حکومت کی جانب سے پانی پت کے قاضی مقرر ہوئے۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش کا انتقال اس وقت ہوا جب حالؔی کی عمر صرف نو سال کی تھی۔ ماں پہلے ہی سے ایک دماغی عارضے میں مبتلا تھیں۔ ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے بڑے بھائی اور بڑی بہن کی نگرانی میں ہوئی۔ پہلے قرآن حفظ کیا اس کے بعد فارسی اور عربی کا درس شروع ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں شادی کر دی گئی۔ تعلیم حاصل کرنے کی دھن میں گھر والوں کو بتائے بغیر دہلی چلے آئے۔ ایک سال یہاں رہ کر تحصیل علم کر پائے تھے کہ عزیزوں نے اصرار کر کے وطن بلا لیا۔ انھوں نے اپنا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے ہی میں صرف کیا۔

۱۸۶۳ء میں حالؔی کو نواب شیفتہ کے ساتھ ان کے مصاحب اور ان کے منجھلے بیٹے کے اتالیق کی حیثیت سے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں حالؔی کی بہت سی صلاحیتوں کا لوگوں کو علم ہوا۔ مرزا غالب (جنھوں نے ۵۵-۱۸۵۴ء میں حالؔی کو شعر کہتے رہنے کی ترغیب دی تھی) سے باضابطہ تلمذ کا بھی یہی زمانہ تھا۔

شیفتہ کی وفات کے بعد ۱۸۷۰ء میں حالؔی لاہور پہنچے اور چار سال تک سرکاری بک ڈپو میں قابل اشاعت کتابوں کی درستی زبان کا کام انجام دیتے رہے۔ پھر عربک اینگلو کالج دہلی میں آ کر عربی فارسی کے مدرس اول مقرر ہو گئے۔ یہیں سر سید احمد خاں سے ملاقات ہوئی اور ان کی تحریک پر ۱۸۷۹ء میں "مد و جزر اسلام" (مسدس حالی)

قلم بندگی پر ۱۸۹۱ء میں جب ریاست حیدرآباد سے سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر ہو گیا تو مستقل طور پر وطن (پانی پت) میں آکر اقامت پذیر ہو گئے اور آخر وقت تک علم و ادب کی گراں بہا خدمت میں مصروف و منہمک رہے۔

اُردو کے کم ہی ادیب اور شاعر ایسے ہیں جن کو حالی کے برابر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ بہ یک وقت بہترین نثار اور لاجواب شاعر تھے۔ آج بھی ان کا نام اور کلام بچّے بچّے کی زبان پر ہے۔ ان کا سا خلق و کرم اور انکسار بھی کم ہی لوگوں کے نصیب میں آیا ہوگا۔ انھوں نے اپنی کسی کتاب کے حقوق نہیں محفوظ کرائے۔ قوم کی پستی اور طبقہ نسواں کی بے چارگی کو جس درد کے ساتھ انھوں نے محسوس کیا اور جس خلوص اور تاثر کے ساتھ اس کو ظاہر کیا ہے اس کی مثال ان کے دور کے کسی ادیب یا شاعر کے یہاں نہ مل سکے گی۔

قدیم ماحول اور معاشرے کے پروردہ اور تربیت یافتہ ہونے کے باوجود انھوں نے بڑی فراخ دلی، وسعت نظر اور جسارت کے ساتھ اُردو شاعری کے نقائص واضح کیے۔ مولوی محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کر نئی اور بامقصد شاعری کی بنیاد ڈالی۔

حیات سعدی، یادگار غالب، حیات جاوید اور مقدمہ شعر و شاعری ان کے عظیم نثری کارناموں میں شمار ہوتے رہیں گے۔ دیوان، مسدس اور نظموں کے متعدد مجموعے اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اردو کے صفِ اوّل کے شعرا میں سے ہیں۔

## انتخاب

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کوئی آسماں نہ تھا

عشق سنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

یارب طلب وصل ہو، یا ہو طرب وصل
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں، وہ دن نہ دکھانا

افسوس! کہ غفلت میں کٹا عہد جوانی
تھا آب بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا

تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اک خوشی ہو گئی ہے، تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل
کیا اعتبار زندگیٔ مستعار کا

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت — نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی، گُلِ تر کی صورت
تعزیرِ جرمِ عشق ہے، بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

---

اب بھاگتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم — کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے، کچھ آسماں سے ہم
دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں — تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر — بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

---

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر — تھا اس کو ربط ہم سے مگر اس قدر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں

---

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازیِ شبِ ہجراں میں نہیں
اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی — عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں — بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت — ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

---

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
نہ واں پُرسش نہ یاں تابِ سخن ہے — محبّت ہے کہ دل میں موجزن ہے
عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی! — مگر یادِ عزیزاں راہ زن ہے
[illegible]

# معیاری ڈرامے

| | | |
|---|---|---|
| انار کلی | امتیاز علی تاج | ۳/۵۰ |
| اجالے سے پہلے | ابراہیم جلیس | ۲/۵۰ |
| آذر کا خواب | قدسیہ زیدی | ۱/۵۰ |
| بند لفافہ | ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی | -/۳۱ |
| تین ناٹک | رابندر ناتھ ٹیگور | ۷/- |
| جان ہار | قدسیہ زیدی | ۱/۳۷ |
| ٹیگور کے ڈرامے | خلیل احمد | ۳/- |
| خالد کی خالہ | قدسیہ زیدی | ۱/۷۵ |
| دوسری شام | پروفیسر محمد مجیب | -/۷۵ |
| دروازے کھول دو | کرشن چندر | ۲/۵۰ |
| دل سے قریب | انتصار حسین | ۱/۷۵ |
| دشمن | ریوتی سرن شرما | ۵/- |
| سراج الدولہ | سچین سین گپتا | ۱/۵۰ |
| کربلا | منشی پریم چندر | ۳/- |
| کھیتی | پروفیسر محمد مجیب | -/۷۵ |
| کنگ لیئر | مجنوں گورکھپوری | ۵/- |
| موت پر فتح | جیالال ساز | ۱/۷۵ |
| مزاحیہ ڈرامے | خلیل احمد | ۲/۲۵ |
| نئے دھندے | ابرار الرحمٰن قدوائی | -/۷۵ |
| نئے ڈرامے | ڈاکٹر محمد حسن | ۵/- |
| نقشِ آخر | اشتیاق حسین قریشی | ۱/۷۵ |
| نفرت کا بیج | " " " | -/۷۰ |
| ہیروئن کی تلاش | پروفیسر محمد مجیب | -/۴۳ |

# نئی مطبوعات

| کتاب | مصنف | قیمت | ناشر |
|---|---|---|---|
| ملن (ناول) | نریندر شرما | ۳/۵۰ | آشا پاکٹ بکس، دہلی |
| سرقہ اور توارد (ادبی) | نریش کمار شاد | ۲/۲۵ | نیو تاج آفس، دہلی |
| آسمان روشن ہے (ناول) | کرشن چندر | ۲/۷۵ | ایشیا پبلشر، دہلی |
| دسواں پُل (افسانے) | ” ” | ۴/- | ” ” ” |
| خواجہ میر درد (ادبی) | قدیر احمد | ۷/۵۰ | مکتبہ شاہرہ، دہلی |
| جذبۂ دل (ناول) | معین شاہد | ۶/- | شمع بک ڈپو، دہلی |
| اُردو زبان اور عورت (ادبی) | وحیدہ نسیم | ۳/۲۵ | تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی |
| گرد بار (ناول) | مظہر الحق علوی | ۱۰/- | نسیم بک ڈپو، لکھنؤ |
| سونا سمندر ” | ” | ۸/- | ” ” ” |
| پرایا دھن ” | نسیم انہونوی | ۸/- | ” ” ” |
| کس کا شکوہ ” | رضیہ صلاح الدین | ۴/- | ” ” ” |
| تلمیحات (لغت) | محمود نیازی | ۶/- | ” ” ” |
| مکتوبات امیر مینائی (ادب) | احسن اللہ خاں ثاقب | ۵/- | ” ” ” |
| رزم نامہ دبیر ( ” ) | حیدر لکھنوی | ۴/۵۰ | ” ” ” |
| غالب سے معذرت کے ساتھ (مزاح) | احمد جمال پاشا | ۳/۵۰ | ” ” ” |
| دیدہ بینا (ادب) | کوثر چاندپوری | | ” ” ” |
| عذرا (ناول) | خلیل الرحمٰن | ۲/۲۵ | کتابی دنیا، لکھنؤ |

## زیر طبع

| کتاب | | مصنف | ناشر |
|---|---|---|---|
| راہیں پیار کی | (ناول) | ایم۔ جے۔ عالم | نسیم بک ڈپو، لکھنؤ |
| مرنجی جانباز | ” | ” ” ” | ” ” ” |
| مطالعہ امیر | (ادب) | ابو محمد سحر | ” ” ” |
| شیلا | (ناول) | سید سخی حسن | ” ” ” |
| زیبا | ” | بیگم افتخار | ” ” ” |

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

# جائزے

## سپنوں کا قیدی

افسانہ نگار: کرشن چندر
صفحات: ۱۶۰ سائز $\frac{20\times30}{16}$
قیمت: تین روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵
(سن اشاعت جولائی ۱۹۶۴ء)

کرشن چندر کے زیرِ نظر مجموعے میں گیارہ افسانے شامل ہیں۔ ان میں ساتواں افسانہ "سپنوں کا قیدی" ہے۔ اس کہانی کی رعایت ہی سے مجموعہ کا یہ نام تجویز ہوا ہے۔

کہانی اور کتاب دونوں میں "سپنوں کا قیدی" اس مفہوم کو پیش نہیں کرتا جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ ایک نفسیاتی اشاریہ ہے۔ افسانوں کے مطالعہ سے قاری کو اس امر کا بخوبی احساس ہو سکے گا۔

کرشن چندر نے ان کہانیوں میں سیاسی مسائل، جنسی الجھن، نفسیاتی پہلو انسان دوستی، عالم لاشعور، تہذیبی شعور اور تحلیل نفسی وغیرہ کو اپنے فن اور تکنیک کی محبوبیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"گونگے دیوتا" مختصر ترین افسانہ ہے جس میں ایک نامراد کسان کی اندھی عقیدت اور اس کے ردِّعمل کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قاری کا ذہن اس سے ضرور متاثر ہو گا۔

مجموعے کی پہلی کہانی "شہزادہ" ہے اس میں ہماری آج کی زندگی کے کئی نقوش ملتے ہیں مثلاً تعلیم اور معیار زندگی بڑھنے سے متوسط اور نچلے متوسط طبقے میں اقتصادی دباؤ کو بری طرح محسوس کیا جا رہا ہے۔ رفیقۂ حیات کے انتخاب میں حسن سیرت سے زیادہ حسن صورت اور اقتصادی آسودگی کو بہتر ازدواجی زندگی کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ جنسی جذبہ محبت میں تبدیل ہو کر زندگی میں ہر قربانی پر آمادہ کر سکتا ہے۔ یہ بہت اچھی اور موثر کہانی ہے لیکن ایک مقام پر افسانہ نگار

ہیروئن "سدھا" کو اپنی زبان دے دیتا ہے :- ص ۲۹ "اور میری کوکھ کے بچے مجھے دور ہی سے بلاتے رہے اور میں کسی کے پاس نہ گئی۔ تمھارے خیال کو حرزِ جاں بنائے ہوئے اپنے کنوارپنے کے چالیس سال، آنکھیں، کان اور ہونٹ بند کر کے تمھاری آرزو میں بتا دیے "

(تمھارے خیال کو حرزِ جاں بنائے ہوئے) ــــ افسانہ نگار کی زبان ہے ــــ

اس کتاب کے بعض افسانے ہمارے جذبات کو چھوتے ہیں اور بعض ذہن پر دیرپا نقش چھوڑتے ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے زیادہ اپیل "مس لوورٹ" میں ہے۔ کرشن چندر کے فن اور تکنیک کا حسن اس کہانی میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ "نائی ایسری" سے مشرقی تہذیب کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اخلاقی ذمّہ داری کا احساس ملتا ہے اور قومی یکجہتی کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔

"سپنوں کا قیدی" میں طبقاتی ذہن، جنسی رشک اور ازدواجی زندگی کی محبت کے دھارے ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ قاری کو یہ بھی محسوس ہوگا کہ آج "ریستوران" بھی ہماری زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ وہاں کام کرنے والے لڑکے "آرڈر" کی زبان اور نوعیت سے ہمارے موڈ اور نفسیاتی الجھن کی پہچان کر لیتے ہیں۔

کہانیوں کے اس مجموعے میں فن، شخصیت اور نقطۂ نظر کی حسین آمیزش ملتی ہے۔ کتاب نہایت عمدہ چھپی ہے۔ اس تخلیق کو منظرِ عام پر لانے کے لیے افسانہ نگار اور ناشر دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔　　(سیفی پریمی)



## غفور میاں

(سن اشاعت مئی سنہ ۶۴ء)

مصنف : تخلص بھوپالی
صفحات : ۱۶۲　سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ مجلد
قیمت : دو روپے ۷۵ پیسے
ناشر : پنج بھون پبلیکیشنز، جہانگیر آباد بھوپال

"غفور میاں اہلِ بھوپال کا محبوب کردار ہے۔ غفور میاں ایک خود رو کردار ہے۔ غفور میاں نہ تو جوکر ہیں نہ بھانڈ بلکہ سیدھے سادے خان صاحب ہیں جنھیں الحمد اللہ ابھی تک نئی روشنی کی ہوا تک نہیں لگی" یہ جملے تخلص بھوپالی نے غفور میاں کو متعارف

کراتے ہوئے اپنے ابتدائیہ "ایں چیزے دیگر است" میں تحریر فرماتے ہیں۔ اس کے بعد اٹھارہ مختلف مضامین کے ذریعہ غفور میاں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

یہ وہی تخلص بھوپالی ہیں جو 'پوسٹ مارٹم' اور 'شیطان جاگ اٹھا' کے علاوہ 'پاندان والی خالہ' کے دو حصے بھی تصنیف کر چکے ہیں۔ وہ ایک نڈر اور بے باک طنز نگار ہیں جو رواں قلم کے ساتھ ساتھ بیداری ذہن بھی رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں کا تار و پود اگرچہ بالکل مقامی ہوتا ہے لیکن وہ حقائق و مسائل پر کمندیں ڈالتی نظر آتی ہیں۔

'چچا چھکن' 'مرزا جی' جیسے کرداروں کے سامنے 'غفور میاں' "قصباتی" ضرور نظر آتے ہیں لیکن ان کی اپنی ایک سج دھج ہے، ایک مخصوص لب و لہجہ زبان و بیان ہے۔

"کبھی کبھار تجھ سے کوئی 'اڑے بھڑے کام کا کہو تو خان شبراتی وہ ہاتھ پاؤں پٹکتا ہے تو کہ جیسے بس جان نکلی جارہی ہے" صفہ ۲۱ "اشرافوں میں بیٹھنا اور بات ہے اور اشرافوں جیسی بات کرنا اور بات ہے۔ خاما خئیں کو پنجار گردی کر رہا ہے' صفہ ۶۹ 'یاران سے کہنا سیر ایک بھر خالص گھی چاہیے' صفہ ۱۲۱ 'تاریخ' کا اڑخنجا' صفہ ۶۶ 'بتی دینا' صفہ ۱۰۰ 'ٹولے پھینکنا' صفہ ۱۱۹ 'دھگانہ کی رسم صفہ ۱۱'

ہمیں غفور میاں کی حرف گیری کرنے کا خیال نہیں آنا چاہیے۔ وہ تو 'اگلے وقتوں کے لوگ ہیں' اور وہ بھوپال کے۔ لیکن ان کی بات 'یاد رفتہ' کا مزا لیے ہے اور ان کی ذات میں موجودہ معاشرے کی بے رحمی کے گھاؤ صاف نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی خبط الحواسی اور جہالت کے باوجود ایک معصومیت اور جاذبیت لیے ہوئے ہیں۔ ان سے ملاقات کر کے عبرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی۔

(عبداللہ ولی بخش قادری)

✡

## پھول اور سموم

مصنف: برونو اپیتز
مترجمہ: رضیہ سجاد ظہیر
صفحات: ۳۴۰ قیمت ۵/۵۰
ناشر: نئی روشنی پرکاشن، گردوارہ روڈ نئی دہلی

کی جاں گداز تصویر پیش کرتی ہے، یہ ناول ہے جو اس لیے حوصلہ بخش کہا جا سکتا ہے کہ اس میں مظلوم قیدیوں کے اس عزم کی بھرپور جھلک ہے جو مصیبت کی تاریک راتوں میں صبح کا پیغام دیتا ہے۔ اس کے مصنف خود کنسنٹریشن کیمپ کے قیدی رہ چکے ہیں اس لیے یہ کہانی سچی اور زندہ ہے اور اس میں تجربے کی وہ حقیقت پورے طور پر موجود ہے جو کسی بھی داستان کو اثر انگیز اور سبق آموز بنا دیتی ہے۔ لیکن اس ناول کا سب سے زیادہ روشن اور زندگی بخش پہلو یہ ہے کہ اس میں زندگی سے اتھاہ پیار کا جذبہ پورے طور پر موجود ہے۔ ایک ننھا سا معصوم بچہ پولینڈ کے ایک قیدی کے سوٹ کیس میں کیمپ میں پہنچ جاتا ہے یہ بچہ خود دنیا کے وجود کا سبب ہے، زندگی کی علامت ہے اور انسان کا مستقبل ہے، اس کی حفاظت کے لیے تمام کیمپ متحد ہو جاتا ہے۔ یہ اتحاد جرمن عوام کا اٹل ارادہ اور مصیبت میں بھی زندگی کی روشن علامت کو زندہ رکھنے کا عزم ایک مقصد ہے اور اس ناول سے اس مقصد کو تقویت ملتی ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر نے اردو میں اس ناول کو منتقل کرکے ادب اور انسانیت کی خدمت کی ہے، ترجمہ اچھا اور موثر ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی

## چند ادبی مسائل

مصنف: پروفیسر شاہ مقبول احمد
صفحات: ۱۷۴ سائز $\frac{30 \times 20}{16}$
قیمت: درج نہیں
ناشر: مکتبۂ صنم، سبزی باغ، پٹنہ ۴

اس کتاب میں شاہ مقبول احمد کے آٹھ مضامین کے علاوہ، ان کی مختصر سوانح حیات بارھویں صدی ہجری کے ایک شاعر سلیم عظیم آبادی کا تذکرہ اور نمونہ کلام بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں محفوظ ایک بیاض سے واسوخت آبرو کی نقل اور بہار کے چند ٹھیٹھ دیہاتی محاورے بھی شامل ہیں۔

ابتدائی چار مضمون زبان کے مسئلے سے متعلق ہیں۔ ہمارے ہاں سیاسی مصلحتوں کی بناء پر زبان کو بھی سیاست کا آلۂ کار بنایا گیا ہے۔ اردو زبان بھی اس کا شکار ہوئی اور اس پر کئی الزام لگائے گئے۔ شاہ صاحب نے ان الزامات کی تردید میں زبان کے

مسئلے کو لسانی اور سماجی حیثیت سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ دو مضمون ایسے ہیں جن پر نظر ثانی کی ضرورت تھی۔ "اردو یا ہندوستانی" ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا۔ اس میں اردو کی لسانی حیثیت سے جو بحث کی گئی ہے، جدید لسانی تحقیقات کی روشنی میں اس میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ اردو کے مایۂ ناز ادیب منشی پریم چند کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے "اس موقع پر ۱۹۳۰ء کے ایک منشی پریم چند صاحب ہمیں یاد پڑتے ہیں ......" منشی پریم چند کا تعارف اس طرح کس قدر کھٹکتا ہے۔

باقی چار مضمون مختلف نوعیت کے ہیں، "کلکتے کے ادیب و شاعر" "بہاری ماحول اور اردو ادب" "جمیل مظہری کے بعض افکار" "میر تقی میر کی شاعری کے بعض پہلو" ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب نے اردو ادب کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے اور دیانت داری کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جن سے کہیں کہیں اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کو آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ کاغذ، کتابت طباعت معمولی ہے۔ (تحسین صدیقی)



## بھارت کی کہانی بھارت کی زبانی

از: محمد قاسم صدیقی ایم اے۔ بی ایڈ (علیگ)
صفحات: ۴۴ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$
قیمت: ۷۵ پیسے
ناشر: احباب پبلشرز، اقبال منزل مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ

تاریخ کی کتاب لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس طرح سے کہ جو جی چاہا اور جس طرح جی چاہا لکھ دیا۔ مشکل اس اعتبار سے کہ ایک مورخ اور تاریخ نگار کی حیثیت سے جو ذمے داریاں مصنف پر عائد ہوتی ہیں ان کا لحاظ رکھتے ہوئے حقیقت نگاری کے ساتھ تاریخی حقائق کو بیان کر دیا جائے۔

صدیقی صاحب نے مشکل میں آسانی پیدا کرنے کی مفید اور تعمیری کوشش کی ہے اور بھارت کے بچوں اور بالغوں کو "بھارت کی کہانی بھارت کی زبانی" پیارے، سادہ، بامعنی اور دل کش انداز میں سنائی ہے۔ یعنی ہندوستان خود اپنی کہانی کہتا ہے جس میں پرانی تہذیب سے لے کر آج تک کا ذکر موجود ہے۔ جدید ہندوستان کے معماروں کی

حیثیت سے گاندھی جی، ٹیگور، مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کی تصاویر اور ان کا ذکر بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ اور اب اس کا نیا روپ کیا ہے اس کی بھی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔

انداز بیان اچھا ہے۔ زبان سادہ اور عام فہم استعمال کی ہے۔ روانی کو آخر وقت تک قائم رکھا ہے۔ تصاویر اور توضیحات سے بھی کام لیا ہے۔

اُمید ہے کہ بچے اور بوڑھے سب ہی کو یہ کتاب پسند آئے گی۔

(سید منیر الحسن)

# ادبی خبریں

**اُردو ممبر سازی**
بھوپال۔ ریاستی ترقی اُردو مدھیہ پردیش کے جنرل سکریٹری جناب ایم عرفان نے سٹی کمیٹی کی ممبر سازی کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ سرکاری اعلان کے مطابق بھوپال کی اُردو بولنے والی پچھتر فی صدی آبادی کے لیے سرکاری طور پر نہ تو اُردو اسکول قائم کیے اور نہ ہی سرکاری اعلانات وقوانین وغیرہ کی اردو میں اشاعت کی جاتی ہے اور نہ ہی آل انڈیا ریڈیو وغیرہ میں اردو شعبے قائم کیے گئے ہیں۔

اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے آنے والے چھ ماہ کے اندر پینتیس (۳۵) ہزار اُردو دوستوں کو ممبر بنایا جائے گا۔ ممبر سازی کے بعد حلقہ وار تنظیم قائم کرکے شعبۂ مدارس، لائبریری اور ادبی حلقوں کا قیام عمل میں لایا جائے گا ساتھ ہی حکومت کو مطلع کیا جائے گا کہ بھوپال میں اردو کو جو لسانی اکثریت حاصل ہے اس کو ملحوظ رکھا جائے۔ (رابطہ پبلسٹی سروس، بھوپال)

**مرزا غالبؔ کا یوم پیدایش**
مرزا غالبؔ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ کو آگرہ میں پیدا ہوئے تھے غالبؔ اکاڈمی، بنارس نے درخواست کی ہے کہ وہ ۲۷ دسمبر ۶۴ء کو ملک گیر طور پر ان کا یوم پیدایش منانے کا اہتمام کریں اور مقامی حالات کے اعتبار سے جو پروگرام بنائیں اس سے اکاڈمی کو بھی مطلع فرمادیں تاکہ اکاڈمی سے شائع ہونے والے کتابچہ میں اسے بھی شامل کرلیا جائے۔

**غیر متعارف شعراء**
قیس رامپوری صاحب ایک ایسا مجموعہ شائع کررہے ہیں جس میں ہندوستان کے ان شعراء کا کلام ہوگا جو اچھی صلاحیتوں کے باوجود گمنام ہیں۔ یہ مجموعہ دسمبر کے آخر میں شائع ہوگا۔ خواہشمند شعرا اپنی دو غزلیں، مختصر حالات زندگی اور ایک پاسپورٹ سائز تصویر مندرجہ ذیل پتے پر بھیج سکتے ہیں

پتہ:۔ قیس رامپوری۔ دو محلہ روڈ۔ رامپور (یوپی)

**نوحؔ اکیڈمی کا مشاعرہ**
نوحؔ اکیڈمی، دہلی کی طرف سے سالانہ غیر طرحی مشاعرہ اس سال ۷ دسمبر ۶۴ء بروز سنیچر ڈاکٹر مرزا احمد علی صاحب کے مکان 'کاشانۂ حیات' (کوچہ پنڈت دہلی) پر منعقد ہو رہا ہے۔

## آوازوں کا عجائب گھر

برلن۔ مغربی حصّے کی سرکاری لائبریری میں ایک "آوازوں کا عجائب گھر" قائم کیا گیا ہے جس میں دنیا کی کئی مشہور شخصیتوں مثلاً البرٹ آئن اسٹائن، شہنشاہ ولیم، ہنڈن برگ اور رابندر ناتھ ٹیگور وغیرہ کی آوازوں کے ریکارڈ محفوظ ہیں۔ اس ادارے کے سربراہ پروفیسر ولیم ڈوگن جرمنی کے پہلے شخص ہیں، جنھوں نے بڑے لوگوں کی آوازیں ریکارڈ کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔

## برطانیہ میں اُردو

برطانیہ کی حکومت اور مخالف سیاسی جماعتیں اس وقت انگلستان میں اُردو کو بہت اہمیت دے رہی ہیں۔ پچھلے دنوں انتخابات جیتنے کے سلسلے میں پوسٹر اردو زبان میں بھی چھپوائے گئے تھے۔ انگلستان کے بڑے شہروں سے شائع ہونے والے اخباروں میں اُردو میں اشتہار شائع ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ لندن کے دفتر روزگار میں ایک اُردو داں نگراں کا تقرر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔

## روس میں اُردو

سوویت یونین میں بھی ہندوستانی ادب اور شاعری سے بہت دلچسپی لی جا رہی ہے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے روس میں تراجم شائع ہو چکے ہیں، جن میں ٹیگور، غالب، پریم چند، اقبال، کرشن چندر اور فیض احمد فیض کی تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

---



پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

# غزل سرا (اُردو)

اُردو غزل گو شعراء میں سے ۱۲ مشہور شعراء کی غزلوں پر مجنوں صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مقالوں کا مجموعہ۔ یہ مقالے جو تنقید نگاری کے اصول اور معیار پر پورے اُترتے ہیں، نہایت دیانت داری۔ اور ذمّے داری کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ مجنوں صاحب کے ہاں تنقید کا پہلو زیادہ جان دار، زیادہ نمایاں اور زیادہ صحیح ہے اس لیے نئے تنقید نگاروں کو جن کے لیے یہ کتاب شمعِ ہدایت کا کام دے گی، اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات — ۳۰۲

مجلّد قیمت: —— ۶/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

Regd No. D 58 December 1964

**Kitab Numa**

JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25.

# کچھ اچھی کتابیں



## ناول

| | | |
|---|---|---|
| ایک چادر میلی سی | راجندر سنگھ بیدی | ۲/۲۵ |
| باپ بیٹے | ترگنیف | ۵/ |
| تلخیاں | رشید اختر ندوی | ۳/۵۰ |
| زلزل | ڈاکٹر بھوانی بھٹاچاریہ | ۴/۵۰ |
| راہِ عمل | صالحہ عابد حسین | ۴/۵۰ |
| رنگ محل | حمیدہ سلطان | ۶/- |
| سات سال | [illegible]راج آنند | ۵/۲۵ |
| شکستِ ناتمام | [illegible]سٹن بک | ۲/- |
| شہناز | [illegible]ب اشرف | ۳/۵۰ |
| صفیہ | سلمیٰ محبوب | ۴/- |
| معصومہ | عصمت چغتائی | ۳/۷۵ |
| ماں | گورکی | ۲/۵۶ |

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵